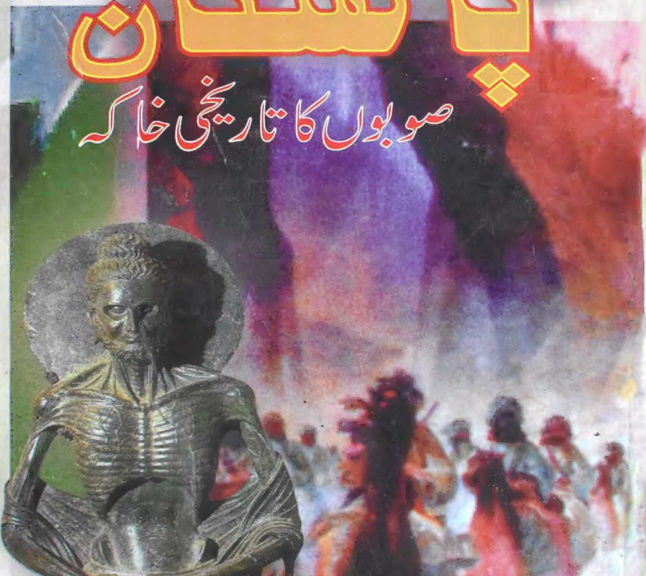
پاکستان

صوبوں کا تاریخی خاکہ



ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان

پاکستان

صوبوں کا تاریخی خاکہ

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان

حسیب میموریل ٹرسٹ بلڈنگ، ناصر آباد، 2 کلومیٹر رائیونڈ روڈ، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور

فون نمبر: 6-042-35311701-3,5 فیکس: 042-35311710 ای میل: info@sappk.org

نام کتاب: پاکستان صوبوں کا تاریخی خاکہ

تحریر: انور چودھری

ٹائیٹل: محبوب علی

کمپوزنگ: انجم شہزاد خان

اشاعت دوئم: جنوری 2014ء

تعداد 500

پرنٹر: جمال پرنٹرز، لاہور۔

ناشر: ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان

VOICE & ACCOUNTABILITY PROGRAMME

آواز اور جوابدہی پروگرام

یہ دستاویز ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان نے انسانی بھلائی کے لیے ترتیب دی ہے۔

مندرجات

پیش لفظ

جب ہم نے ساؤتھ ایشیاء پارٹنرشپ، پاکستان (ایس اے پی، پاکستان) میں صوبائی کتابچے تیار اور شائع کرنے کے کام کا آغاز کیا تو اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترقیاتی کارکنوں کو پاکستان کے چاروں صوبوں کے تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی عوامل سے آگاہ کیا جاسکے۔ ہمیں امید تھی کہ ان صوبائی کتابچوں کے ذریعے نہ صرف ترقیاتی کارکنوں کو اپنے کام میں خاطر خواہ مدد ملے گی بلکہ موجودہ صوبائی تعصّبات بھی بہت حد تک دور ہوں گے۔ صوبائی کتابچوں کی اشاعت کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کیا ہے۔

ان کتابچوں میں صوبائی تاریخ کو منفرد طور پر پیش کرنے کا انداز اپنایا گیا۔ غالباً پہلی مرتبہ پاکستان کے صوبوں کی تاریخ معروضی انداز میں تحریر کی گئی اور 'لوگوں کی تاریخ' لکھنے کی ایک نئی ریت ڈالی گئی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک بہت بڑی کمی دور کر دی گئی کیونکہ اس سے پہلے لکھی گئی تاریخ عموماً معروضیت سے عاری اور کسی خاص فرد یا گروہ کی بے جا تعریف یا تنقید پر مبنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی تاریخ منظرِ عام پر لائی گئی جس کی تصدیق غیر متنازع ذرائع سے ہوتی ہے اور جس کی عکاسی اب تک متعلقہ صوبے کے رسم و رواج میں نظر آتی ہے۔ بہر حال اس پر ابھی مزید کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

صوبائی کتابچوں کے سلسلے کے تحت سب سے پہلے "پنجاب تاریخی خاکہ" شائع کی گئی جو محترم انور چودھری نے تحریر کی۔ اس سلسلے کی اگلی کڑی "بلوچستان تاریخی خاکہ" تھی۔ اسے بھی محترم انور چودھری نے ہمارے چند بلوچ دوستوں اور دانشوروں کے ساتھ مل کر تحریر کیا۔ ان میں بہادر خان رودانی، سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ اور اسد رحمٰن نمایاں تھے۔ یہ دونوں کتابچے بے حد کامیاب ثابت ہوئے اور ہر سطح پر

سراہے گئے لیکن چونکہ یہ محدود تعداد میں شائع کیے گئے تھے یہ تمام دلچسپی رکھنے والے قارئین تک نہ پہنچ سکے۔

اسی کمی کو دور کرنے کے لیے "سندھ تاریخی خاکہ" زیادہ تعداد میں شائع کی گئی۔ اس کتابچے کا ابتدائی مسودہ سندھی دانشور جناب ابراہیم جویو نے فراہم کیا اور اسے تحریر کرنے کی ذمے داری جناب انور چودھری نے نبھائی۔ صوبائی کتابچوں کے سلسلے کی آخری کڑی "سرحد تاریخی خاکہ" کو جناب افراسیاب خٹک نے تحریر کیا۔ ان دونوں کتابچوں کو جو پذیرائی ملی وہ نہ صرف توقعات سے بڑھ کر تھی بلکہ ایس اے پی، پاکستان کے لیے بحیثیتِ تنظیم بہت خوش آئند بات بھی تھی۔

صوبائی کتابچوں کے اس سلسلے کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت مقامی سطح پر کام کرنے والے ترقیاتی کارکنوں کی دلچسپی، شوق اور مزید جاننے کی لگن کو دیکھتے ہوئے محسوس کی گئی۔ ہمیں امید ہے کہ اس طرح ان کارکنوں کو جامع تحقیق کرنے اور گفتگو کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔ علاوہ ازیں، ایک جلد میں ہونے کی وجہ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین پاکستان کے چاروں صوبوں کی تاریخ کا تقابلی جائزہ لے سکیں گے۔ انہی وجوہات کی بنیاد پر ان صوبائی کتابچوں کی انگریزی میں اشاعت بھی زیرِ غور ہے۔

یہاں پر میں ان تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جو کسی نہ کسی حیثیت میں ان صوبائی کتابچوں کے ساتھ منسلک رہے اور اسے کامیاب بنانے میں مددگار ثابت ہوئے، خاص طور پر محترم انور چودھری جو اس سلسلے کے مدیر تھے، محبوب علی جنہوں نے چاروں کتابچوں کے سرورق تیار کیے اور مصطفیٰ نذیر احمد جنہوں نے سندھ اور سرحد کے کتابچوں کی زبان کی درستگی کے فرائض انجام دیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ کاوش آپ کے معیار پر پورا اترے گی۔

محمد تحسین

ایگزیکٹیو ڈائریکٹر

ایس اے پی، پاکستان

پنجاب

ایک تاریخی خاکہ



شائع کردہ: ساؤتھ ایشیاء پارٹنرشپ پاکستان

پنجاب

معیشت، سیاست اور ثقافت

(ایک تاریخی خاکہ)

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان

حسیب میموریل ٹرسٹ بلڈنگ، ناصر آباد، 2 کلومیٹر رائیونڈ روڈ، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور

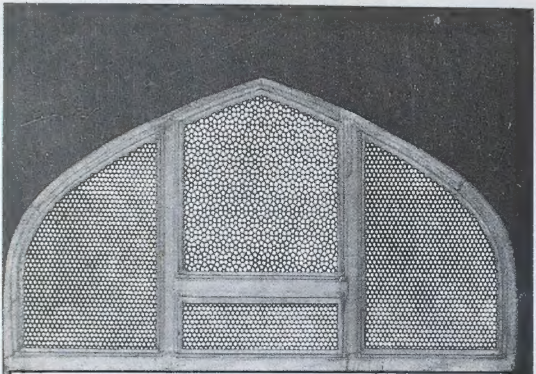
فون نمبر: 042-35311701-3,5-6 فیکس: 042-35311710 ای میل: info@sappk.org

اشاعت اول جولائی 1997ء
تعداد 1000

اشاعت دوئم جنوری 2014ء
تعداد 500

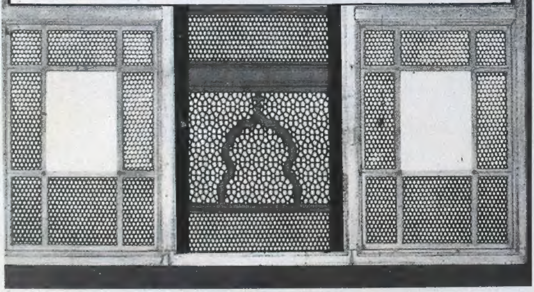
آواز
VOICE & ACCOUNTABILITY PROGRAMME
آواز اور جوابدہی پروگرام

یہ دستاویز ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ ، پاکستان نے انسانی بھلائی کے لیے ترتیب دی ہے۔



ویکھ فریدا جو تھیا۔ شکر ہوئی وِس
باہجھ سائیں دے اپنے ویدن کہیئے کِس

(بابا فرید)

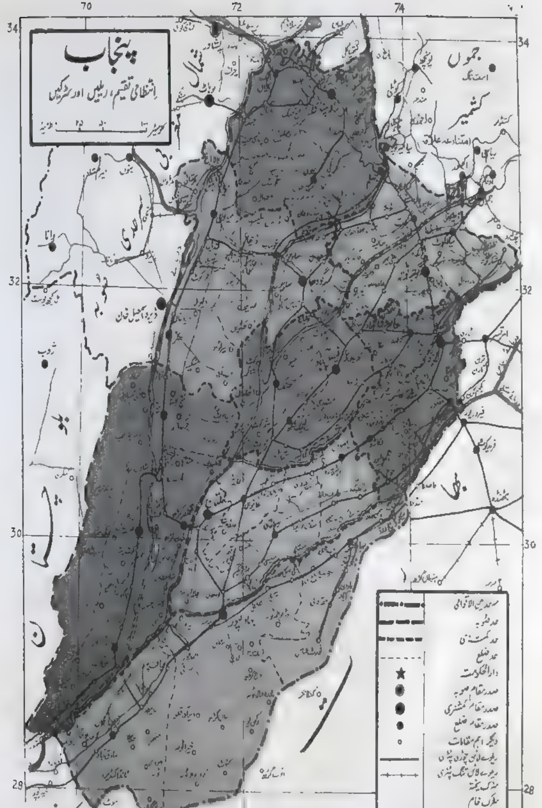


پہلے ایک بات

آج کے پنجاب کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کی تاریخ کو جاننا ضروری ہے۔ تاریخ معیشت، سیاست اور ثقافت کے تال میل سے بنتی ہے۔ پیداوار کے عمل میں شریک عوام حکمران طبقے کا سیاسی نظام اور پورے سماج میں جاری ثقافتی قدروں کا بہاؤ تاریخ کے بنیادی محرکات ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں تاریخ حکمرانوں کے چونچلوں اور چالبازیوں کا نام بن کر رہ گئی ہے۔ ایسی تاریخ عوام کو پسماندہ، جاہل اور غلام بنائے رکھنے کی شعوری کوشش ہے۔ جبکہ حکمرانوں اور عوام کے تضادات اور اتفاقات کے تسلسل کو جاننا ایک ایسا تاریخی علم ہے جو عوام میں ایک مثبت تبدیلی کی بنیاد بن سکتا ہے۔ عوام کی ترقی کے لئے کام کرنے والے کارکن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حکمرانوں کی سیاست کے ساتھ ساتھ اپنے عوام کے معاشی حالات اور ان کی ثقافتی قدروں کے ماضی سے بہہ کر حال تک آنے والے دھارے کو جانے۔ تاکہ وہ مستقبل کے لئے مناسب پیش بندی کر سکے۔ زیر نظر کتاب اسی سوچ کی پیداوار ہے۔ یہ کتاب جہاں آپ کے بہت سے سوالوں کا جواب ہو سکتی ہے وہاں یہ بہت سے نئے سوال بھی جنم دے سکتی ہے یہ علم کی مسلسل آگے بڑھتی ہوئی زندہ حالت کا نام ہے۔ ہم آپ کے ذہن میں پیدا ہونے والے نئے سوالات کی قدر کرتے ہیں آپ بھی ان کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

شعبہ برائے ترقیاتی معلومات

ساؤتھ ایشیا۔ پارٹنرشپ پاکستان


پنجاب
انتظامی تقسیم، ریلیں اور سڑکیں
جموں
کشمیر
ڈیرہ اسمٰعیل خان
سندھ
سرحد بین الاقوامی
حد صوبہ
حد کمشنری
حد ضلع
دارالحکومت
صدر مقام صوبہ
صدر مقام کمشنری
صدر مقام ضلع
دیگر اہم مقامات
ریلوے لائن چوڑی پٹڑی
ریلوے لائن تنگ پٹڑی
سڑک پختہ
سڑک خام

پنجاب ایک فارسی نام ہے۔ قدیم زمانے میں اس خطے کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ دنیا کی قدیم ترین کتاب رگ وید جو کہ اسی خطہ میں لکھی گئی میں اسے "سپت سندھو" یعنی سات دریاؤں کی سرزمین کہا گیا ہے اور ساتوں دریاؤں کے نام بھی گنوائے گئے ہیں۔

مہابھارت اور رامائن میں اس دھرتی کو پنج ندیا پانچ ندیوں کی زمین کا نام دیا گیا ہے۔ اور اس کے دریاؤں کے نام ہیں۔ ستلج Satadru ، بیاس Vipasa ، راوی Airavati ، چناب Chandrabhaga اور جہلم Vitasta ۔

اس علاقے کا ایک قدیم نام واہیک بھی ہے۔ مہا بھارت کے پنجند کا فارسی ترجمہ ہی پنجاب ہے اور یہ نام بذات خود اس خطے میں فارسی زبان کے اثر و رسوخ کی تاریخ بتاتا ہے۔

پنجاب کی حدود میں مختلف ادوار میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ مجموعی طور پر جس علاقے کو پنجاب کہا گیا وہ سندھ کے کنارے سے لے کر ستلج تک پھیلا ہوا تھا کبھی اس کی سرحدیں پھیل کر پشاور سے دہلی بھی پہنچ جاتی تھیں۔

سکندر اعظم کے ساتھ آنے والے مورخین نے پنجاب کو Pantapotamia یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین لکھا ہے اور اس میں کئی خود مختار ریاستوں کی بھی اطلاع دی ہے جیسے دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان ریاست ٹیکسلا، جہلم اور چناب کے درمیان پورس کی ریاست چناب اور راوی کے درمیان گندھارا اور راوی کے مشرقی حصہ میں کاٹھیوں اور ادراستائی ریاست وغیرہ

سلاطین دہلی اور مغلوں کے دور میں پنجاب ان کی حکومت کا حصہ رہا اور اس میں کئی صوبوں کے نام آتے ہیں جیسے لاہور اور ملتان کے صوبے مستقل رہے مگر دیپال پور اور کشمیر بھی پنجاب کے علاقوں پر مشتمل صوبے رہے۔ جب انگریز یہاں آئے تو صوبہ سرحد بھی پنجاب کا حصہ تھا جسے بعدازاں علیحدہ صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ 1947ء میں مشرقی پنجاب ہندوستان کا حصہ بنا اور وسطی و مغربی پنجاب نو آزاد ملک پاکستان کا حصہ بنا۔ بعدازاں ستلج پار کی ریاست بہاولپور بھی پنجاب کا حصہ بن گئی۔



3





جدید تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ دنیا کے قدیم ترین انسان کی باقیات اور اثرات پنجاب ہی سے دریافت ہوئی ہیں۔ پنجاب سے پرانے بندر نما انسان کے جو اثرات ملے ہیں ان کو نسلیات کے ماہرین نے Punjab Drypithicus کا نام دیا ہے اور اس کی عمر ایک کروڑ 40 لاکھ سال ہے۔

وادی سون سے انسان کے قدیم ترین ڈھانچے ملے ہیں۔ سرائے کھولا اور ہڑپہ سے ملنے والے انسانی ڈھانچوں سے بھی کم از کم چار پانچ نسلیاتی گروہوں کا پتہ چلتا ہے۔ نسلیات کے ماہرین نے بتایا ہے کہ پنجاب میں سب سے پہلے نیگریٹو پھر آسٹرک اس کے بعد دراوڑ اور سب سے آخر میں آریہ لوگ بستے رہے ہیں۔ موجودہ پنجاب کی نسلیاتی ساخت کو سمجھنے کے لئے ہمیں قدیم نسلوں کے ساتھ آریاؤں کی آمیزش اور پھر اس میں یونانی ہن، ایرانی ترکی اور وسطی ایشیا وغیرہ کے لوگوں کی آمیزش کو بھی دیکھنا ہو گا۔

قدیم سپت سندھو اور موجودہ پنجاب، وادی سندھ کی عظیم ترین تہذیب کا حصہ بلکہ جنم بھومی ہے۔ کہاجاتا ہے کہ انگریز نے ہندوستانیوں کے لئے ہندوستان کو دریافت کیا۔ ایک طرح سے یہ بات سچ بھی ہے کہ انہوں نے ہی وادی سندھ اور گنگا و جمنا کی عظیم تہذیبوں کو دریافت کیا مگر انہوں نے جو تشریح کی اور نتائج نکالے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وادی سندھ کی ہڑپہ اور موہنجوداڑو تہذیب کے بارے میں وہ شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتنی بڑی تہذیب یہاں پروان چڑھ سکتی ہے سو انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ تہذیب باہر سے یہاں لائی گئی ہوگی مگر بعد کے انکشافات نے سب کر حیرت زدہ کر دیا۔ اس وقت تک ہڑپہ سے زیادہ قدیم تہذیبی اثرات دریافت نہیں ہوئے تھے لہذا یوں لگتا تھا کہ بنی بنائی عظیم تہذیب یہاں کسی نے نافذ کر دی ہوگی مگر بعد ازاں بہت سی دریافتوں نے ہڑپہ کو اس دھرتی کی قدیم تاریخ اور تہذیب کے ساتھ جوڑ دیا۔

ہاکڑہ تہذیب جو ہڑپہ تہذیب کی ماں سمجھی جانے لگی ہے پنجاب کے جنوب میں چولستان سے دریافت ہوئی ہے۔ یہاں سے دو سو سے زیادہ آبادیوں کے نشانات ملے ہیں اور یہاں سے جو پکی مٹی کے برتن اور دوسری اشیا ملی ہیں ان کی عمر دس ہزار سال ق م سے لے کر 1000 سال ق م تک ہے۔ یہاں دریائے ہاکڑہ (بعد ازاں انگریزوں نے ایک بڑی نہر کا نام ہاکڑہ رکھا جو کہ اسی دریا کی ایک گزر گاہ میں بنائی گئی ہے) یا گھاگھرہ کی اٹھارہ 18 گزر گاہیں ملی ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ وہی دریا ہے جس کو ویدوں میں سرسوتی کہا گیا ہے۔

ہڑپہ تہذیب کے نشانات پوری وادی سندھ میں پھیلے ہوتے ہیں بلکہ یہ وادی سندھ کی عظیم تہذیب ہے ہڑپہ جس کا ایک نام ہے۔ یہ تہذیب پورے پنجاب سندھ اور بلوچستان پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے اثرات اس سے بھی بہت دور تک پھیلے ہوتے تھے۔ یہ تہذیب ہزاروں سالوں میں پروان چڑھی تھی، موہنجوداڑو اور ہڑپہ اسی کے ترقی یافتہ نشانات ہیں۔ ان جگھوں سے ملنے والے غلے کے گودام اور مختلف اجناس کے اثرات اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ بہت وسیع علاقے میں پھیلا ہوا زرعی پیداوار کا نظام تھا جو نہ صرف ان گوداموں کو بھرتا تھا بلکہ ان ہی کی فالتو پیداوار ان شہروں کی تعمیر پر خرچ ہوتی تھی اور یہ شہر تجارت اور حکومت کے مرکز تھے یعنی یہ سماج اس قدر ترقی یافتہ ہو چکا تھا کہ طبقے وجود میں آچکے تھے بلکہ ترقی کر کے حکومت بھی وجود رکھتی تھی اور پیداواری عمل اس قدر ترقی کر چکا تھا کہ تجارت ہونے لگی تھی اور منڈیاں بن گئی تھیں۔

ہڑپہ پکی اینٹ کی دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے اور اپنے وقت کی ترقی یافتہ ترین بھی۔ یہاں نکاسی کا بہترین نظام موجود تھا اور پانی کی نالیاں اوپر سے ڈھکی ہوتی تھیں۔ نہانے دھونے کے لئے غسل خانے استعمال ہوتے تھے۔ زیورات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ مٹی اور مختلف دھاتوں کے زیورات حتیٰ کہ سونے کے زیورات بھی ملے ہیں جو مختلف طبقاتی حیثیتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پنجابیوں کا یہ قدیم شہر 6000 ق م سے 2500 ق م کے درمیان آباد تھا پھر یہ برباد ہو گیا شاید باہر سے آنے والے حملہ آور قبائل اس کی بربادی کی وجہ بنے

ہوں 2500 ق م سے 1500 ق م (تقریباً) تک کے ڈیڑھ ہزار سال تک یہاں باہر سے قبائل آتے رہے جن کو مورخین نے آرین کہا ہے اور یہ لوگ وادی سندھ میں آکر آباد ہوتے اور مقامی آبادی پر آہستہ آہستہ حاوی آتے گئے۔ انہوں نے دراوڑوں کو پنجاب سے دھکیل کر نکال دیا اور باقی ماندہ کو ماتحت بنا لیا یوں پنجاب میں آریہ سماج کی بنیاد پڑی۔ آریہ سماج رنگ و نسل کی بنیاد پر کی گئی درجہ بندی کا نام تھا جس میں گورے رنگ کے حملہ آور سب سے اونچے درجے پر تھے اور مقامی کالے سب سے نچلے درجے میں یا پھر درجہ بندی سے بھی باہر تھے یوں یہ سماج برہمن اور کھشتری کی بالادستی پر مبنی تھا۔ آرین شروع میں مقامی لوگوں سے پسماندہ تھے مگر طاقت سے بالادستی حاصل کرنے کے بعد ایک لمبے عرصے میں مقامی علم و دانش کو اپنے اندر سمو کر انہوں نے ایک نظام فکر تیار کر لیا تھا۔ رگ وید جسے آریوں کی قدیم ترین کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہے اسی علاقے میں لکھی گئی جبکہ باقی تین ویدیں گنگا کی وادی میں لکھی گئیں یعنی بعد ازاں آرین مذہبی مرکز پنجاب سے گنگا کی طرف منتقل ہو گیا۔ رگ وید میں قدیم پنجاب کے باسیوں کو انتہائی حقارت سے کالے، بدشکل، جاہل اجڈ، مذہب کو نہ ماننے والے آزاد خیال شراب پینے والے اور ناچنے والے کہا گیا ہے۔

پنجاب کی سرزمین پر ٹیکسلا دوسرا شہر ہے جو ریاست بھی کہلایا اور ایک تہذیب بھی۔ مورخین کے مطابق ٹیکسلا قریباً 5000 سال پرانا ہے مگر 500 ق م سے 500 عیسوی تک کے ہزار سال میں یہ اپنے تہذیبی عروج پر تھا بعد ازاں غیر اہم ہو کر معدوم ہو گیا۔

ٹیکسلا ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا اور پورے ہندوستان سے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے پہلے یہ ہندومت کا مرکز تھا مہاتما بدھ کے بعد یہ آہستہ آہستہ بدھ مت کا مرکز بنتا چلا گیا اور یہیں سے بدھ بھکشو پرچارک بن کر نکلے اور بدھ مت کو چین اور جاپان تک پھیلا دیا۔ پانِنی نے اسی خطے میں قریباً 600 ق م میں دنیا کی پہلی گرائمر کی کتاب اشٹادھیائی لکھی پھر پتنجلی نے ملتان میں لسانیات کی کتاب مہابھاشیہ لکھی وہ 174 ق م میں زندہ تھا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم دنیا کو فتح کرتا ہوا ایران سے پنجاب میں داخل ہوا اور ٹیکسلا اور کچھ علاقوں کو اپنا مطیع بنا لیا مگر کچھ ہی عرصے میں وہ پنجاب کے مقامی حکمرانوں سے لڑتا ہوا زخمی ہو کر واپس جاتے ہوتے مر گیا لیکن اس خطے میں یونانیوں کا اثر ورسوخ قریباً دو صدیوں تک جاری رہا۔ پاٹلی پتر کے حکمران خاندان موریہ نے ٹیکسلا پر ایک صدی حکومت کی اشوک اعظم جو بعدازاں بدھ ہو گیا۔ یہیں کا حکمران تھا۔

قریباً 500 ق م سے 300 ق م تک کی دو صدیوں میں ایرانیوں نے پنجاب پر کئی حملے کئے پنجاب ایرانی سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا گیا مگر ایران کی اندرونی تبدیلیوں کے نتیجے میں ایرانیوں کی یلغاریں اور لوٹ مار جاری رہی۔

200 ق م میں باختری یونانیوں نے پنجاب پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا ٹیکسلا ان کی راجدھانی تھا۔ عیسوی سن کی پہلی صدی تک ان کی حکومت جاری رہی۔ دوسری اور تیسری صدی میں کشان حکمرانوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور حکومت قائم کی پشاور ان کی راجدھانی بنا۔ 395 ۔میں چندر گپت دوم نے حملہ کر کے پنجاب

کشانوں سے چھین لیا۔ آنے والی آدھی صدی پاٹلی پتر کا یہ گپتا خاندان پنجاب پر حکمران رہا۔ 455 ۔میں "ہن" قبائل نے پنجاب پر حملہ کیا اور بہت بڑی تعداد میں یہ لوگ پنجاب میں آ کر بسے۔ ان کا ایک بادشاہ مہر گل تھا جس کا دارالخلافہ سیالکوٹ تھا۔ ہن نسلی طور پر یہاں جذب ہو گئے کہا جاتا ہے کہ جٹ اور راجپوت ہن اور مقامی لوگوں کے ملاپ کی اولاد ہیں۔

712 ۔میں عرب مسلمان محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سمندر کے راستے سے حملہ آور ہوتے اور سندھ سے ہوتے ہوئے ملتان تک پہنچے۔ عرب میں اندرونی تبدیلی کی وجہ سے محمد بن قاسم کی فوج واپس لوٹ گئی مگر اب ملتان ایک مسلمان ریاست کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ ایک خود مختار ریاست تھی سو مرکزی خلافت نے انہیں خارجی یا قرامطی قرار دے دیا۔ جب 1000 ۔میں ترک محمود غزنوی نے ہندوستان کا رخ کیا تو حملے کا جواز پیدا کرنے کے لئے خلافت سے انہیں قرامطیوں کو نیست و نابود کرنے کا پروانہ حاصل کیا۔ محمود غزنوی نے سترہ حملوں میں سے پندرہ حملے پنجاب یا لاہور پر کیئے اور یہاں کی تمام دولت، اجناس یہاں تک کہ جانور بھی لوٹ کر لے گیا۔ پنجاب میں کچھ عرصہ غزنوی کے صوبیدار حکومت کرتے رہے پھر افغانوں نے ہندوستان پر حملے کیئے اور دہلی کی مرکزی حکومت کی بنیاد رکھی۔ 1186 ۔میں محمد غوری نے لاہور غزنویوں سے چھین کر اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ سلاطین دہلی کی حکومت 1526 ۔تک جاری رہی۔ غوری، تغلق بلبن، غلام اور لودھی بادشاہ رہے۔ اس دوران بھی پنجاب پر منگول مسلسل حملے کرتے رہے اور اسے لوٹتے رہے تیرھویں

صدی میں پنجاب میں منگولوں کے حملوں نے تباہی پھیلائے رکھی۔ پھر 1398 ء میں تیمور لنگ نے پنجاب کو برباد کیا۔ 1526 ء میں بابر نے اٹک پار کر کے حملہ کیا وہ پنجاب کو روندتا ہوا دہلی جا پہنچا اور مغل خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ مغل حکومت پنجاب میں اٹھارویں صدی تک جاری رہی۔ اس دوران بھی ایران کے نادر شاہ اور افغان احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر کئی حملے کئے اور یہاں بے تحاشہ قتل و غارت گری کی اور لوٹ مار کی داستانیں چھوڑ گئے۔

اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں سکھ سرداروں نے پنجاب کو کئی حصوں میں بانٹ لیا مگر رنجیت سنگھ نے سب کو فتح کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ یہ پنجابی حکومت اگلے پچاس سال میں ہی بکھر گئی یوں 1847 ء میں انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا جو پاکستان بننے تک جاری رہا۔







پنجاب میں حکومت اور سیاست کی تاریخ دراصل حملہ آوروں اور لوٹ مار کی تاریخ ہے۔ یہاں ہمیشہ ہی جنگ باز اپنی فوجوں کو لے کر چڑھ دوڑتے تھے اس کی ایک وجہ تو اس کا جغرافیہ تھا۔ پانچ دریاؤں کا یہ قدیمی زرخیز ترین زرعی میدان جس کو ہم پنجاب کہتے ہیں چاروں اطراف سے ننگا تھا اس کو پہاڑوں کی دیواریں میسر نہ تھیں۔ یہاں ہواؤں کو نئے خیالات کو اور حملہ آوروں کو نہیں روکا جا سکتا تھا۔ دوسری وجہ اس زرعی میدان کی زرخیزی تھی وافر زرعی پیداوار اور کاریگروں کی بنائی ہوتی ڈھیر ساری مصنوعات سے یہ علاقہ مالا مال تھا۔ بستیاں اور شہر بنا کر بسنے والے یہ لوگ ہمیشہ امن چاہتے تھے کیونکہ ان کا کام جنگ بازی نہیں بلکہ زراعت کاری اور کاریگری تھا۔

پنجاب میں دو طرح کے حملہ آور آتے ایک وہ جنھوں نے قتل و غارت گری پھیلائی اور جو کچھ بھی ملا لوٹ لیا۔ امیروں سے ان کی دولت اور عام لوگوں سے زرعی اجناس، مویشی حتیٰ کہ وہ عورتیں بھی چھین کر لے جاتے تھے۔ ایرانیوں اور منگولوں نے صدیوں یہ وطیرہ رکھا پھر محمود غزنوی نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی وغیرہ ایسے لٹیرے تھے جو جنگ کر کے پوری قوم کو لوٹ لیتے تھے ان حملہ آوروں کی لوٹ کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہے جس سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ کس قدر مال و دولت اس علاقے میں موجود تھی اور مسلسل پیدا ہو رہی تھی۔

دوسرے حملہ آور وہ تھے جو باہر سے آئے، جنگ کے ذریعے اس علاقے کو فتح کیا اور یہاں حکومت بنائی اور یہیں بس گئے جیسے سلاطین دہلی اور مغل۔ اس قسم

کے حملہ آور بھی یہاں بہت آتے اور بستے رہے۔ حملہ آور فاتح صرف اپنی فوج لے کر ہی یہاں نہیں آتے تھے بلکہ اپنی فاتح ثقافت لے کر بھی آتے تھے۔ ان کی زبان یہاں کے عوام سے علیحدہ ہوتی تھی اور وہ اسی زبان کو سرکاری درجہ دیتے تھے۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں ہی فارسی سرکاری زبان بن گئی، بابر جیسا ننگے پیروں والا خانہ بدوش بھی اپنے علاقے اور ثقافت کے احساس برتری میں مبتلا نظر آتا ہے کیونکہ وہ فاتح ہے۔ ہر فاتح اپنی فوج کے افسروں اور اپنے لوگوں کو جاگیریں دیتا تھا۔ بیرونی حکمران ہونے کی وجہ سے باہر سے لوگ روزگار کی تلاش میں مسلسل یہاں آتے رہتے تھے مثلاً مسلمان بادشاہوں کے دور میں عرب افغانستان، ایران، ترکی اور وسطی ایشیا سے لوگ مسلسل یہاں آتے رہے کیونکہ انہیں پتہ ہوتا تھا کہ یہاں پہنچتے ہی انہیں کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔ یوں حملہ آور حکمرانوں نے یہاں اشرافیہ کا ایک ایسا طبقہ بنایا جو اپنی زبان ثقافت اور رسم و رواج میں یہاں کے عوام سے بالکل مختلف تھا وہ انسان، ذات، خیالات اور طور طریقے جن کا تعلق باہر سے تھا برتر قرار پاتے۔ یہ لوگ اپنے برتر ہونے کے زعم میں مبتلا تھے اور ان کو جو مقامی تھے گھٹیا سمجھتے تھے۔



دوہڑے بابا فرید

فریدا خاک نہ نندیئے خاکو جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تلے مویاں اپر ہوئے

میں بھلاوا پگ دامت میلی ہو جائے
گہلا روح نہ جانئ ای سر بھیٔ مٹی کھائے

فریدا جے توں عقل لطیف، کالے لکھ نہ لیکھ
آپنے گریوان میں سرنیواں کر ویکھ

فریدا چنت کھٹولا، وان دکھ، برہا وچھاون لیف
ایہہ ہمارا جیونا، توں صاحب سچے ویکھ

پنجاب کے عوام کی تاریخ کتابوں میں درج نہیں ہے یہ ایک دریافت کا عمل ہے جو ڈھونڈنے والے کو آسانی سے مل سکتی ہے۔ اگر ہم یہاں کے زرعی معاشی نظام کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو نہ صرف عوام کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ ان کے اوپر حکومت کی صف بندی بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔ پنجاب کے پرانے زراعتی نظام کے بارے میں کتابوں سے بارہویں صدی کے بعد کی شہادتیں ملتی ہیں مگر ایک بات صاف نظر آتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے پہلے سے چلے آرہے زرعی نظام کو قبول کر کے اس پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا اور ضرورت کے مطابق اس میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں بھی کرتے رہتے تھے۔ پنجاب کے زرعی معاشی نظام میں بنیادی حیثیت کسان یا کاشتکار کو حاصل تھی اور فیصلہ کن حیثیت بادشاہ کو۔ زرعی معیشت کے دو واضح حصے تھے ایک مویشی پالنا جس میں زمین کی خودرو پیداوار پر انحصار تھا اور دوسری کھیتی باڑی۔ پشوپال جاگیرداروں کو جاگیریں یا چراگاہیں بادشاہ دیتا تھا یا وہ بادشاہ سے اجازت یا حمایت حاصل کرتے تھے اور اس کے عوض انہیں لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ کسی کی بھی حیثیت اس کے ملکیتی مویشیوں کی تعداد سے طے ہوتی تھی۔ پنجاب کی مشہور داستان کی ہیر کا باپ بھی اسی طرح کا جاگیردار تھا۔

کسان یا کاشتکار دو طرح کے تھے ایک تو وہ کسان جن کا زمین پر حق نہیں تھا جن کو رعیتی کسان یا مزارع کہا جا سکتا ہے دوسرے وہ جن کا موروثی حق زمین پر تسلیم کیا جاتا تھا جن کو ہم زمیندار کہہ سکتے ہیں۔ ان کسانوں یا زمینداروں کے نیچے پیداواری عمل میں شریک مزدور کمی کاریگروں کی بہت بڑی تعداد تھی جن کو کسان

اپنی فصل میں سے طے شدہ حصہ دیتا تھا۔ کسان کے اوپر زمیندار، جاگیردار، معافی دار، منصب دار، سردار وغیرہ ہوتے تھے جن کو بادشاہ نے مقرر کیا ہوتا تھا۔ یہ لوگ کسانوں سے لگان وصول کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سرکاری عملہ کے افراد ہوتے تھے جو اس عمل کو ممکن بناتے۔ کچھ علاقے براہ راست بادشاہ کے پاس ہوتے جن کو "خالصہ" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ جاگیروں کی یہ تمام حیثیتیں بادشاہ کی مرضی سے تبدیلی ہوتی رہتی تھیں۔ سب سے اوپر بادشاہ ہوتا تھا جس کی حیثیت اس کے خزانے سے طے ہوتی تھی، جتنا بڑا خزانہ اتنا بڑا بادشاہ۔ یہ خزانہ کسانوں سے وصول کئے جانے والے ٹیکسوں سے بھرتا تھا۔ اشرافیہ اور سرکاری اہل کار بھی انہیں محاصل پر پلتے تھے۔ کسان سے محاصل اس سے کہیں زیادہ وصول کئے جاتے تھے جو سرکاری خزانے تک پہنچتے۔ پیداواری عمل میں شریک عوام کی حالت شاعر بلھے شاہ یوں بیان کرتا ہے۔

میں کسنبڑا چن چن ہاری
ایس کسنبے دے کنڈے بھلیرے اڑا اڑ چنری پاڑی
ایس کسنبے دا حاکم کرڑا ظالم ہے پٹواری
ایس کسنبے دے چار مقدم معاملہ منگدے بھاری
چک چک میں ڈھیری کیتا لتھے آن بپاری

کسنبا ایک پرانی معمولی فصل ہے جس کے بیج کھانے یا تیل بنانے کے کام آتے تھے۔ گانے والی ایک کسان عورت ہے جو کہہ رہی ہے کہ میں اس کسنبا چننے کے عمل سے تنگ آ چکی ہوں۔ وہ کیوں تنگ آئی اس بارے میں بلھے شاہ نے بتا

دیا ہے۔ جب یہ شاعر کسنبا چننے والی عورت کا گیت لکھ رہا تھا اس وقت اورنگ زیب پنجاب کے کسانوں پر 60 نئے ٹیکس لگا چکا تھا۔ پیدا ہونے کا پیدائش ٹیکس بیاہ ہونے پر چولہا ٹیکس اور مرنے کا موت ٹیکس اس وقت پنجاب کے کسانوں کو ادا کرنے پڑتے تھے۔ جب محاصل کسان کی بساط سے زیادہ ہو جاتے تو اناج پیدا کرنے والے بھوک کے مرنے کے خوف سے اپنی زمینیں چھوڑ جاتے تھے۔ جنگوں کے نتیجے میں بھی دیہاتوں کے دیہات اجڑ جاتے تھے۔ بادشاہ کی خوشحالی کے لئے ضروری تھا کہ کسان پیداوار کا عمل جاری رکھے سو کبھی کبھار ٹیکس میں چھوٹ اور تقاوی قرضے بھی دیئے جاتے تھے۔

کافی شاہ حسین

اے نی حسینو جولاہا
نہ اس مول نہ لاہا
نہ اوہ منگیا نہ پرنایا
نہ اس گنڈھ نہ ساہا
نہ گھر باری نہ اوہ مسافر
نہ اوہ مومن نہ اوہ کافر
جو آہا سو آہا

سلطان باہو

پنج محل تے پنجے روشن دیوا کت ول دھریئے ہو
پنج مہر تے پنج پٹواری حاصل کت ول بھریئے ہو
پنج امام تے پنجے کعبے سجدہ کت ول کریئے ہو
جے سر منگے مرشد باہو ہرگز ڈھل نہ کریئے ہو

بلھیا دھرم شالہ دھڑواتی رہندے ٹھاکر دوارے ٹھگ
وچ مسیت کوسَتیتے رہندے عاشق رہن الگ

بلھے شاہ اوہ کون ہے اتم تیرا یار
اوسے ہتھ قرآن ہے اوسے گل زنار

بلھیا عاشق ہویوں رب دا ہوئی ملامت لاکھ
تینوں کافر کافر آکھدے توں آہو آہو آکھ

نہ میں مومن وچ مستاں
نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں موسیٰ نہ فرعون
بلھیا کیہ جاناں میں کون

پنجاب میں ثقافتی وجوگ (Cultural alienation) کی داستان بہت لمبی ہے۔ قدیم تاریخ میں باہر سے آنے والے آرین لوگوں نے اپنے مذہب اور حکومت کی زبان سنسکرت رکھی۔ نیچی جاتیوں اور جاتی باہر لوگوں سے اس زبان کو بچا کر رکھا جاتا تھا۔ یوں سنسکرت برہمن اور کھشتری کی زبان تھی یعنی حکمران لوگوں کی زبان جبکہ عوام کی اپنی زبان تھی جو ان کے پیداوار کے عمل اور ان کی زندگیوں سے گہرے طور پر جڑی ہوتی تھی۔ ٹیکسلا کے حکمرانوں کی زبانیں خروشی، ایرانی، یونانی وغیرہ نظر آتی ہیں۔ جب ہندوستان میں دہلی کی حکومت وجود میں آئی تب باقاعدہ طور پر فارسی کو سرکاری زبان کے طور پر برتا جانے لگا کیونکہ فارسی مسلمان حملہ آور حکمرانوں کی زبان تھی۔ پنجاب ان حکمرانوں کے لئے بہت اہم علاقہ تھا ایک تو اس لئے کہ یہ ہندوستان کا دروازہ تھا اور دوسرے کثیر پیداوار دینے والا زرخیز علاقہ۔ لاہور اور ملتان انتہائی اہم صوبے تھے۔ دہلی اور لاہور حکمرانوں کے سب سے بڑے گڑھ تھے۔ حکمران طبقوں کی نہ صرف زبان علیحدہ تھی بلکہ طرز تعمیر، لباس، رسم ورواج غرضیکہ ہر شئے عوام سے علیحدہ تھی اور عوام سے یہ علیحدگی ہی بالادستی کی علامت تھی اور آج تک ہے۔

عوام میں سے بھی کچھ لوگ فارسی تعلیم حاصل کر کے اور حکمران ثقافت کے ڈھنگ سیکھ کر حکمرانوں کے جتھے میں داخل ہوتے رہتے تھے۔ یہ لوگ عوام اور حکومت کے درمیان رابطے کا کام بھی کرتے تھے۔ حکمران طبقوں کی اپنی زبان اور ثقافت تھی جس کا محور بادشاہ تھا۔ اس ثقافت کے علمبردار علماء کے لئے وہ ظل الہٰی تھا

اور شاعروں کے لئے محبوب (کہ وہ خوبصورت بھی ہے اور ظالم بھی وہ جو چاہے کرے، اس کی ہر ادا اچھی ہے)۔ اس ثقافت میں نہ صرف حکمران اعلیٰ ترین تھا بلکہ محکوم ادنی ترین اور گھٹیا بھی تھا۔ "رعایا" عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے مویشیوں کا غلہ جبکہ یہ لوگ اس لفظ کو عوام کے نعم البدل کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں "کمی" کاریگر کو کہتے تھے کمی کا لفظی مطلب ہے کام کرنے والا جبکہ یہ لوگ لفظ کمینہ یعنی کمی جیسا برے اور گھٹیا کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ یوں حکمران طبقوں کی ثقافت نہ صرف عوام کی ثقافت سے علیحدہ تھی بلکہ متصادم بھی تھی اور بالا دست ہونے کے ناطے حکمران ثقافت عوام کی ثقافت اور زبان کو نہ صرف کچلنے کا کام کرتی تھی بلکہ انکی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بھی تھی۔

گو کہ پنجاب میں حکمران ثقافت مسلسل مضبوط ہوتی رہی کیونکہ اس کے پیچھے اختیار اور دولت کی طاقت تھی۔ مگر عوام میں اس کے بالکل الٹ دھرتی کی ثقافت کا دھارا ہمیشہ سے ہی بہتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمران نظریات کے بالکل الٹ نظریات عوام میں مقبول ہوتے تھے۔ آرین کا جاتی ویہار پنجاب کے عوام میں نہیں چل سکا جبکہ اس کے رد عمل میں پیدا ہونے والے بدھ نظریات نے بہت جلد یہاں جڑ پکڑ لی۔ مسلمان حملہ آوروں کے دور میں مسلم مبلغین بھی یہاں آنے شروع ہوتے اور ان کے کئی مکاتب فکر بنے مگر مجموعی طور پر ان میں دو طرح کے نظریات والے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہ جو حکمران ثقافت کے دائرے میں ہی رہے اور اپنی زندگی میں ہی مسلمان اشرافیہ کا حصہ بن گئے۔ یہ مذہبی طور پر راسخ العقیدہ تھے اور

ان کا رویہ غیر لچکدار تھا جیسے داتا گنج بخش اور ملتان کا سہروری مکتب فکر وغیرہ دوسرے وہ جو حکمران ثقافت سے الگ اپنی ایک نظریاتی اساس بنانا چاہتے تھے جیسے چشتیہ اور قادریہ مکاتب فکر کے لوگ جو نسبتاً عوام کے زیادہ قریب تھے۔ کیونکہ یہ روشن خیال لوگ تھے اور ان کا رویہ انتہائی نرم اور لچکدار تھا۔ یہ لوگ دھرتی کی ثقافتی اقدار کو اپنے نظریات میں جگہ دیتے تھے۔ مگر پنجاب کے عوام ان سے بھی ایک قدم نیچے تھے۔

بابا فرید گنج شکر انہی مبلغین دانشوروں میں سے تھے جو حکمران ثقافت کے حصار کو توڑ کر عوام کے پاس آئے بابا فرید چشتیہ مکتب فکر کے بانی خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ بختیار کاکی کے جانشین خود خواجہ کے کہنے سے مقرر ہوتے تھے۔ بختیار کاکی کی گدی حکمرانوں کے گڑھ دہلی میں تھی یہ وہی گدی ہے جس پر نظام الدین اولیا بیٹھے اور بادشاہ ننگے پیر یہاں منت مانگنے آتے رہے۔ بختیار کاکی کی وفات کے بعد بابا فرید اس گدی پر نہیں بیٹھے بلکہ ستلج کے کنارے آن بسیرا کیا۔ یہ شاید وہی علاقہ تھا جہاں وہ پیدا ہوتے تھے، اجاڑ اور غریب ترین لوگوں کا علاقہ۔ اپنی جڑوں کی طرف لوٹنے والا پنجاب کا یہ پہلا فقیر اور شاعر ہے۔ بابا فرید اپنے وقت کے عالم ترین شخص اور فارسی زبان کے ماہر سمجھے جاتے تھے انہوں نے اپنی دانش کو پنجابی شاعری میں ڈھال کر لوگوں میں بانٹنا شروع کیا۔ فارسی سے پنجابی صرف زبان کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ طرز زندگی اور نظریات کی بھی تبدیلی تھی تب بابا فرید نے کہا۔

پاڑ پٹولہ دھج کریں کمبلڑی پہرو
جیڑیں ویسیں شوہ ملے سو ای ویس کرو

یعنی ریشم کو پھاڑ کر دھجیاں کر دو اور کمبلی پہنو۔ جس بھیس میں محبوب ملے وہی بھیس کرو۔ جب بابا فرید اپنے محبوب عوام میں آکر بس گیا اور اس نے حکمرانوں پر نگاہ ڈالی تو انہوں نے کہا۔

ٹوپی لیندے بانورے دیندے کھرے نلج
چوہا کھڈ نہ ماو ای تیکل بجھے چھج

یعنی ٹوپی لینے والے بانورے ہیں اور دینے والے اصل بے شرم، چوہا کھڈ میں نہیں سما پا رہا کیونکہ اس کی کمر میں چھاج بندھے ہوتے ہیں۔ یہ ٹوپی والے ہیں جو چوہے ہیں اور کسانوں کی زرعی پیداوار کو لوٹ کر اپنے آپے سے باہر ہو رہے ہیں (بادشاہ کا تاج ٹوپی کی اعلیٰ شکل ہے اور چھاج زرعی پیداوار کی)۔

بابا فرید قریباً 1240ء میں پیدا ہوتے ان کے دو سو سال بعد بابا نانک پنجاب کا دوسرا فقیر شاعر ہوا۔ وہ ایک ہندو کھتری گھرانے میں پیدا ہوتے۔ فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ لاہور میں دولت خاں لودھی کی ملازمت کرتے رہے پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہ فقیر ساری عمر کسانوں میں گھوم پھر کر حکمران مخالف گیت گاتا رہا۔ انہوں نے ہی بابا فرید سمیت تمام بھگتی شاعروں کا کلام اکٹھا کر کے لکھا اور اپنی کتاب کا حصہ بنایا یوں یہ تمام شاعر ہم تک پہنچے۔ اس دوران پنجاب کے غریب عوام ہندو مذہب چھوڑ کر یا تو مسلمان ہو گئے۔ یا پھر انہوں نے نانک مت

(جو بعدازاں سکھ مذہب کی شکل اختیار کر گیا) کو اپنا لیا۔ حکمران ثقافت میں تمام خیالات خواہ وہ ہندو تھے یا مسلم، حکمرانوں کی برتری کے لئے استعمال ہوتے۔ وہ طبقاتی فرق، ذات پات اور نسل کے فرق کو قائم رکھنے کے کام آتے تھے. جبکہ غریب عوام میں جو خیالات پھیلے وہ طبقات، ذات پات اور نسلی برتری کے سخت مخالف تھے یہاں تک کہ وہ مذاہب سے بالاتر ہو کر انسانی میل جول کے خیالات تھے۔

یہ خیالات پنجاب کے عوام میں. بہت وسیع اور گہری سطح تک پھیلے ہوتے تھے کیونکہ اکثر پنجابی کلاسیکی شاعروں کا کلام کسی کتاب میں درج نہیں تھا یہ سارا کلام سینہ بہ سینہ ہی چلتا رہا حتیٰ کہ بیسوی صدی کے شروع میں چھپ کر کتاب کی شکل میں آنا شروع ہوا۔

پنجاب کے دانشور فقیر شاعروں کے خیالات حکمران کلچر کے بالکل الٹ عوامی ضروریات اور مفادات میں سے پیدا ہو رہے تھے اور انہیں کو لے کر چل رہے تھے۔ یہ خیالات خاص طور پر ہنر مند کاریگروں، کمیوں اور کسانوں کے خیالات تھے۔ وحدت الوجودی سوچ سب سے کمتر کو بھی انسان ہونے کا شرف دیتی تھی کیونکہ اگر خالق اپنی مخلوق میں موجود ہے تو وہ سب میں موجود ہے اور سب برابر ہیں پھر نابرابری کیوں؟

بابا فرید نے کہا۔

خالق خلق میں خلق وسے رب ماہنہ
مندا کس نوں آکھیئے جب کوئی دوجا ناہنہ

اور پھر بابا نانک نے بھی یہی بات اپنے طریقے سے کی۔

الف اللہ نور اپایا قدرت دے سب بندے
اکو نور سے سب جگ اپجیا کی چنگے کی مندے

بابا نانک کے سو سال بعد شاہ حسین پیدا ہوا۔ یعنی بابا جی لودھیوں کے دور میں تھے اور بابر کو آتے دیکھا تھا جبکہ شاہ حسین اکبر کے دور میں تھا اور جہانگیر کو آتے دیکھا تھا۔ اس دوران معاملات زیادہ واضح ہو چکے تھے۔ مذہب حکمران کلچر کی برتری کا ہتھیار بن چکا تھا سو شاہ حسین نے مذہب سے بالاتر ہو کر انسان ہونے کی روش اپنا لی۔

شاہ حسین کے بعد یہ سوچ آنے والے وقت کی پنجابی شاعری کا لازمی حصہ بن گئی۔

مسلمان ہندو اور سکھ مذاہب میں تفریق یا پھر مسلمانوں کے اندر فرقہ بندی اصل میں ایک طرف تو پنجاب کے عوام کو چھوٹے چھوٹے گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کر کے ان کو کمزور رکھنے کی کوشش تھی تو دوسری طرف حکمرانوں کو برتر ثابت کر کے طاقتور رکھنے کی ضرورت بھی تھی۔ بلکہ وہ تمام خیالات اور قدریں جو حکمران کلچر کے اجزا تھے اصل میں حکمرانوں کو معاشی اور سیاسی طور پر مضبوط رکھنے کی چالیں تھیں۔ سو حکمران کلچر بھی عوام پر حکومت کرتے رہنے کی سیاسی چال تھا اور مکمل طور پر عوام دشمن تھا۔ شاہ حسین اور اس کے بعد آنے والے شاعروں نے اسی عوام دشمن سیاست اور نظریات کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔

(کافی شاہ حسین)

جگ میں جیون تھوڑا کون کرے جنجال
کیں دے گھوڑے ہستی مندر، کیں داہے دھن مال
کہاں گئے ملاں کہاں گئے قاضی، کہاں گئے کٹک ہزار
ایہہ دنیا دن دو پیارے، ہر دم نام سنبھال
کہے حسین فقیر سائیں دا، جھوٹھا سب بیوپار

پنجاب کی قدیم ثقافت کو ہم ذرا زیادہ گہرے طریقے سے دیکھیں تو ہمیں اس کی تین پرتیں صاف نظر آنے لگیں گی ایک تو حکمران ثقافت جو وجوگ کی حالت میں ہے۔ یعنی زبان، رسم ورواج، لباس غرضیکہ ہر شے یہاں کی نہیں ہے یہ ثقافت اپنے اصل میں جاگیردارانہ ثقافت ہے بادشاہ سب سے بڑا جاگیردار ہے۔ دوسری پرت کو ہم جاگیردارانہ ثقافت کہہ سکتے ہیں یہ ان جاگیرداروں کی ثقافت ہے جو یا تو پنجابی تھے یا وقت کے ساتھ پنجابی بن گئے اور عوام کے درمیان رہتے تھے۔ بظاہر اس ثقافت میں وجوگ نظر نہیں آتا یعنی زبان رسم ورواج، لباس وغیرہ سب عوام جیسے ہیں مگر ان کے خیالات، اخلاقی اقدار اور طاقت برقرار رکھنے کے تمام ہتھکنڈے حکمرانوں والے ہیں کیونکہ یہ بھی اوپر والے حکمرانوں کی طرح عوام کی کمائی پر پل رہے ہیں بلکہ عوام میں بادشاہ کے نمائندے ہیں اور خود چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں۔ یہ دونوں ثقافتی پرتیں اندر سے آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔

اور تیسری ثقافتی پرت عوام کی ہے محنت کش عوام یعنی کسان کمی کاریگر مزدور

وغیرہ۔ یہ ثقافتی دھارا اوپری پرتوں سے نہ صرف ظاہری طور پر مختلف ہے بلکہ اندرونی طور پر بھی مختلف ہے یعنی ان کے نظریات اور خیالات نہ صرف اوپری طبقوں سے مختلف ہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کی لڑائی بھی ہے۔ یہیں سے پنجاب کی مشہور داستان ہیر رانجھا پیدا ہوتی ہے۔



کلام وارث شاہ

چیتا معاملے پین تے بجھ جاتیں عشق جالنا کھرا دو ہیلڑا ای
جو آکھنا اے ہنے آکھ مینوں ایہو سچ تے جھوٹھ دا ویلڑا ای
تاب عشق دی جھلنی کھری اوکھی عشق گروتے جگ سب چیلڑا ای
ایتھوں چھڈ ایمان جے نس جاسیں انت روز قیامت دے میلڑا ای

مینوں بابلے دی سونہہ رانجھیا وے مرے ماں جے تدھ تھیں مکھ موڑاں
تیرے باجھ طعام حرام مینوں تدھ باجھ نہ نین نہ انگ جوڑاں
خواجہ خفر تے بیٹھ کے قسم کھاہدی تھیواں سورجے پریت دی ریت توڑاں
کوڑھی ہوئیکے نین پران جاون تیرے باجھ جے کونت میں ہوز لوڑاں

بلھے شاہ

حاجی لوک مکے نوں جاندے میرا رانجھا ماہی مکہ
میں تاں منگ رانجھے دی ہوئیاں میرا بابل کردا دھکا
حاجی لوگ مکے نوں جاندے اساں تاں جانا تخت ہزارے
جت ول یار اتے ول کعبہ بھانویں کتاباں چارے

سچل سرمست

رانجھو کھیڑا دو نہیں میں ہاں ہیر رہی ونج کتھے
جھنگ سیال تے تخت ہزارا دو نہیں ڈٹھم اتھے
اساں پیو سے ونج اتھاہیں ناؤں کہیں دانہ تھے تھے
گم ہوئی بھی ہیر اتھاہیں موج وڑھی آہی جتھے
سچو صاحب ہکو آہا وال نہ کائی وتھے وتھے

کافی خواجہ غلام فرید

شاہ رانجھا البیلا، جوگی جادوگر وے
یار رنجھیٹے مرلی واہی، کرکر پیچ ہنر وے
تخت ہزاروں رانجھن آیا، ہیر تتی دے گھر وے
جوگن تھیساں خاک رمیساں، رلساں شہر بحر وے
ماپیو چھوڑ لگی لڑ تیڈے، ساول کاری کر وے
اتنا ظلم مناسب ناہیں، رب کولوں کجھ ڈر وے
رانجھا جوگی میں جوگیانی، ڈتڑی عشق خبر وے
یار فرید نہ وسرم ہرگز، سکدی ویساں مر وے

حکمران جاگیردار کلچر میں انسانی رشتوں کی درجہ بندی ہے وہ چھوٹے اور بڑے کے درجوں میں بندھے ہوتے ہیں کیونکہ یہ استحصال پر مبنی دبانے والے رشتے ہیں۔ عوام میں سارے رشتے بالآخر برابری کے رشتے ہیں کیونکہ سبھی دبے ہوتے ہیں مگر اس دباؤ سے نکلنا بھی چاہتے ہیں اور جب اس دباؤ کو توڑ کر وہ کوئی رشتہ بناتے ہیں تو اس کو ہی لوک دانشوروں نے عشق کہا ہے۔ ہیر اور رانجھا کو آپس میں عشق ہو جاتا ہے۔ عشق برابری کا رشتہ ہے مگر جاگیردار کلچر برابری کے رشتوں کو نہیں مانتا وہ تو کمزور کو دبا کر جھکا لینے والا کلچر ہے۔ وہ کمزور طبقات کو دبا کر ان سے ان کا حق چھین لیتا ہے۔ کمزوروں میں سب سے کمزور عورت ہے سو جاگیردار کلچر عورت کو اپنے ذاتی فیصلے کرنے کا حق نہیں دیتا۔

حکمران جاگیردار کلچر دراصل مردوں کی بالادستی کا کلچر ہے۔ ہیر اور رانجھا کی داستان اس کلچر کے خلاف کمزوروں کی بغاوت ہے۔ ہیر عورت ہونے کے ناطے اپنے فیصلے خود کرنے کے حق کی علامت ہے تو رانجھا جاگیردارانہ مرد شاونزم کے خلاف لڑائی کی علامت۔ رانجھا جاگیردار گھر کا فرد ہے وہ تمام طرح کی جاگیرداریت چھوڑ کر ایک نیا رشتہ بناتا ہے، عشق کا رشتہ۔ اس رشتے کو نبھانے کے لئے وہ مویشی چرانے والا چاکر بن جاتا ہے۔ ہیر عورت ہونے کے ناطے جسمانی طور پر جاگیردار خاندان سے علیحدہ تو نہیں ہو سکتی مگر وہ تمام جاگیردارانہ سہولیات اور آسائیشات سے ناطہ توڑ لیتی ہے۔ یوں یہ دونوں عشق کرنے والے عوام کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ہیر کی داستان کو شاعری میں پنجاب کے 40 سے زیادہ شاعروں نے لکھا

یہاں ہم دو کی بات کرتے ہیں ایک دمودر داس جو شاہ حسین کا ہمعصر ہے اور دوسرا وارث شاہ جو بلھے شاہ کا ہمعصر ہے۔ اگر ہم ان کی شاعری کو غور سے پڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ہیر اور رانجھا کو عشق کرتے ہی کمزور لوگوں (عوام) کا ساتھ مل جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی نہ کسی شکل میں ان کے ساتھ ہیں اور ہیر رانجھا ان کی اوٹ میں اپنا عشق پالتے رہتے ہیں۔ آخر کار جب رانجھا اور ہیر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور گرفتار ہو کر کوٹ قبولہ کے راجہ کے دربار میں لائے جاتے ہیں تو راجہ جاگیردارانہ کلچر کے حق میں فیصلہ سناتا ہے ہیر کو واپس کر دیتا ہے اور رانجھے کو سزا سنا دی جاتی ہے۔ تب شاعر دمودر داس کہتا ہے کہ کوٹ قبولہ کے لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں اور شدید بے چینی پھیل جاتی ہے۔ بات کو ہاتھ سے نکلتی دیکھ کر راجہ اپنا فیصلہ واپس لیتا ہے۔ وارث شاہ نے اسی واقعہ کو علامتی طور پر یوں کہا ہے کہ کوٹ قبولہ میں ہر طرف آگ لگ جاتی ہے اور اس آگ کو بجھانے کے لئے راجہ اپنا فیصلہ واپس لے کر ہیر اور رانجھا کے حق میں فیصلہ دیتا ہے۔ یوں یہ داستان علامتی طور پر پنجاب میں لوک ثقافت کی حکمران جاگیردار ثقافت پر فتح ظاہر کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سچ کی جھوٹ پر فتح۔ مگر یہ سچ عوام کا سچ ہے جس کا ساتھ ان کے فقیر شاعر دے رہے ہیں۔ جاگیردار کلچر نہ تب اس سچ کو مانتا تھا نہ اب مانتا ہے۔

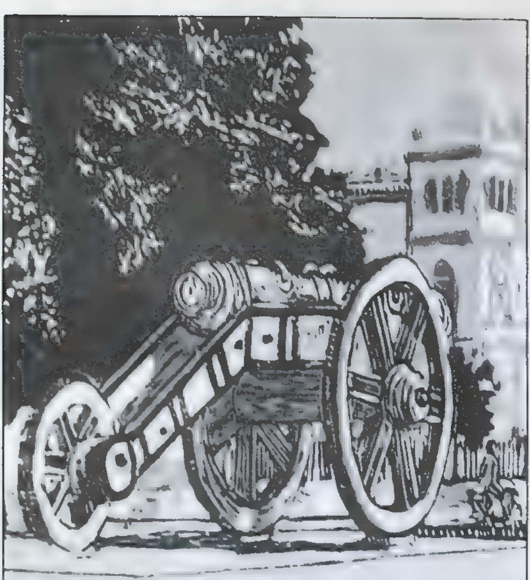
ہیر رانجھا، بابا نانک اور شاہ حسین کی درمیانی صدی میں ہوتے اور دیکھتے دیکھتے ان کی داستان پنجاب کے عوام میں پھیل گئی۔ شاعری میں گا کر سنائی جانے لگی اور ڈرامہ کی شکل میں کھیل کر دکھائی جانے لگی۔ دمودداس پہلا شاعر ہے جس نے

شاعری میں اس داستان کو لکھا اور شاہ حسین پہلا شاعر ہے جس نے اس داستان کو اپنی شاعری کی علامت بنایا پھر اس کے بعد یہ داستان پنجاب کے شاعروں کی شاعری کی مستقل علامت بن گئی۔ ایک اور بات پنجابی کلاسیکی شاعری کے حوالے سے کہ ہمارے شاعر نہ صرف کم تر لوگوں کے شاعر تھے بلکہ وہ خود بھی اپنے آپ کو کم تر کی جگہ رکھ کر بات کرتے تھے اس داستان کے بعد پنجابی شاعری میں کمتروں سے کمتر یعنی عورت کی جگہ خود کو رکھ کر بات کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔

شاہ حسین نے ہیر بن کر بات کی۔

نی ماتے مینوں کھیڑیاں دی گل نہ آکھ
رانجھن میرا میں رانجھے دی، کھیڑیاں نوں کوڑی جھاک
لوک جانے ہیر کملی ہوئی، ہیرے دا ورچاک
کہے حسین فقیر سائیں دا، جان دا مولے پاک







آج کے پنجاب کو سمجھنے کیلئے ہمیں گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی معاشی اور ثقافتی تاریخ کو دیکھنا ہو گا۔ برطانوی سامراجیت کے قبضے میں آنے کے بعد پنجاب میں انگریز نے جو کچھ کیا اور جو کچھ بنایا اس نے ہی نئے پنجاب کی بنیاد رکھی۔ انگریزوں کا پنجاب میں عمل دخل 1846 ء میں سکھوں سے جنگ جیتنے کے بعد شروع ہو گیا اور دو سال کے عرصے میں انہوں نے پنجاب پر مکمل تسلط حاصل کر کے اس کو 1848 ء میں برطانوی حکومت کا حصہ بنا لیا یوں پنجاب انگریزوں کے ہندوستان کا ایک صوبہ بنالیا گیا۔

مغلوں کی حکومت کے آخری دور میں جب وہ کمزور ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے تو پنجاب کے مالک کاشتکار جاٹ جو سکھ مذہب میں شامل ہو گئے تھے انہوں نے خود کو جنگی سطح پر منظم کر لیا اور یوں برادری کے بڑے سردار بن گئے کیونکہ ان کے پاس مغلوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا تجربہ بھی تھا اور اپنے اپنے علاقے میں برادری کی حمایت بھی حاصل تھی۔ جب مغل کمزور پڑ گئے تو ان سکھ سرداروں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ آپس کی اس لڑائی میں رنجیت سنگھ سب سے طاقتور سردار کی حیثیت سے سامنے آیا اور اس نے پنجاب پر سکھ حکومت کی بنیاد رکھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قریباً 40 سال حکومت کی۔ اس دوران انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو چکا تھا حتیٰ کہ پنجاب ہی کی دو ریاستوں یعنی پٹیالہ اور بھاولپور میں نوابوں کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا عمل دخل حاصل کر چکا تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سردار پھر آپس میں لڑنے لگے ان دس سالوں میں ان سکھ جنگی

سرداروں نے پنجاب میں مار دھاڑ اور افراتفری پھیلائے رکھی اور یہی بات انگریز کی کامیابی کا زینہ بھی بنی۔ سکھ دربار کے ان سرداروں نے بڑی آسانی سے خود کو انگریز کی غلامی میں دے دیا مگر پنجاب کے عوام کو یہ غلامی فوری طور پر ہضم نہیں ہوتی۔ ملتان میں عوام کی نئے حاکم کے خلاف نفرت خودرو طریقے سے پھوٹ پڑی پھر ایک آدھ سردار نے بھی بغاوت کی اور یوں انگریز کو ان مسائل پر قابو پاتے پاتے دو سال لگ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ہی 1857 ۔کی بغاوت ہندوستانی فوجیوں میں پھوٹ پڑی یہ وہی فوج تھی جس کے ذریعے انگریز نے پنجاب پر قبضہ کیا تھا۔ اب ان نئے حکمرانوں کو پنجاب پر فوجی لحاظ سے بھی زیادہ انحصار کرنا پڑا۔ اس دوران جن لوگوں نے انگریز کی پنجاب پر تسلط میں مدد کی اور 1857 ۔کی بغاوت کے لئے نئی بھرتی دی اور تعاون کیا وہ لوگ ہی پنجاب کا نیا جاگیردار طبقہ بنے۔ یہ جاگیردار ایک طرف اپنے ہی عوام کے غدار تھے اور دوسری طرف انگریز کے پیدا کردہ ٹوڈی بھی تھے۔ یہ جاگیردار طبقہ نیا اس لئے تھا کہ اب انگریز نے ان کو زمین کے مالکانہ حقوق دے دیئے تھے .جبکہ پہلے اس طبقے کے پاس صرف لگان اور ٹیکس وصول کرنے کے اختیارات ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ان نئے حالات میں ان کی اطاعت بھی بے مثل تھی۔ اس طبقے میں سے ہی پنجاب کی دو بڑی پارٹیاں پیدا ہوتیں یعنی پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی اور پنجاب مسلم لیگ۔ پہلی پارٹی سیکولر تھی اور اس میں مسلمان سکھ اور ہندو زمیندار اور جاگیردار شامل تھے .جبکہ مسلم لیگ درمیانے طبقے کے افراد سے .بہت جلد مسلمان جاگیرداروں کے قبضے میں آگئی اس پارٹی کی بنیاد مذہبی تفریق پر تھی اور جوں جوں

یہ مذہبی تفریق بڑھتی چلی گئی توں توں یہ پارٹی مضبوط ہوتی گئی۔

انگریز نے پنجاب میں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام بنایا جس سے پنجاب میں زیر کاشت رقبہ سے چار گنا زیادہ رقبہ پر کاشت شروع ہوئی یوں پنجاب میں بہت بڑی سطح پر آباد کاری ہوئی۔ نہری نظام سے پہلے کی حالت کچھ یوں تھی کہ وسطی اور مشرقی پنجاب میں کاشت کاری سب سے زیادہ ہوتی تھی بلکہ اب تو ان علاقوں میں آبادی بڑھ چکی تھی اور زمین چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی اور تھوڑی پڑ چکی تھی جبکہ زرعی ٹیکنالوجی میں یہ سب سے آگے تھے۔ دوسرا وہ علاقہ تھا جس پر نہری نظام بنایا گیا یعنی جنوب مغربی پنجاب یہ بار کا علاقہ کہلاتا تھا دریاؤں کے ساتھ ساتھ پرانی قسم کی کاشت کاری موجود تھی مگر زیادہ لوگ مویشی پال تھے۔

انگریز نے پنجاب میں نو (9) کینال پراجیکٹ بنائے جو نو بڑی اور ان کی چھوٹی نہروں پر مشتمل تھے۔ آباد کاری سکیم کے تحت وسطی اور مشرقی پنجاب کے کاشتکاروں میں یہ زمین تقسیم کی گئی یوں پنجاب کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بہت بڑی سطح پر آبادی کا انتقال شروع ہوا اور آباد کاری ہوئی ان علاقوں کو کینال کالونی کہا جاتا تھا۔ مشرقی پنجاب کی کاشت کار ذاتوں مثلاً جاٹ، ارائیں، گجر، راجپوت وغیرہ کو ہی انگریز نے کاشتکار ذاتیں قرار دیا اور انہی کو زمین الاٹ کی۔ شروع میں تو ان کاشتکاروں کو انگریز سرکار کے مزارع کی حیثیت دی گئی مگر ان کے احتجاج کے بعد ان کو ملکیتی حقوق دے دیئے گئے۔ چھوٹی ملکیت 14 سے 50 ایکڑ تک دی گئی۔ یہ نئی زمین کا تین چوتھائی تھا۔ یوں بہت بڑی تعداد میں دیہاتی

درمیانہ طبقہ وجود میں آیا۔ ان لوگوں کو زمین دے کر انگریز نے دوہرا کام کیا۔ ایک طرف تو زیادہ آبادی اور سیاسی بے چینی والے علاقے سے آبادی کا اخراج کر کے اس نے اپنی سیاسی سہولت حاصل کی تو دوسری طرف اپنی نئی مشینی صنعت کے لئے کم سے کم وقت میں خام مال حاصل کرنا شروع کیا۔ جبکہ مقامی کسانوں میں زمین تقسیم کر کے وہ یہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ جنوب مغربی پنجاب کے مقامی کسان نسبتاً زیادہ پسماندہ تھے۔ یہی معاشی بے انصافی مقامی لوگوں میں چوری اور رسہ گیری کے رجحان کی نمائندہ بنی اور بعدازاں پنجابی سرائیکی لسانی تضاد کے پیچھے بھی یہی عوامل کارفرما ہے۔ اس کے علاوہ ایک زمیندار طبقہ بھی پیدا کیا گیا۔ سرکاری طور پر زمینداران کو کہا گیا جو خود کاشت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی زمین یا تو ٹھیکے پر دیتے تھے یا مزارگی پر دے کر حصہ وصول کرتے تھے۔ یہ لوگ پہلے سے ہی سماجی طور پر برتر لوگ تھے ان میں مسلمان ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے۔ ان کو سدھنائی اور سہاگ پارا کینال کالونیوں میں 50/60 ایکڑ کے ٹکڑے دیئے گئے پھر چناب کینال کالونی میں ان کو 50 سے 150 ایکڑ تک دیئے گئے جو قریباً ایک لاکھ پچاس ہزار ایکڑ سے زیادہ رقبہ پر مشتمل تھے۔

چناب میں ہی قریباً ایک لاکھ تیس ہزار ایکڑ اراضی جن کو دی گئی ان کے لئے Capitalist کی اصطلاح استعمال کی گئی اور یہ لوگ غیرزراعت پیشہ تھے ان کو 150 ایکڑ سے 600 ایکڑ کے ٹکڑے ملکیت میں دیئے گئے۔ اس طرح دوسری کینال کالونیوں میں بھی زمیندار طبقہ پیدا کیا ان کو زمین دینے کا معیار صرف یہ تھا کہ مذکورہ

شخص یا اس کے خاندان نے برطانوی حکومت کے لئے کس قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ جنوب مغربی پنجاب، جہاں نہری نظام بنا، میں پہلے سے موجودہ زرعی اشرافیہ کو بھی ان کی خدمات کے عوض بہت بڑی مقدار میں زمینیں دی گئیں۔ یہ زمینیں یا تو غیر آباد تھیں یا کنویں کے پانی سے کاشت ہوتی تھیں۔ ان رقبوں کو بھی کینال کالونی میں شامل سمجھا گیا مگر اس کے علاوہ بھی انہیں نہری زمینیں دی گئیں اور یوں ایک سیاسی اشرافیہ وجود میں لائی گئی۔ ان میں وہ خاندان شامل تھے جنہوں نے 1857 کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور فوج کے لئے بھرتی وغیرہ دی۔

پیروں اور سجادہ نشینوں کو بھی بڑی زمینداریاں دی گئیں اور ان کے لئے مقدس ذات Holy Castes کی اصطلاح استعمال کی گئی جیسے مسلم سید وغیرہ یہ وہ لوگ تھے جو مقامی عوام میں برطانوی سامراج کے خلاف نفرت کی آگ بجھانے کے کام آتے تھے۔

پنجاب میں بننے والے تمام محکموں کو ان کے ملازمین کے لئے زمینیں بھی دی گئیں ان کو غیر زراعت پیشہ گرانٹ کے طور پر یہ رقبہ دیا گیا کاروباری لوگوں کو بھی زمینیں دی گئیں۔ یہ زمینیں زیادہ تر نیلامی کے ذریعے دی گئیں یوں پنجاب کے امیر غیر زراعت پیشہ لوگوں کو بھی زمینوں کا مالک بنا دیا گیا۔

انگریزوں نے پنجاب کی زمینوں کو اپنے مقاصد کے لئے بہت بے دریغ بانٹا۔ جن ذاتوں کو اس نے زراعت پیشہ ذاتیں قرار دیا تھا ان کو ہی مارشل ذاتیں قرار دے کر برطانوی ہند کی اکثریتی فوج پنجاب سے ہی بھرتی کی گئی۔ پورے ہندوستان میں

پنجاب واحد صوبہ تھا جہاں فوج میں بھرتی ہونے پر نہ صرف تنخواہ ملتی تھی بلکہ ریٹائر ہونے پر زمین کی ملکیت بھی ملتی تھی۔ اور اگر کچھ اچھا کر دیا ہے تو مزید زمین بطور انعام کے بھی ملتی تھی۔ انگریز نے تمام کالونیوں میں فوجیوں کو دوسروں سے بہتر زمینیں الاٹ کیں۔ جیسے چناب کالونی میں فوجیوں کو 80,000 ایکڑ بانٹی گئی۔ جہلم کالونی میں بھی 80,000 ایکڑ اور نیلی بار میں 75,000 ایکڑ زمین بانٹی گئی اور یہ گرانٹ مسلسل جاری رہی۔ اس کے علاوہ فوجی معاملات کے لئے بھی زمین دی گئی جیسے شروع میں اونٹ پالنے کے لئے اور پھر گھوڑی پال سکیم کے تحت زمین الاٹ کی گئی یہ سکیم فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھی۔

یوں انگریز نے جاگیرداروں کے بعد سرکاری افسر و ملازمین اور فوجی ملازمین کو سب سے زیادہ مراعات دیں۔ سرکاری و فوجی ملازمین سماجی طور پر بہتر طبقہ کے طور پر ابھرے۔ پاکستان بننے تک یہ دونوں گروہ باقی عوام سے زیادہ طاقتور اور ترقی یافتہ ہو چکے تھے اور پاکستان بننے کے بعد یہی لوگ مارشل لاء کی وجہ بھی بنتے رہے۔

انگریزی حکومت نے بلاشبہ بہت بڑی تعداد میں زمینوں کے مالک پیدا کئے مگر انہوں نے جن لوگوں کو زمین نہیں دی۔ ان کی تعداد بھی کسی طور پر کم نہیں تھی۔ انہوں نے دیہات کے کمی کاریگر اور مزدوروں کو بالکل زمین نہیں دی یہ لوگ بھی نئے مالکوں کے ساتھ وسطی پنجاب سے جنوب مغربی پنجاب میں منتقل ہوتے تھے مگر ان کی سماجی اور طبقاتی حیثیت نہیں بدلی۔ نئے کالونی علاقہ میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں پیروں اور سجادہ نشینوں کے مزارعوں اور کسانوں کو بھی زمینیں نہیں دی

گئیں۔ پھر اس علاقہ میں جو عوام مویشی پال تھے انہیں بھی زمینیں یا سہولت نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں پنجاب سے مویشی پال معیشت تقریباً برباد ہو گئی۔ کمی اور کاریگر کو نہ صرف پسماندہ ہی رکھا گیا بلکہ شعوری طور پر مقامی کاریگری اور صنعت کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔

برطانوی پنجاب کی زرعی پالیسی نے یقینی طور پر سبز انقلاب پیدا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں بہت بڑے علاقے میں کاشت کاری شروع ہوئی اور پنجاب ہندوستان کی "فوڈ باسکٹ" بن گیا۔ نئے طبقے استوار ہوتے جیسے جاگیردار زمیندار اور چھوٹے کاشتکار وغیرہ۔ تجارت میں بہت تیزی آ گئی اور جگہ جگہ منڈیوں کی شکل میں شہر بننے لگے۔ یہ تاجر طبقہ زیادہ تر غیر مسلم تھا۔ سب سے بڑھ کر سول اور فوجی ملازمین بھی ایک طاقتور اور خوشحال طبقہ بن گئے۔ انگریز نے یہ تمام پالیسی پنجاب کی معاشی ترقی کے لئے ہی نہیں بنائی تھی بلکہ اس نے سماجی طور پر اوپر کے طبقات کی سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا سو وہ اس نے حاصل کی بھی۔ ان طبقات نے معاشی نظام میں کسی طور پر بھی ترقی پسندانہ کردار ادا نہیں کیا بلکہ انتہائی دقیانوسی اور سرکاری ٹوڈی کا کردار ادا کرتے ہوئے پنجابی عوام کی ترقی کے راستے کی رکاوٹ بن گئے۔ انگریز پنجاب کو صرف زرعی پیداوار کے علاقے کے طور پر رکھنا چاہتا تھا کیونکہ سے اس کی صنعت کے لئے خام مال مل سکتا تھا۔ وہ پنجاب کی صنعت اور کاریگر سے خوفزدہ بھی تھا سو اس نے کاریگری اور صنعت کو نہ صرف ترقی نہیں دی بلکہ پہلے سے موجود صنعت کو برباد بھی کر دیا۔ زرعی پیداوار کا زاتدیا

تو درمیانی زمیندار کھاتے تھے یا پھر ٹیکس کی شکل میں حکومت کے پاس جاتا تھا۔ یہ کسی طور پر بھی واپس دیہات یا زراعت میں استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ اس پیسے سے فوج اور انتظامیہ کے اخراجات چلائے جاتے تھے۔ یوں یہ سبز انقلاب ایک طرف پسماندگی پیدا کر رہا تھا تو دوسری طرف فوجی اور سول افسر شاہی جس نے بعدازاں پاکستان بننے کے بعد جمہوریت اور عوام دشمنی کا واضح کردار ادا کیا۔

نجم حسین سید

ساڈی چڑھی جوانی تے نالے چڑھیاں نہراں
پتے کچہریاں ٹھانے
نہریں بار نہالڑی اونہاں چٹے ٹوپے لاہ
پر نہیں منی میں گورے دی اسواری دلیا نہیں منی
ساہو کار کراڑ نیپڑے
لوہیاں چھاؤنیاں کھکھراں، بھنیاں جیلاں
چکاں جگیراں والیاں توں میں کھسیاں بوریاں
پر ساڈے ہڑ کھور کھور کے کلر لائیاں بتیاں
منگی بھوں دی مالکی اساں گل وچ پلے پا
مایا لائی شملیاں اساں دفتر ناؤں لکھا
ابلیا روہ باردا
ابلیا روہ
سنیاں او جھڑ وچ ونگاراں اگم دیاں
نھے منڈا ہے سر ڑدے اسیں نیئیں نیر ولا
گھت کاٹھی
گھت کاٹھی مینڈا راٹھ جھلاں وچ ڈھول بولیندے
پر چونڈھی دھپھہ کون دیوے
بی کون
ویکھو ویکھو بی چڑھی جنج گویاں دی
اتوں سوٹ مربعیاں دی ہوئی تے چڑھی جنج گوریاں دی
لٹو کوڈیاں بھنالتو گوڈے تے چڑھی جنج گوریاں دی

اساں رنکپور دھی ویاتی تے چڑھی جنج گوریاں دی
چونڈھی دھپھ کون دیوے بتی کون
داتی نال جڑے ونج سارے اک جمے اک جمن ہارے
ناڑو کپے کون
بتی ہن کون

ایہہ تن مینڈا ابار ہے
وچ ہرن گواچے کجلیاں اکھیاں
رتیاں اکھیاں سیہے گواچے
وچ جنڈ گواچے جھاٹلے ون لہریتے
وچ پگاٹ پھٹ میلنے
ڈیلے سوہے ساوے
پیلو پکیاں تے ایہہ جیہاں پکیاں
وچ گواچیاں کالیاں بوریاں چھاواں نین جھنیاں دے
پیلو پکیاں تے ایہہ جیہیاں پکیاں
وچ گواچے اتھرے نیلے بجل سنب تریڑاں
ایہہ تن مینڈا ابار ہے
جھنوں نہراں تیل نہالیا۔ کنگھی پھیرو کھاتے شینترڑے
جھنوں نہراں کچ پوا کے چم لشکا کے
پچھلے بوہیوں نال بیاریاں ٹوریا
ایہہ تن مینڈا ابار ہے

جب انگریز پنجاب میں آئے تو ان کے پاس ہندوستان میں ایک صدی تک حکومت کرنے کا تجربہ موجودہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامراج کو چلانے کے لئے ایک نئی طرح کی ریاستی مشینری تیار کر لی تھی۔ اپنی حکومت چلانے کے لئے ادارے بھی بنا لیے تھے اور اپنی ضرورت کے مطابق قوانین اور ضوابط بھی طے کر لئے تھے۔ یوں انگریز نے برطانوی ہندوستانی مشینری کے ذریعے سے پنجاب کو فتح کیا اور بنے بنائے حکومتی ادارے یہاں نافذ کر دیئے۔ انگریزی کیمپ میں صرف فوج نہیں تھی بلکہ ایک بڑی تعداد میں نچلے درجہ کے سول ملازمین بھی یہاں آتے تھے۔ یہ وہی ملازمین تھے جو پنجاب میں حکومتی اداروں کے تشکیل پاتے ہی ان میں مقامی ملازمین کے طور پر رکھے گئے تھے جیسے محرر، اہلمد، عدالتی اہلکار، کلرک وغیرہ۔ یہ لوگ اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے سو انہوں نے راتوں رات انگریز حکومت کا کام اردو زبان میں شروع کر دیا۔ پنجاب میں ان لوگوں کو "بابو" کہا گیا۔

انگریزی حکومت کو پنجاب میں ایک ٹوڈی جاگیردار اشرافیہ پیدا کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کیونکہ اپنے مقبوضہ علاقوں کی تاریخ کو جاننے والا انگریز یقیناً یہ جانتا تھا کہ پنجاب کی حکمران اشرافیہ ہمیشہ بادشاہوں نے ہی بنائی اور وہ ان کے رنگ میں ہی رنگی گئی۔ اس دفعہ تو ہمیشہ کی وفاداری کے وعدے پر ہمیشہ کی ملکیت بانٹ دی گئی تھی۔ پھر نہریں نکالنے کے بعد انگریز کے پاس پنجاب کا وسیع میدان بانٹنے کے لئے نکل آیا۔ ہر بادشاہ کی طرح انگریز نے بھی پنجاب کو باپ کا مال سمجھ کر لٹایا اور ساتھ ساتھ ایک مالک کاشتکار یا درمیانہ دیہاتی طبقہ بھی۔ بہت بڑی تعداد میں پیدا کیا۔ حکومتی ادارے بنائے گئے اور ان میں نچلے درجے کے ملازمین کی۔ بہت بڑی تعداد بھرتی کی گئی۔ اس سے ایک طرف انگریز حکمرانوں کو انتظامیہ کے ادارے اور ایک

بڑی فوج بنانے کے لئے مال مل گیا اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد اس کے سیاسی حواریوں یا حامیوں کی مل گئی۔ زرعی اشرافیہ میں سے ہی پنجاب کی دو بڑی سیاسی جماعتیں پیدا ہوئیں۔ یونینسٹ پارٹی اور پنجاب مسلم لیگ اور آنے والے وقتوں میں پنجاب کی سیاسی حکمرانی اور قیادت کی پگڑی یا ٹوپی انہیں کے سر پر رہی۔ جب عوام کو ووٹ کا حق دیا گیا تو عوام کا مطلب تھا مالک لوگ یا پھر انگریزی پڑھنے لکھنے والے۔ یعنی عوام بھی صاحب بہادر نے اپنی مرضی کے چنے تھے۔ اصل میں اس نے مالکوں کو بے مالکوں پر نافذ کر دیا اس سے پنجاب میں انگریز کی سیاسی ضرورتیں بھی پوری ہو گئیں زرعی ترقی بھی بہت ہوئی۔ مگر اکثریتی لوگ جو پہلے ہی کمزور تھے اور بھی زیادہ دب گئے اور جو انگریزی حکومت سے مستفید ہوتے وہ ثقافتی وجوگ کا شکار ہو گئے۔ یہ ثقافتی وجوگ صدیوں سے اوپر سے بہہ کر آتا تھا مگر اس دفعہ یہ بہہ کر نیچے تک آگیا۔ عام آباد کار پنجابی نے مقامی بے مالک کو حقارت سے دیکھتے ہوئے جانگلی کہا۔ انگریز کے پنجاب کی سیاسی قیادت مقامی جاگیردار طبقے سے تھی اور حکومتی ادارے نئے آباد کار طبقے نے سنبھال لئے تھے۔ یوں ان کے تال میل سے پنجاب کا نیا سیاسی ڈھانچہ ابھرا۔

انگریز کے سارے دور میں اکثریتی عوام کا سیاسی اظہار دب گیا تھا مگر پھر بھی انگریزی دور کے تین سیاسی واقعات ایسے ہیں جن میں ہم پنجاب کے عوام کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ پہلا واقعہ انگریزوں کی پنجاب میں عین آمد کے وقت ہوا۔ لاہور میں ریذیڈنٹ مقرر ہو چکا تھا اس نے ملتان کے حاکم مولراج کو طلب کیا تاکہ اس سے ٹیکس کے بقایا جات وصول کئے جائیں۔ مولراج کے پاس اسقدر پیسہ نہیں تھا سو وہ حکومت سے ہی دستبردار ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ نیا حاکم اور دو انگریز

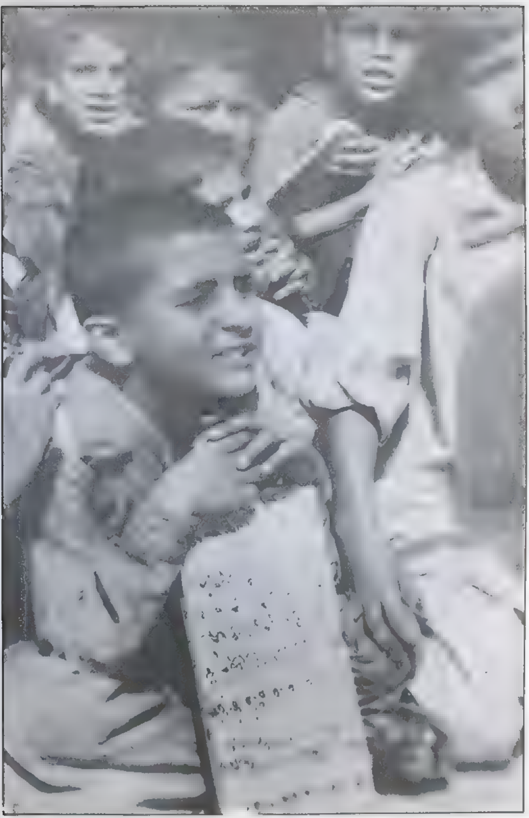
افسر ملتان بھیجے گئے تاکہ وہ مولراج سے چارج لے لیں۔ انگریزوں نے اس چارج لینے کو اپنی سیاسی فتح کی علامت بنایا اور اس کی رسم ادا کرنے کا اعلان کیا۔ اگلی صبح شہر کے لوگ قلعے کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ گھوڑوں پر سوار مولراج اور انگریز افسر آتے۔ دستبردار ہونے والے کو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر انگریز اپنی فتح عوام کو دکھانا چاہتے تھے۔ عوام سے دیکھا نہ گیا لوگوں نے انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ مولراج نے بڑی مشکل سے ان کی جان بچائی مگر پھر چند روز بعد لوگوں نے ان دو انگریز افسروں کو مار دیا۔ ان کے ساتھ کے سپاہی مقامی لوگوں کے ساتھ مل گئے۔ حتیٰ کہ مولراج پھر سے انگریز کے خلاف بغاوت کے لئے تیار ہو گیا بلکہ بغاوت کر بھی دی۔ جو کام صرف دو انگریز افسروں کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا اس کام کو جنگ کے ذریعے مکمل کرنا پڑا۔ عوام ہی مرے اور عوام ہی ہارے مگر مولراج نے پھر انگریز سے معافی مانگ لی۔

دوسرا واقعہ جلد ہی 1857ء میں ہوا۔ جب نیلی بار کے کچھ زمیندار لوگوں کو پتہ چلا کہ ہندوستان میں فوجی سپاہیوں نے انگریز کی حکومت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور بغاوت کر دی ہے۔ یہ بات نہ جانے انہوں نے کیسے سمجھی مگر جلد ہی نیلی بار کے لوگوں نے احمد خاں کھرل کی قیادت میں انگریز کے خلاف بغاوت کر دی۔ مقامی جیل کو توڑ کر قیدی آزاد کرا لئے گئے۔ پھر ایک دو انگریز افسر مرے۔ انگریز نے کئی مہینوں کی فوجی مہموں کے ذریعے اس بغاوت کو ختم کیا۔ اس میں مقامی کافی مرے باقی کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ نیلی بار میں اس واقعہ کے بارے میں کافی لوک شاعری پائی جاتی ہے جسے ڈھولے کہا جاتا ہے۔

تیسرا واقعہ 1919ء میں ہوا جب انگریز نے سیاسی ابھار کو روکنے کے لئے بغیر وجہ بتائے کسی کو بھی گرفتار کرنے اور سزا دینے کا قانون بنایا تو اس کے خلاف

سخت سیاسی رد عمل ہوا۔ لاہور میں ہندوؤں کا ایک تہوار تمام مسلمانوں نے ان کے ساتھ مل کر منایا۔ اس خودرو عوامی اتحاد کا سیاسی اظہار اس وقت ہوا جب امرتسر کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے دو سیاسی رہنماؤں کو گھر بلا کر گرفتار کر لیا۔ امرتسر کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر اکٹھے ہونے لگے۔ ایک جگہ ایک انگریز عورت نظر آئی تو کچھ لوگوں نے اسے مارا پیٹا وہ بے ہوش ہو گئی، پولیس پر پتھراؤ کیا۔ بیساکھی والے دن شہر کے جلیانوالہ باغ میں جلسہ رکھا گیا جس میں انگریز نے سینکڑوں لوگوں کو گولیاں چلوا کر مار ڈالا اور ہزاروں کو زخمی کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد پنجاب میں پہلی دفعہ مارشل لاء لگا دیا گیا۔ یہ مارشل لاء ایک طرح سے پنجاب کے عوام کے خلاف انگریز کا اعلان جنگ تھا۔ جگہ جگہ کوڑے مارے گئے۔ لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ موت کی اور لمبی عمر کی سزائیں دی گئیں۔ یوں پاکستان کے حکمرانوں کو انگریزوں سے اور چیزوں کے ساتھ ساتھ مارشل لاء کا تجربہ بھی وراثت میں ملا۔





برطانوی پنجاب کی ثقافت کو دیکھنے کے لئے اس دور میں وسیع سطح کی آباد کاری، نئے نئے شہروں منڈیوں کی تعمیر اور ریاستی و حکومتی اداروں کی ملازمتیں جیسے معاشی عوامل کو مدنظر رکھنا ہو گا۔ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پنجاب کے ہی علاقوں سے اٹھ کر دوسرے علاقوں میں آن بسی۔ پہلے زمانوں میں تو صرف اوپر والا طبقہ ہی پنجاب میں باہر سے آتا تھا گو آہستہ آہستہ یہاں کی ثقافت میں جذب ہو جاتا تھا مگر خود کو برتر اور مقامی کو گھٹیا سمجھتا رہتا تھا۔ انگریز کے دور میں وسیع معاشی امکانات نے پوری سماجی زندگی اتھل پتھل کر کے رکھ دی۔ بہت بڑی تعداد میں دیہاتی اور شہری درمیانہ طبقہ وجود میں آیا۔ یہ لوگ اپنے علاقے چھوڑنے کی وجہ سے ثقافتی انار کی کا شکار ہو گئے اور سیاسی و معاشی طور پر حکمرانوں کے ساتھ جڑے ہونے کی وجہ سے صدیوں سے چلتے آ رہے حکمران ثقافتی روگ کا حصہ بن گئے۔ یعنی وہ تمام ثقافتی بیماریاں جو پہلے صرف اوپر والے طبقے میں تھیں درمیانے طبقے کو بھی لگ گئیں۔

ذات پات اور مذہبی فرقہ واریت اس نئے درمیانے طبقے کی نئی بیماریاں تھیں اور یہ خود کو برتر ثابت کرنے کا ہتھیار بھی تھے۔ سب سے برتر چونکہ بیرونی حکمران اور ان کی بیرونی ثقافت تھی سو ان جیسا بننے کی کوشش کرنے کو ہی برتر ثقافتی اقدار سمجھا جانے لگا۔ مثلاً زبان کا سوال دیکھیے انگریز اپنے مقبوضہ علاقوں میں انگریزی کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کو بھی سرکاری زبان قرار دیتا تھا تاکہ حکومت کا عوام کے ساتھ تعلق قائم رہے۔ جب وہ پنجاب میں آیا تو اس کے پاس اپنے محکموں کے لئے مقامی زبان میں کام کرنے والے ملازمین کی جو کھیپ موجود تھی وہ اردو لکھنا

پڑھنا جانتے تھے اور پھر پنجاب میں پہلے بھی پنجابی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اب نئی بھرتی اس مقامی زبان میں تیار کرنے میں شاید کچھ وقت لگ جاتا سو اپنی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریز انتظامیہ نے اردو کو ہی سرکاری زبان بنانے کی سفارش کی۔ پنجاب کی اشرافیہ نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی یوں پنجاب میں سرکاری زبان کا مسئلہ فارسی کے آسمان سے گر کر اردو کی کھجور میں اٹک گیا۔

پرانے زمانے میں جاگیردار جس دربار میں حاضری دیتے تھے وہاں فارسی بولی جاتی تھی سو وہ بھی فارسی پڑھتے تھے۔ اب جس دربار میں ان کی حاضری ہوتی تو وہاں انگریزی بولی جاتی تھی سو انہوں نے اپنے بچوں کو انگریزی پڑھائی۔ یوں پنجاب کی نئی حکمران اشرافیہ لندن سے صاحب علم ہو کر آنے لگی اور انتظامی عہدوں کو نئی مڈل کلاس اردو پڑھ پڑھ کر پر کرنے لگی۔

برطانوی لباس یعنی کوٹ پتلون ٹائی وغیرہ مہذب اور برتر لباس کے طور پر سامنے آئے اور مقامی لباسوں کو گھٹیا سمجھا جانے لگا۔ اور تو اور انگریز کے چہیتوں نے اپنے گھر بھی وکٹورین طرز تعمیر پر بنوانے شروع کیئے۔ گھروں میں اندرونی صحن کی جگہ بیرونی لان کا تصور پیدا ہوا۔

برطانوی پنجاب میں اپنے ہی عوام کو جاہل اور پسماندہ سمجھنے کا تصور دراصل ان عوام کو جاہل اور پسماندہ رکھنے کی کوششوں سے پیدا ہوا تھا۔ ضروری تھا کہ لوگ جاہل اور پسماندہ رہیں تاکہ کچھ لوگ پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ بن سکیں اور اس طرح وہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ اس جاہل عوام کا حصہ نہیں بلکہ مہذب بیرونی کلچر کا حصہ

ہیں۔

انگریز نے پنجاب میں نئے تعلیمی ادارے کھولے پرائمری ہائی سکول اور کالج بنائے گئے نئی تعلیم اردو میں تھی اور ساتھ انگریزی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ اس تعلیم کے حاصل کرنے کے دو بڑے مقاصد تھے۔ ایک سرکاری نوکری دوسرے حکمرانی۔ اسی تعلیم نے آنے والے پنجاب کا دانشور طبقہ پیدا کیا ان دانشوروں شاعروں اور ادیبوں نے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ جب فارسی رخصت ہو رہی تھی اور اردو آ رہی تھی تو پاکستان کے قومی شاعر علامہ اقبال جو کہ پنجابی تھے نے اپنی آدھی شاعری فارسی میں اور آدھی اردو میں کی۔ ان کے بعد بھی پنجابیوں میں اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انہیں دانشور لکھاریوں میں ترقی پسندی کی لہر بھی پیدا ہوئی جس کا اظہار ان کی تحریروں میں بھی ہوا۔ پنجاب میں غریب عوام میں رہ کر ان کی زبان میں ان کے لئے شاعری کرنے کی ریت بہت پرانی ہے اور ہمارے کلاسیکی شاعروں کی فہرست بہت بڑی ہے۔ مگر درمیانے طبقے کے یہ نئے دانشور اپنے عوام کے لئے ایک نئے انقلاب کی نوید سنا رہے تھے۔ اوران کی اسی عوام سے ثقافتی بیگانگی بھی پیدا ہو چکی تھی اور وہ اس حصار کو توڑنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ سو ان کی آواز درمیانے طبقے کی ثقافتی وجوگ کی محدود دیواروں سے باہر نہیں جا سکی۔ انگریز سے پہلے کے پنجاب کے عوامی یا انقلابی دانشور عوام سے کوئی علیحدہ چیز نہیں تھے بلکہ وہ معاشی سیاسی اور ثقافتی طور پر عوام سے جڑے ہوئے تھے اور ان کا ہی حصہ تھے۔ جبکہ انگریز دور میں پیدا ہونے

والا یہ پنجابی دانشور (اور ترقی پسند دانشور) طبقہ ثقافتی طور پر عوام کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا سو وہ معاشی اور سیاسی جرأت بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس طرح سے پنجاب کا نیا دانشور طبقہ چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی حکمران کلچر کا حصہ بنتا رہا۔

پنجاب میں انگریز سے پہلے بھی ذات پات موجود تھی مگر عوام میں اس وقت ذات کسی بھی برادری کو پہچاننے کے کام آتی تھی۔ دراصل پرانے پنجاب کے عوام برادریوں میں رہتے تھے اور برادری ایک طرح کی پیشہ ورانہ سی تنظیم تھی جیسے کسانوں زراعت پیشہ لوگوں کی برادریاں اور کاریگروں کمیوں کی برادریاں وغیرہ۔ انگریز نے کچھ ذاتوں کو زمین کی ملکیت کے لئے اور فوج میں بھرتی کے لئے چن کر ان کو بہتر ذاتیں قرار دیا، ظاہر ہے باقی ماندہ ذاتیں کمتر قرار پائیں۔ اسی طرح مذہبی تفریق بھی بڑھتی چلی گئی۔ اب تک پنجاب میں ہندو، مسلمان اور سکھ مل جل کر رہتے چلے آتے تھے اور خود کو پنجابی سمجھتے تھے مگر اب مسلم لیگ نے مسلمان قوم کا تصور دیا تو ان میں دراڑ پیدا ہوتی چلی گئی جس نے آخر کار ان کو علیحدہ کر دیا۔ یہی مذہبی فرق کی دراڑ پاکستان بننے کے بعد خود مسلمانوں کے اندر کے فرقوں کی شکل میں ظاہر ہوئی اور آج کل یہ فرقہ واریت پنجاب میں ایک سماجی روگ بن چکی ہے۔



تحریک پاکستان مسلمانوں کی اقلیت والے صوبوں جیسے یوپی وغیرہ میں نسبتاً زیادہ مقبول تھی اور مسلم لیگ کی زیادہ تر مرکزی قیادت بھی انہیں علاقوں سے تھی۔

1946 تک مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کنفیڈریشن میں رہنے کے لئے تیار تھی اور سیاسی طور پر صوباتی خودمختاری کے حق میں تھی۔ بنگال اور پنجاب دو سب سے بڑی مسلم اکثریت والے صوبے تھے مگر یہاں مسلم لیگ کے لئے حمایت اتنی شدید نہیں تھی سو یہاں کی سیاسی قیادت بھی کم تھی۔ پنجاب میں سیاسی قیادت جاگیرداروں کے پاس تھی اور وہ یونیسنٹ پارٹی میں تھے۔ ان جاگیرداروں کے مسلم لیگ کے ساتھ روابط بھی بنتے چلے گئے اور یہی لوگ مسلم لیگ کی سیاسی قیادت بھی بنے۔

1947 ء میں پاکستان ایک آزاد مملکت بن گیا۔ اس کے پانچ صوبے بنے، مشرقی پاکستان، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان۔ اس میں مشرقی پاکستان بنگالی لوگوں پر مشتمل تھا یہ کل آبادی کا 54 فی صد تھا اور باقی پاکستان سے ایک ہزار میل دور بھی تھا۔ باقی پاکستان میں چار قومیں تھیں اور پانچویں مسلم اقلیتی صوبوں کے مہاجرین۔ یہ اقلیتی طبقہ پاکستان بنتے وقت انتہائی بااثر تھا۔ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت اور پاکستان کی مرکزی حکومت میں اعلیٰ سرکاری نوکریاں انہیں یوپی مہاجرین کے پاس تھیں۔ ان کے بعد فیض یاب ہونے والوں میں پنجاب کی سیاسی اشرافیہ اور سرکاری ملازم تھے۔ فوج میں پنجابیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

پاکستان بننے کے بعد اسی مہاجر پنجابی سول اور فوجی بیوروکریسی نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ستا

سب سے اکثریتی آبادی والا صوبہ مشرقی پاکستان تھا مسلم لیگ کی مرکزی قیادت اور مرکزی حکومت ان کے پاس نہیں تھی اگر ووٹ کی سیاست کو چلنے دیا جاتا تو تعداد کے حساب سے ان کو سب سے زیادہ حصہ ملنا چاہیے تھا مگر نہیں ملا۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد گورنر جنرل ایک اعلیٰ سرکاری افسر غلام محمد بن گیا۔ یوں افسر شاہی سیاسی قیادت پر غالب آ گئی۔ مرکزی حکومت کو مضبوط بنایا گیا۔ پھر مشرقی پاکستان میں بنگالی اکثریت کے مقابلے پر مغربی حصے کے چاروں صوبوں کو ختم کر کے ون یونٹ بنایا گیا۔ یوں ایک مضبوط مرکزی حکومت تو بنائی گئی مگر اس میں تمام قوموں کو برابری نہیں دی گئی۔ سیاسی طور پر مسلم لیگ سب قوموں میں اپنا فعال سیاسی کردار ادا نہ کر سکی بنگالیوں میں اس کی حمایت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور انتخابات بھی ہار گئی۔ مسلم لیگ کی سیاسی قیادت ملک کو نو سال تک کوئی آئین نہیں دے سکی۔ مگر جب 1956 ء میں ایک آئینی ڈھانچہ دیا بھی گیا تو اسے جلد ہی توڑ کر فوجی بیوروکریسی نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ یوں پاکستان میں سول بیوروکریسی سے سیاسی اقتدار فوجی بیوروکریسی کے ہاتھ منتقل ہو گیا۔ فوجی آمر ایوب خاں نے بنیادی جمہوریت کا سیاسی ڈھانچہ اور 1962 ء کا آئین دیا اور خود کو صدر منتخب کروا لیا۔ ایوب حکومت نے سول بیوروکریسی کے ذریعے سے معاملات چلاتے حتیٰ کہ سیاست بھی ان کے تابع کر دی کیونکہ اس کے بنیادی جمہوریت کے

نظام میں اسمبلیوں کے ممبر بھی انتظامی افسروں کی سفارش پر چنے گتے تھے۔

پاکستان میں پانچوں قوموں کے حقوق کو نہ صرف نظر انداز کر دیا گیا بلکہ پامال بھی کیا گیا۔ جس کی وجہ سے سیاسی بے چینی کی ایک بہت بڑی لہر پیدا ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمن اور صوبائی خود مختاری پر مبنی ان کے چھ نکات ان کی سیاسی قیادت کا اظہار بنے۔ جبکہ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو ان کی پیپلز پارٹی اور معاشی مساوات کے نعرے زیادہ واضح طور پر سامنے آتے۔ فوجی حکومت نے حکومت بنگالیوں کے حوالے کرنے کی بجاتے ان پر فوج کشی کی جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان 1971 ۔ میں علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ مغربی پاکستان جو کہ اب پاکستان بنا میں حکومت پیپلز پارٹی کے قائد ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دی گتی۔ اس دور میں 1973 ۔ کا آئین دیا گیا یہ آئین ویسے تو تیسرا تھا مگر یہ واحد آئین تھا جو ایک عوام کی منتخب کی ہوتی اسمبلی نے بنایا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ہی پاکستان کی واحد حکومت تھی جس نے ایک دفعہ کی مدت اقتدار پوری کی ورنہ آج تک پاکستان میں عوام کے ووٹ سے منتخب ہونے والی کسی حکومت نے اپنی مدت پوری نہیں کی۔ پیپلز پارٹی کے دوبارہ برسر اقتدار آتے ہی 1977 ۔ میں فوج نے پھر مارشل لاء لگا دیا اور ضیاء الحق نے ایک ۔ ترین آمریت نافذ کر دی۔ جمہوریت کی سیاست کو بھی نہیں مانا گیا جو عوام کو صرف ایک ووٹ کا اختیار دیتی تھی۔ آئین میں آٹھویں ترمیم کی گتی اور غیر سیاسی بنیادوں پر اسمبلی کا الیکشن کروایا گیا۔ جمہوری سیاست کا راستہ روکا گیا۔ حکومتی اداروں اور افسر شاہی کے ذریعے سے

نہ صرف تمام غیر جمہوری پالیسوں کو چلوایا گیا بلکہ اس کو کرپٹ بھی کر دیا گیا۔ یوں تمام حکومتی ادارے اپنی پیشہ ورانہ کارکردگی بھی کھو بیٹھے۔ اس کے بعد آنے والی تمام حکومتوں کے لئے آئین کی آٹھویں ترمیم کی وجہ سے وزیر اعظم اور صدر کے اختیارات پر بحران پیدا ہوتے رہے۔



امرتا پریتم

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
فیر کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ دردمنداں دے دردیا تے تک اپناں پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب
اج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اج کتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

پنجاب میں پاکستان بننے کے نتیجے میں ہندو سکھ اور مسلمان پنجابیوں میں فسادات ہو گئے۔ یہ فسادات زیادہ تر شہروں میں ہوئے اس میں بہت بڑی تعداد میں قتل و غارت گری ہوئی۔ پنجاب ہندوستانی اور پاکستانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جس کے نتیجے میں وسیع سطح پر آبادی ایک سے دوسرے علاقے میں منتقل ہوئی۔ پاکستانی پنجاب میں سے جتنے ہندو اور سکھ گئے اس سے کہیں زیادہ مسلمان پنجابی مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے یہاں آئے۔ نہریں نکلنے کے بعد یہ آبادی کا دوسرا بڑا انتقال تھا جو پنجاب میں ہوا۔ پنجاب کے شہروں میں کاروباری لوگ زیادہ تر ہندو تھے سکھ زمیندار تھے یا پھر ملازمت پیشہ۔ ان سب کی جگہ کو مسلمان پنجابیوں نے پُر کیا۔ پنجاب کے جاگیردار ہی پنجاب مسلم لیگ کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کی سیاست تحریک پاکستان کے ابھار کے بعد پھر محلات کی سازشی سیاست کا روپ اختیار کر گئی اور عوام سے ان کا ناطہ ٹوٹ گیا۔ یہ سیاسی قیادت خود بھی بدعنوانیوں میں شامل ہو گئی۔ پاکستان بننے کے بعد بحالیات کے سلسلے میں پھر شہری اور دیہاتی جائدادیں بانٹی گئیں۔ اور ان سے اردو مہاجرین اور پنجابی مہاجرین فیض یاب ہوئے۔

انگریز دور میں بنی مڈل کلاس اور نئی مہاجر مڈل کلاس کو نئی پاکستانی ریاست میں ملازمتوں کے وسیع مواقع ملے جس سے درمیانہ طبقہ طاقتور ہوا اور تاجر طبقہ بھی وجود میں آیا۔ ان دونوں نے ہی پنجاب میں صنعتی سرمایہ دار کا بھی روپ اختیار کیا۔ انگریز نے جو دیہاتی درمیانہ طبقہ بنایا تھا پاکستان بننے سے اس میں مزید وسعت اور طاقت پیدا ہوئی اور اس میں مہاجر پنجابیوں کا اضافہ بھی ہوا۔ ان میں سے لوگ

ملازمتیں اور معاشی مواقع حاصل کر کے شہروں کی طرف جانے لگے۔ پاکستان کی مرکزی حکومت میں اردو اور پنجابی مڈل کلاس کو زیادہ معاشی مواقع حاصل رہے۔ پاکستان کی فوج میں بھی پنجابیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ سو مضبوط مرکزی حکومت سے معاشی مفادات کی تار جڑنے کی وجہ سے پنجاب کے درمیانے طبقے میں بھی زیادہ تر غیر جمہوری اور فاشسٹ سیاسی رجحانات پائے جانے لگے۔ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کے نتیجے میں اب پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ بن گیا اور یہاں کے اوپر والے اور درمیانے طبقے نہ صرف پنجاب کے مضبوط طبقے بن گئے بلکہ پاکستان کے مضبوط سیاسی و معاشی طبقات بھی بن گئے۔ ایوب خان کے دور میں جہاں ایک طرف پنجاب میں صنعت کاری ہوئی اور سرمایہ دار طبقہ پیدا کیا گیا وہاں واجبی سی زرعی اصلاحات بھی ہوئیں جس میں زیادہ زمینیں پھر بھی زمینداروں کے پاس ہی رہ گئیں اور تھوڑی سی زمینیں کسانوں میں تقسیم کی گئیں۔ اسی دور میں زراعت کے شعبہ میں کھاد اور نئے بیجوں کا استعمال شروع ہوا ٹریکٹر بھی آیا مگر زراعت سے زیادہ بوجھ ڈھونے کے کام پر لگا دیا گیا۔

65 ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد جب ایوب آمریت کے خلاف شہروں میں طلباء اور درمیانہ طبقہ نے احتجاج شروع کئے اور پھر پیپلز پارٹی اور بھٹو نے شہر اور دیہات کے غریبوں کو معاشی اصلاحات کا پیغام دیا تو اس نے پنجاب کے دیہاتوں کی زندگی میں اک ہلچل پیدا کر دی۔ 1970 ء کے انتخابات میں شہری اور خاص طور پر دیہاتی غریبوں نے پیپلز پارٹی کو جتا دیا کہ پنجاب میں پیپلز پارٹی کی

جیت ہی پاکستان کی حکومت حاصل کرنے کی وجہ بنی۔ یہ پنجاب کی سیاست میں پہلا موقع تھا کہ سیاسی قیادت نے عوام کی طرف رجوع کیا اور عوام نے صدیوں سے پنجاب کی سیاست پر بیٹھے ہوئے جاگیردار نہ بت مونہہ کے بل گرا دیئے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت عوام کی اس سیاسی حمایت کو عوام کے بھلے کے لئے زیادہ استعمال نہیں کر سکی جبکہ اس نے اس حمایت کو ریاستی و حکومتی مشینری اور بالائی طبقوں کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کے لئے دباؤ کے طور پر استعمال کیا۔ پنجاب کے دیہاتی غریبوں کو بھٹو حکومت سے سوائے مالک اور بے مالک میں ناچاقی کے اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ کسان اور زمیندار کے سیاسی متحارب خیالات نے ان کے سماجی تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی اور یوں پنجاب کا صدیوں سے چلا آ رہا زرعی سماجی ڈھانچہ بہت تیزی سے ٹوٹ گیا۔

زراعت میں مشینی کاشت کو فروغ حاصل ہوا۔ مزارعین کو زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا یوں وہ فالتو ہو کر شہروں کی طرف رخ کرنے لگے۔ سڑکوں کے کنارے اور شہروں کے بیرونی علاقوں میں ان دیہاتیوں کو گھر کی زمینیں بھی دی گئیں۔ جگہ جگہ سڑکوں کے کنارے سرکاری زمین پر کچی بستیاں بننے لگیں۔ یوں آبادی کی بہت بڑی تعداد دیہاتوں سے نکل کر شہروں اور سڑکوں کے کناروں پر پھیل گئی اور ایک نیم دیہاتی نیم شہری سماجی زندگی کا رجحان شروع ہوا۔ تاحال پنجاب میں دیہاتی آبادی کا انخلا اور شہروں کی آبادی میں پھیلاؤ ایک بہت بڑا سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ پنجاب میں جہاں ایک طرف بالا طبقات میں معاشی پھیلاؤ پیدا ہوا وہاں عوام میں بے روزگاری تیزی سے پھیلی اور وہ معاشی طور پر پہلے سے بھی کمزور ہو گئے۔ مشینی

کاشت سے زمینداروں کو پہلے سے زیادہ پیسہ ملنے لگا۔ مگر زراعت سے پیدا ہونے والی یہ آمدن زیادہ تر شہروں میں خرچ ہونے لگی واپس دیہات اور زراعت میں یہ آمدنی بہت کم استعمال ہوتی۔

اسی دور میں مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے مسلمان ملکوں میں پاکستانی مزدور جانے لگے۔ ان میں پنجابی مزدور سب سے آگے تھے اور وہ سب سے زیادہ تعداد میں باہر گئے۔ ان لوگوں کی آمدنی نے پاکستان کی معیشت میں اہم مد اختیار کرلی خاص طور پر ضیا کی آمریت میں یہ پیسہ پاکستان کے لئے آمدنی کا بڑا ذریعہ بن گیا۔

پنجاب کے غریب لوگ پیپلز پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے کی وجہ بنے تھے تو پنجاب کے امیر لوگ مارشل لا۔ کی وجہ بنے۔ ضیا آمریت نے پیپلز پارٹی کی سیاست کی سختی سے نفی کی اور غیر جمہوری طریقوں سے پھر بالائی اور جاگیردار طبقوں کو سہارا دے کر سیاسی ایوان تک پہنچایا۔ اس کام کے لئے غیر سیاسی انتخابات کروائے گئے اور برادری ازم پنجاب کے دیہاتی عوام میں ایک بیماری کی طرح پھیلا دیا گیا۔ سیاست میں طاقت کا استعمال کیا گیا۔ سیاسی کارکنوں کو کوڑے مارے گئے موت کی سزائیں بھی دی گئیں۔ حتیٰ کہ منتخب وزیر اعظم کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ یوں طاقت کے استعمال کا سیاسی کلچر سامنے آیا۔ جس کا اظہار کلاشنکوف اور سیاست میں دولت کے استعمال سے ہوا۔ افغانستان میں جنگ کی وجہ سے پاکستان کی فوجی حکومت کو امریکہ اور یورپ کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ اسلحہ اور منشیات کی سمگلنگ سے پنجاب میں ایک نو دولتیہ طبقہ پیدا ہوا۔ پھر سیاست میں دولت کے استعمال نے سیاست سے دولت پیدا

کرنے کے رجحان کو تیزی سے تقویت دی اور یوں اس نو دولتیہ طبقہ میں سیاسی افراد اور سرکاری ملازمین وغیرہ کا بھی اضافہ ہوتا رہا۔

پاکستان کے آزاد ملک بن جانے کے بعد بھی پنجاب میں ثقافتی سطح پر کوئی بہتر حالات پیدا نہیں ہوتے۔ نئے حالات میں اردو مہاجرین اور پنجابی اوپری اور درمیانے طبقے کو وسیع معاشی مفادات حاصل ہونے کی وجہ سے پنجاب میں ثقافتی وجوگ کی لہر اور زیادہ گہری ہو گئی۔ پنجابی مڈل کلاس اور دانشور اب اردو زبان کے ساتھ اور بھی زیادہ جڑ گئے۔ مہاجر پنجابی مفادات نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دے دیا۔ بنگالیوں نے احتجاج کر کے اپنی زبان کو بھی قومی زبان منوالیا مگر پنجاب کی سیاسی قیادت اور درمیانے طبقے کے پڑھے لکھے افراد نے اردو کو ہی پنجاب کی سرکاری زبان رکھا اور دوسروں سے بھی اسے ماننے کا اصرار کیا۔ اردو کو پاکستان کی سالمیت کے ساتھ جوڑا گیا جو کہ ایک طاقتور مرکز کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کے تحت ون یونٹ بنایا گیا اور سندھی، بلوچی، پشتون اور پنجابی قومیت کی نفی کی گئی جس سے نسبتاً چھوٹی قوموں میں احساس محرومی پیدا ہوا۔

1973 ء کے آئین میں اردو کے ساتھ ساتھ چاروں صوبائی زبانوں کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ سندھ میں سندھی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا مگر پنجاب میں اس حق کو لاگو نہیں کیا گیا۔

تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کے حصول کی زبان نہ صرف اردو رہی بلکہ انگریزی بھی بن گئی۔ یوں کہہ لیجئے کہ پنجاب کے بالائی طبقوں کی زبان انگریزی ہو گئی

جبکہ درمیانے طبقے نے اردو کو اپنالیا۔ یوں پنجابی عوام اور پنجابی اوپری طبقوں میں ثقافتی خلیج اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔ مجموعی طور پر غیر پنجابی ہونے کو مہذب سمجھا جانے لگا۔

تحریک پاکستان میں مسلم لیگ مسلمان قوم کے حق کی علمبردار بنی۔ مسلم لیگ پاکستان کو مذہبی ریاست نہیں بنانا چاہتی تھی مگر علماء اور مذہبی رہنما پاکستان کو اسی دلیل کی بنا پر ہی مذہبی ریاست بنانا چاہتے تھے کیونکہ یہ ملک مذہب کی وجہ سے بنا تھا۔ علماء نے پاکستان بننے کے بعد جلد ہی اس کا مطالبہ شروع کر دیا اور مرزائیوں کو کافر قرار دینے کی مہم چلائی۔ مذہبی عناصر کی تعداد زیادہ نہ تھی لیکن ان کے پاس گڑبڑ پھیلانے کی طاقت کافی تھی۔ لاہور میں عارضی مارشل لاء لگا کر اس احتجاج پر قابو پایا گیا مگر مسلم لیگ کی حکومت نے علماء کا یہ رویہ تسلیم نہیں کیا۔ ایوب کی فوجی آمریت میں بھی مذہبی عناصر کے مطالبات کے برعکس لبرل اصلاحات کا رویہ جاری رہا۔ بھٹو کے دور میں آ کر مذہبی عناصر سیاسی طور پر بھی شکست کھا گئے۔ اور پاکستان خاص طور پر پنجاب میں سیکولر روشن خیالی کو فروغ حاصل ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ مذہبی عناصر بھٹو حکومت کے سخت مخالف ہو گئے۔ ان مذہبی عناصر نے بھٹو کے خلاف پھر سیاسی گڑبڑ پیدا کر دی تو مرزائیوں کو کافر قرار دے دیا گیا اور جمعہ کی چھٹی طے کر دی گئی۔

پاکستان کی فوجی بیوروکریسی نے جب بھٹو کی حکومت کو معزول کیا تو اس کا ساتھ سول بیوروکریسی، جاگیردار سرمایہ دار اور تاجر طبقہ دے رہا تھا اور مذہبی عناصر

ان کے آگے آ گئے تھے۔ ضیاء الحق نے بطور فوجی حکمران کے اپنے سیاسی نظریات میں مذہب کو خاص اہمیت دی اس نے ایک مذہبی انداز اختیار کیا اور اسلامائزیشن کا عمل شروع کیا۔ مذہبی گروہوں اور مذہبی عناصر کو تقویت دی۔ یہ سب کچھ اس نے ایک طرف بھٹو کے سیاسی خیالات کی نفی کرنے کے لئے کیا اور دوسری طرف عوام میں مذہبی سیاسی خیالات کو نعم البدل کے طور پر پیش کیا۔ زکوۃ ٹیکس قائم کیا گیا اور مذہبی عناصر کو حکومت کی طرف سے معاشی مدد فراہم کی گئی۔ ضیاء الحق کی اسلامائزیشن اور آمریت نے مل کر پنجاب کی سماجی زندگی میں دوہرے پن کی ایک خلیج پیدا کر دی آمرانہ حکومت چلانے کے لئے سرکاری اداروں اور فنڈز کے بے دریغ استعمال سے رشوت اقربا پروری اور بدعنوانی کو پھیلایا گیا جبکہ اسلامائزیشن کے نام پر مذہبی عناصر کو معاشی اور سیاسی طور پر طاقتور بنایا گیا۔ عورت کا انسانی درجہ گھٹا کر مرد سے آدھا کر دیا گیا۔ قانونی طور پر عورت کی گواہی کو آدھا قرار دیا گیا۔ تعلیم کے نصاب میں مذہبی خیالات کو شامل کیا گیا۔ سرکاری ملازمین میں عبادت کی تلقین کی گئی یوں سرکاری دفتروں میں ایک طرف رشوت خوری عام ہوتی تو دوسری طرف نماز پڑھی جانے لگی۔ سماجی طور پر جبر پیدا ہوا۔ بظاہر اخلاقی مذہبی قدروں کی پاسداری کی جاتی مگر اندر ہی اندر بدعنوانی اور فحاشی پھیلنے لگی۔ انہیں حالات میں سے فرقہ وارانہ کشیدگی بھی پیدا ہوتی اور برادری ازم بھی۔ طاقت اور دولت حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع بھی جائز سمجھے جانے لگے۔ طاقت اور دولت کی عزت ہونے لگی اور شرافت محض ظاہر داری بن کر رہ گئی۔

ضیاء الحق کے دور نے پنجاب میں دوہرے پن کی ثقافت کو پھیلا دیا۔ اور پھر یہ رجحانات بہت تیزی سے سیاست میں بھی پھیل گئے۔ سیاسی پارٹیاں بھی اسی دوہرے پن کی ثقافت کا شکار ہو گئیں۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو ان کو جب بھی موقعہ ملا انہوں نے ضیاء الحق کے پیدا کردہ اس دوہرے پن اور مذہبی عناصر کا ساتھ نہیں دیا۔ 88 ۔90 ۔93 ۔ کے انتخابات میں پنجاب کے عوام نے مذہبی عناصر کو مکمل طور پر رد کر دیا۔ یوں پنجاب کا جو حکمران کلچر بنا اس میں انگریزی اردو زبانوں، یورپی کلچر کے ساتھ عربی آمیزش، اور مذہب (فرقہ واریت) کو خاص اہمیت حاصل تھی اس ثقافتی سکے کا دوسرا رخ رشوت بدعنوانی، منشیات اسلحہ کی سمگلنگ اور فحاشی پر مبنی تھا۔



آج کا پنجاب پاکستان کا سب سے بڑی آبادی والا صوبہ ہے اور سب سے ترقی یافتہ بھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پنجاب میں دوسرے صوبوں کی نسبت ترقی کچھ زیادہ ہے۔ مگر پنجاب آج بھی اپنے قدیم تاریخی تضاد کا شکار ہے۔ یعنی یہاں پر اوپر والے طبقات زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ ہیں جبکہ نچلے طبقے اتنے ہی پسماندہ اور بدحال ہیں۔ پاکستان کی کل آبادی کا قریباً ساٹھ فیصد والا یہ صوبہ رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا قریباً ایک چوتھائی ہے۔ یہاں آبادی کا شدید دباؤ ہے جبکہ پیداوار میں اضافہ اس سے کہیں پیچھے ہے۔ زراعت میں 70 ۔کی دھائی میں مشینی کاشت کو فروغ حاصل ہوا مگر پیداوار میں اتنا اضافہ نہیں ہوا جتنا دنیا کے دیگر ممالک میں ہے۔ ہمارے پڑوسی ہندوستانی پنجاب کی فی ایکڑ پیداوار یہاں سے دگنی سے بھی زیادہ ہے۔ ہماری زرعی پیداوار میں ضروری اضافہ نہ ہونے کا سبب خود زرعی ملکیتی نظام کی پسماندگی ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی مؤثر اصلاحات نہیں کی گئیں اور پھر حکومتی پالیسیاں بھی پیداوار میں اضافے کے لئے ناکافی رہی ہیں۔ دوسری طرف مشینی کاشت سے بے روزگاری پھیلی اور آبادی میں بہت زیادہ اضافے نے بے روزگاری کو شدید تر کر دیا۔ دیہاتوں سے آبادی کا اخراج بہت تیز ہو گیا اور شہروں پر آبادی کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ دیہاتوں اور شہروں کے درمیان سڑکوں پر آبادیوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے یوں شہروں کی غریب آبادیوں میں، سڑکوں پر نیم شہری آبادیوں اور دیہاتوں میں ایک سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ پینے کے پانی کی شدید قلت، نکاسی کا نہ ہونا، صحت کی سہولیات کی کمی اور تعلیمی اداروں کی کمی اس آبادی کے بڑے

کے بڑے مسائل ہیں۔ پاکستان میں عمومی طور پر جبکہ پنجاب میں خاص طور پر آبادی میں اضافہ کی شرح تشویش ناک ہے۔ 3.7 فیصد سالانہ کی رفتار سے بڑھتی ہوتی آبادی کا دباؤ شہروں پر دگنا ہے۔ آبادی میں اضافے کی یہ شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور ترقی کی رفتار انتہائی سست۔

کراچی کے بعد سب سے زیادہ صنعت پنجاب میں ہے مگر یہ پھر بھی اتنی کم ہے کہ اس آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں۔ اس تھوڑی صنعت میں بھی بحران جاری رہتا ہے جس سے کئی کارخانے بیمار ہو کر بند ہو جاتے ہیں یا پھر بہت کم پیداوار کرتے ہیں۔ اس سے ایک طرف صنعتی پیداوار کم ہیں تو دوسری طرف صنعت کی کمی کی وجہ سے روزگار کے مواقع کم ہیں۔ حکومت نے دستکاریوں اور چھوٹی صنعت پر کوئی توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے لوگوں کو دیہاتوں میں ہی روزگار ملنے کے مواقع انتہائی کم ہیں۔

پنجاب میں سیاسی طور پر جاگیردار طبقہ سیاسی جماعتوں کی قیادت اور حکومتی عہدوں پر چھایا رہا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت سیاسی نظام کے طور پر کمزور رہی ہے اور فوجی آمریت زیادہ عرصہ چلتی رہی جس سے بیوروکریسی اور حکومتی انتظامی ادارے ضرورت سے زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں۔ جاگیردار سیاسی قیادت حکمرانوں کی پالتو ہونے کی وجہ سے انتہائی کمزور کردار کی مالک ہے وہ نہ صرف حکومتی اداروں کو عوام کی ضروریات کے مطابق نہیں چلا سکتی بلکہ نوکر شاہی کے ساتھ مل کر بدعنوانی پھیلانے کا کردار ادا کرتی ہے۔ یوں سیاست اور حکومتی ادارے کرپشن کا نظام بن

کر رہ گئے ہیں۔

پنجاب میں تاجر طبقہ نے پاکستان بننے کے بعد بہت زیادہ ترقی کی یا یوں کہہ لیجئے دولت بنائی۔ پاکستان بننے کے بعد جو تاجر طبقہ یہاں پیدا ہوا ان کے پاس تجارت کا ماضی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی تجارتی اخلاقیات تھی۔ پھر حکومتی تجارتی پالیسی کی وجہ سے بھی پاکستان غیر ملکی اشیا کی منڈی بن کر رہ گیا جس میں سے اکثریتی مال سمگلنگ کا ہوتا ہے جس پر نہ صرف حکومت کو ٹیکس نہیں ملتا بلکہ ناجائز منافع پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ اب تو حکومتیں بھی اشیا کی قیمتوں پر کنٹرول نہیں رکھ پا رہیں۔ تجارت میں بے مہار منافع نے بھی صنعتی ترقی میں رکاوٹ پیدا کی کیونکہ تاجروں کو صنعت میں منافع کی اس شرح کی امید نہیں۔

مجموعی طور پر پنجاب کے بالائی طبقے جاگیردار، زمیندار، سرکاری افسر و ملازمین، صنعت کار اور تاجر نہ صرف پنجاب کے دولت مند اور طاقتور طبقے ہیں بلکہ پاکستان کے بھی مضبوط طبقے ہیں جبکہ اکثریتی پنجابی عوام پاکستان کے دوسرے عوام کی طرح نہ صرف غریب ہیں بلکہ پسماندہ بھی۔

بلوچستان

ایک تاریخی خاکہ



ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ۔ پاکستان

بلوچستان

ایک تاریخی خاکہ

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان
حسیب میموریل ٹرسٹ بلڈنگ، ناصر آباد، 2 کلومیٹر رائیونڈ روڈ، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور
فون نمبر: 042-35311701-3,5-6 فیکس: 042-35311710 ای میل: info@sappk.org

نام کتاب: بلوچستان ایک تاریخی خاکہ

تحریر: انور چودھری

کمپوزر: معصومہ امین

ٹائیٹل ڈیزائن: محبوب علی

پینٹنگ: آرٹسٹ جمیل بلوچ

اشاعت دوئم: جنوری 2014ء

تعداد 500

پرنٹر: جمال پرنٹرز، لاہور۔

ناشر: ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان

VOICE & ACCOUNTABILITY PROGRAMME

آواز اور جوابدہی پروگرام

یہ دستاویز ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان نے انسانی بھلائی کے لیے ترتیب دی ہے۔

مندرجات

کھور مرنجءِ مں موسماں شریں
سمّوءِ لالیں بانڈوءِ ماناں
جواں نیینت جنگانی بدیں بولی
کھے وتی دوستیں مڑدماں رولی
دوست ژا دیرں الکھاں بیاياں
باہنڑءِ اولی بوزناں ساراں
میش اود کوہانی سرا لیوراں
زرّتءِ رونی بنت مں تلاّں
(مست توکلی)

ترجمہ

امن کے موسم میں سمّو کے پیارے گھر کی وجہ سے
مرنج ندی کی کیا شان تھی
جنگ کی بیہودہ باتیں اچھی نہیں
کون اپنے پیاروں کی بربادی پسند کرتا ہے
کاش دور چلے گئے دوست
واپس آکر اپنے گھر پھر سے آباد کریں
بھیڑیں پہاڑوں میں گھومیں اور جوار کی
فصلوں کا موسم شروع ہو جائے

ایک بات پہلے

تاریخ کا علم، اپنی دھرتی اپنے لوگوں یہاں تک کہ اپنے آپ کو جاننے کا عمل ہے۔ یہ ایک مثبت عمل ہے جس سے گزرتے ہوئے ہم اپنی دھرتی اپنے عوام یہاں تک کہ اپنے آپ کے لیے آزادی اور ترقی کی راہ پر چلتے ہیں۔ بلوچستان اور بلوچوں کو جاننے کی کوشش اسی عمل کا حصہ ہے۔ یہ کتاب اگر آپ کو تاریخ جاننے کے نئے ڈھنگ کی طرف لاتی ہے تو ہماری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ اور اگر آپ کے ذہن میں نئے سوالات جنم لیتے ہیں جو جاننے کی بنیاد بن سکتے ہوں تو ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں، کیونکہ یہی ہم چاہتے ہیں ۔

اس کتاب کا آغاز جناب اسد رحمٰن اور ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کیا تھا۔ ان کے مسودات اور بلوچستان پر موجود تاریخی اور تحقیقی مواد کی بنیاد پر اس کتاب کو تحریر کیا گیا ہے۔

ہم ان تمام بلوچی دانشوروں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے لکھاری کے ساتھ بلوچستان کی تاریخ کے بارے میں طویل بات چیت کے لیے وقت نکالا۔ ہم خاص طور پر محترم جناب پروفیسر بہادر خان رودینی وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی، محترم جناب پروفیسر نادر قمبرانی ڈائریکٹر مطالعہ پاکستان بلوچستان یونیورسٹی اور محترم جناب آغا نصیر خان کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کے مسودے کو پڑھا اور انتہائی مفید مشورے دیے۔

شعبہ برائے ترقیاتی معلومات
ساؤتھ ایشیاء پارٹنرشپ پاکستان



افغانستان
ایران
سندھ
پنجاب
قلات
بھاگ
زیارت

پیش لفظ

بلوچستان ایک تاریخی خاکہ جسے ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ پاکستان نے شائع کیا ہے اگرچہ ضخامت کے لحاظ سے مختصر ہے لیکن اس میں بلوچستان کی مجموعی تاریخ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ جو لوگ بلوچستان کی تاریخ کے متعلق جاننے کے خواہش مند ہیں ان کی لیے یہ کتاب ایک تاریخی دریچہ کے طور پر میسر ہوگی اور کم سے کم وقت میں بلوچستان کے قبائل، روایات اور تہذیب و تمدن کے سلسلے میں حقیقت پر مبنی مواد مہیا کرے گی۔ یہ پہلی کوشش ہے کہ صوبہ بلوچستان اور اس کے عوام کے بارے میں ایسی کتاب غیر سرکاری ادارے نے شائع کی ہے جو قابلِ تحسین امر ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بلوچستان کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ مختصر اور جامع کتاب کی صورت میں ہو نہیں سکتا۔ زیرِ نظر کتاب میں نہ صرف جدید تاریخ , تہذیب و تمدن , روایات اور قبائل کا تذکرہ ہے بلکہ قبل از مسیح کے تاریخی حالات اور قبائل کی آمد سے متعلق اہم معلومات دستیاب ہیں۔ یقیناً یہ ایک مفصل تاریخ کی جگہ تو نہیں لے سکتی مگر پھر بھی یہ بات باعث مسرت ہے کہ ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ کی اس کوشش سے بلوچستان کو 'مین سٹریم' کے ساتھ ملا کر بلوچستان سے باہر پاکستان کے دیگر علاقوں میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پہلی دفعہ توجہ اس طرف مبذول کی گئی ہے۔

اس قسم کی کاوشیں قابلِ تعریف ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب پاکستان کے لوگوں

کے لیے عمومی طور پر اور تحقیق کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

پروفیسر بہادر خان رودینی
وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ
16- 10- 1998

جان پہچان

کسی ملک اور قوم کو جاننے پہچاننے کے لیے اُس کے جغرافیائی حالات ، تاریخ، ثقافت اور لسانی پس منظر کی چھان بین ضروری ہے۔ تاکہ جانا جا سکے کہ ماضی میں وہ قوم کس نشیب و فراز سے گزری ہے، اُسے کن تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس کے آباواجداد نے اُس کے لیے کیا افتخارات چھوڑے ، جن کی وجہ سے وہ اقوام عالم میں فخر سے سر اونچا کر سکے۔ یا پھر اس کے برعکس تاریخ میں شرمناک واقعات کے سوا اس کو ورثے میں کچھ اور نہیں ملا۔ اگر وہ قوم باشعور اور غیرت مند ہے تو ماضی کے افتخارات پر نہیں اتراتی اور نہ ہی ماضی کے شرم انگیز حالات سے مایوس ہوتی ہے، بلکہ ماضی سے سبق حاصل کر کے عقل و شعور اور علم کے ذریعے اپنے مستقبل کو روشن اور باعث افتخار بنانے کے لیے منصوبہ بندی کر کے جدوجہد کرتی ہے۔

بلوچستان سے متعلق یہ مختصر تاریخی خاکہ دراصل کوزے میں سمندر کو بند کرنے کے مترادف ہے تاکہ باشعور طبقہ اس کو ایک آئینہ سمجھ کر اپنے ماضی اور پھر حال کا چہرہ دیکھے اور اپنے آپ سے خود سوال کرے کہ یہ چہرہ بہت شائستہ ، خوبصورت، شریف، مہذب اور غیرت مند قوم کا چہرہ ہے جیسا کہ عوام کی اکثریت پر یہ بات صادق آتی ہے۔ یا پھر اس کے برعکس انا پرست ، خود پسند، ذاتی مفادات کی غلام اور خود غرض قوم کا چہرہ لگتا ہے جیسا کہ قبائلی اشرافیہ اور سیاسی راہنما محسوس ہو سکتے ہیں۔

یہ تاریخی خاکہ ایک اچھی کوشش ہے جس میں بلوچستان کی طویل تاریخ کو چند اوراق میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

ع۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

پروفیسر نادر قمبرانی
ڈائریکٹر مرکز مطالعہ پاکستان
بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

14- 10- 1998

جغرافية





بلوچستان پاکستان کے چاروں صوبوں میں سب سے بڑا صوبہ ہے۔ ایک لاکھ سنتالیس ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا یہ وسیع خطہ پاکستان میں جنوب مغرب کی سمت میں ہے جبکہ خود بلوچستان کا مشرقی حصہ سندھ اور پنجاب سے جڑا ہوا ہے۔ اسکی شمالی سرحد افغانستان کے ساتھ 720 میل تک چلی گئی ہے۔ مغرب میں سوا پانچ سو میل لمبی سرحد ایران کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور جنوب میں بلوچستان تقریباً پانچ سو میل لمبا ساحل بحیرہ عرب کے ساتھ بناتا ہے۔

بلوچستان وسیع و عریض ریگستانوں اور سنگلاخ پہاڑی سلسلوں کی دھرتی ہے۔ بنجر پہاڑ اور بے آب و گیاہ ریگستان بلوچستان کا جغرافیہ ہی نہیں بلکہ تاریخ بھی ہیں۔ بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی سرسبز وادیاں اور زرعی خطے بھی ہیں جو مجموعی رقبے کا صرف اس قدر ہیں جتنا آٹے میں نمک۔

بلوچستان اندرونی طور پر کئی خطوں پر پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں کوئٹہ سے لس بیلا تک سراوان جھلاوان کا علاقہ ہے قلات جن کا صدر مقام رہا ہے۔ سراوان وہ ریگزار ہیں جو ایران کی سرحد سے ملتے ہیں اور جھلاوان کے پہاڑ ہیں جو انہیں مکران سے علیحدہ کرتے ہیں۔ مکران کا وسیع خطہ سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں پہاڑی سلسلے افغانستان سے جا ملتے ہیں۔ مشرقی بلوچستان میں کوئٹہ، ژوب، لورالائی، پشین اور سبی کے علاقے ہیں۔

بلوچستان میں شدید گرم خطے بھی ہیں جیسے سبی وغیرہ اور ٹھنڈے خطے بھی ہیں جیسے زیارت اور قلات وغیرہ۔ مگر مجموعی طور پر بلوچستان شدید موسموں کے زیر اثر رہتا ہے یعنی سخت گرمی اور سخت سردی۔ ایک بلوچی مقولہ ہے۔"اے اللہ جب تو نے سبی اور ڈھاڈر بنادیا تو تجھے دوزخ بنانے کی کیا ضرورت تھی"۔ سخت موسموں کے اس علاقے میں بارش کی اوسط بھی بہت کم ہے۔ قریباً سال میں اوسطاً 16 انچ بارش ہوتی ہے۔ اس بارش سے ہی جگہ جگہ گھاس اور جھاڑیاں اُگ آتی ہیں جو مویشیوں کو چارہ مہیا کر دیتی ہیں۔

بلوچ مقولہ۔

گرمی بہت گرم ہے۔

خزاں۔ تیز ہوائیں اور بیماری لاتی ہے۔

اور سردی بھوک لاتی ہے ۔

سیاسی اور ثقافتی جغرافیہ میں بلوچستان اس سے کہیں بڑا ہے جسے ہم پاکستانی بلوچستان کہتے ہیں ۔ وہ ایران میں بھی ہے جسے ایرانی بلوچستان کہا جاتا ہے، عراق اور ترکی میں بھی ہے اور افغانستان میں بھی۔

موجودہ بلوچستان انتظامی طور پر چھ ڈویژن اور 26 اضلاع پر مشتمل ہے۔ جن میں 17 اضلاع میں بلوچ اور 9 ضلعوں میں پشتون آباد ہیں۔

بلوچستان کا نام





بلوچستان کی قدیم تاریخ دو عناصر مل کر بناتے ہیں ایک دھرتی اور دوسرے بلوچ عوام جو کئی مختلف قبائل میں رہتے چلے آئے ہیں۔ دھرتی پر موجود نقوش میں سے سب سے پرانے آثار بلوچستان میں ہی ملے ہیں جو تہذیبی طور پر وادی سندھ کی تہذیب کا ہی قدیمی تسلسل ہیں۔ مہر گڑھ کے آثار 6000 ق م، سے 8000 ق م تک کے سمجھے جاتے ہیں، جو کہ ہڑپہ سے کہیں زیادہ قدیم ہیں۔ امری نال اور بہت سی دوسری جگھوں سے جو آثار ملے ہیں وہ بھی ہڑپہ اور موہنجوڈارو سے قدیم ہیں۔

بلوچستان کے تہذیبی آثار خود اس بات کے گواہ ہیں کہ قدیم دور جسے ہم تاریخ میں آریاؤں سے پہلے کا دور کہہ سکتے ہیں، میں بھی یہاں پر لوگ موجود تھے اور ان کے پاس ایک تہذیب بھی تھی۔

کئی پرانی کتابوں میں بلوچستان کی دھرتی کا ذکر کئی مختلف ناموں سے ملتا ہے۔ پارسیوں کی مذہبی کتاب 'اوستا' میں بلوچستان کے ایک علاقے کا ذکر ملتا ہے جسے 'وارا پشین انہا' کہا گیا ہے جو موجودہ پشین ہوسکتا ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ میں پانچویں صدی قبل مسیح کے ایرانی بادشاہ کیخسرو کی مکران کی فتح کا حال لکھا گیا ہے۔

تیسری صدی قبل مسیح میں سکندر یونانی کی فوجیں بلوچستان سے گزر کر واپس گئیں۔ یونانی مورخین نے بلوچستان کے کچھ علاقوں کو گدروشیا' آرکوسیا اور

آریانہ وغیرہ لکھا ہے۔

ابن حوقل نے 950ء میں بلوچستان کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ایک علاقے کا نام کیکانن (موجودہ قلات) لکھا ہے۔

لفظ 'بلوچستان' سب سے پہلے تزک بابری میں ملتا ہے۔ اسی دور میں ابوالفضل نے آئین اکبری میں بھی اس علاقے کو بلوچستان کہا ہے۔

تاریخ فرشتہ 1779ء میں بھی بلوچستان کا لفظ اس علاقے کے نام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں میر نصیر خان نے توران کا نام بدل کر بلوچستان کر دیا تھا۔

انگریزوں کا خیال ہے کہ بلوچستان کا نام ان کی دین ہے۔

بیرونی حکمرانوں اور تاریخ دانوں نے اس علاقے کو شناخت کرنے کے لیے بے شک کئی نام دیئے مگر اس علاقے کو بلوچستان کہے جانے کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ گزشتہ تین ہزار سالوں سے بلوچ اس علاقے میں رہتے چلے آئے ہیں سو قدرتی طور پر اس کا نام بلوچستان پڑ گیا جس کے معنی ہیں 'بلوچوں کی سرزمین'۔

بلوچستان قبائل کی تاریخ





بلوچستان کی قدیم تاریخ کو جاننے کے لیے بلوچوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس دھرتی کو جاننا۔ بلوچ کئی قبائل میں منسلک ہونے کے باوجود خود کو بلوچ ہی سمجھتے ہیں۔ بلوچی ایک ہی طرح کی قبائلی معاشرت کا حصہ ہیں۔ بلوچ کون لوگ ہیں، ان کا حسب نسب کیا ہے؟ کیا یہ قبائل باہر سے یہاں آئے؟ اگر آئے تو کیا یہاں پہلے بھی کوئی لوگ رہتے تھے؟ اگر رہتے تھے تو ان کے ساتھ ان کا کیا رشتہ بنا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کے کئی سوالات ایسے ہیں جن کا تسلی بخش جواب تو ماہرین یا محققین ہی دے سکتے ہیں ہم تو موجودہ معلومات میں سے ایک رائے بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

لفظ بلوچ کو 'کرد' لفظ خیال کیا جاتا ہے۔ بلوچ قدیم زمانوں سے ہی خانہ بدوش اور مویشی پال رہے ہیں۔ پرانے زمانے کے تقریباً سبھی قبائل مویشی پال تھے اور خانہ بدوش بھی، خاص طور پر وسطی ایشیا، عرب، ایران اور افغانستان کے قبائل۔ بلوچستان بھی اسی خطے اور قبائلی معاشرت کا حصہ ہے۔

لفظ بلوچ کے دوسرے معنی جو لیے گئے ہیں وہ نمرود بلوص سے جا ملتے ہیں جو بابل کا بادشاہ اور حضرت نوح پیغمبر کا پوتا تھا، اسے آگ کا دیوتا بھی کہا گیا ہے جو کہ 'بلوص' کا مطلب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لفظ بلوص وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلوچ بن گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بلوچوں میں آگ کے ساتھ خصوصی رشتہ ہے ایک بلوچ رسم

کے مطابق ملزم کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آگ پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کہ بلوچ آگ کے ساتھ احترام کا رشتہ محسوس کرتے ہیں۔ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ آگ سے بلوچوں کا رشتہ ایرانی اثر کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے اور خود بلوچوں کی سخت زندگی میں آگ کی خصوصی اہمیت ان کا اپنا تاریخی رویہ بھی ہو سکتا ہے۔

بلوچوں کے بارے میں پرانی تحریروں اور داستانوں میں بھی ذکر ملتا ہے جن سے ہم کافی کچھ اخذ کر سکتے ہیں فردوسی کے شاہنامہ میں کافی واضح اشارے ملتے ہیں جس میں انہیں کوچ اور بلوچ کہا گیا ہے۔ انہیں جنگجو اور بہادر مانا گیا ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے ایرانی بادشاہ کیخسرو کی مکران کی فتح کا ذکر بھی شاہنامہ میں ہے۔ کیخسرو نہ صرف بلوچوں کو مغلوب کرنے کے لیے لڑا بلکہ اس کی اپنی فوج میں بھی کوچ و بلوچ تھے جو دلیر اور جنگ باز تھے۔

بلوچوں کی روائتی شاعری میں یہ کہا گیا ہے

(ترجمہ)

ہم حلب سے آئے ہیں۔
یزید کے ساتھ ہماری لڑائی ہے۔
کربلا اور بمپور کے درمیان ہماری منزل سیستان ہے۔

(یہ رندوں کی روایتی بات ہے جسے مری بلوچ آج بھی دوہرلتے ہیں)

عرب مورخین بلاذری کتاب فتوح البلدان' اور طبری 'تاریخ طبریٰ' میں خلیفہ حضرت عمر فاروق کی ایران کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے ایران میں بلوچوں کی موجودگی اور سیاسی قوت کا ذکر کرتے ہیں۔

بغداد کی خلافت دور کے مورخ ابن مسکویہ نے بھی بغداد کے بنو عباس کی حکومت اور بلوچوں کے درمیان جنگ کا کافی تفصیلی ذکر کیا ہے۔

گیارہویں صدی کا مورخ نورالدین اوفی بھی اپنی کتاب ' مجموعۃ التواریخ' میں محمود غزنوی کی بلوچوں کے خلاف لشکر کشی کا ذکر کرتا ہے۔ محمود نے اپنے بھانجے میر اسماعیل سلطان کو کرمان فتح کرنے کے لیے بھیجا جس میں وہ ناکام رہا مگر بعد ازاں غزنوی نے بلوچستان کو مغلوب کر لیا۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ بلوچستان کے لیے 'سپر پاور' کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ہتورام تاریخ بلوچستان میں 'داستان امیر حمزہ' کے حوالے سے قیاس کرتا ہے کہ امیر حمزہ بلوچ علاقے میں شکار کے لیے آیا اسے ایک پری زاد ملی جس سے اس نے بیاہ کر لیا۔ اس سے بدیع الزماں پیدا ہوا اور اس کا بیٹا برلچہ تھا یہی نام برلچہ شاید بگڑ کر بلوچ بن گیا ہے۔

داستان امیر حمزہ فارسی زبان میں محمود غزنوی کے عہد میں لکھی گئی یہ بات سہیل بخاری نے اپنی کتاب ' اُردو داستان' میں لکھی ہے اور اس نے ایرانی شاعر اور عالم تقی بہار کی تاریخ سیستان کا حوالہ دیا ہے۔ تقی بہار کا تجزیہ ہے کہ داستان امیر حمزہ کے پیچھے ایک اور داستان ''مغازی حمزہ'' ہے اور اس داستان کا حمزہ وہ شخص ہے جس کا پورا نام حمزہ بن عبداللہ الشاری الخارجی تھا۔ یہ حمزہ ایرانی تھا اور اس کی سیاسی لڑائی عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ تھی۔ سیستان' مکران' سندھ اور خراسان سے اور بھی بہت سے باغی قبائل اس کے ساتھ مل گئے تھے اور یہ لوگ بہت عرصہ تک عباسی خلافت کا مقابلہ کرتے رہے۔ داستان کے مطابق

جب ہارون الرشید مر گیا تو حمزہ خراسانی بھی پانچ ہزار سوار پیچھے چھوڑ کر ہند، سراندیپ اور چین کی طرف چلا گیا۔ اس داستان کا حمزہ ایک عوامی ہیرو تھا یہ ممکن لگتا ہے کہ حمزہ خراسانی کی لوک کہانی کو حمزہ بن عبدالمطلب یعنی حمزہ عربی کی داستان صرف درباری شاعروں نے محمود غزنوی کی فتوحات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے گھڑا ہوگا۔ یہی داستان امیر حمزہ اردو میں اس وقت ترجمہ کی گئی جب انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کیا۔ یوپی میں اس داستان کے کئی ترجمے اور ڈھیروں ایڈیشن اسی دور میں تیار ہوئے۔ جب انگریز نے پنجاب پر قبضہ کیا تو اسی داستان امیر حمزہ کو مشہور پنجابی شاعر مولوی غلام رسول نے پھر لکھا اور اس کے بیسیوں ایڈیشن چھپے اور بکے اس داستان کا امیر حمزہ ایک اسلامی ہیرو ہے جو یہاں پر باہر سے آیا اور اس کے پاس جنوں بھوتوں سے لڑنے کی طاقت ہے اور جادو اس پر اثر نہیں کر سکتا۔ یوں اس حمزہ کی داستان عام بندے کے سامنے باہر سے آئے ہوئے حملہ آور کو ہیرو بنا کر پیش کرتی ہے۔

محمود غزنوی کو عباسی خلافت نے ہند پر حملہ کرنے کا پروانہ جاری کیا تھا جس میں درج تھا کہ وہ خارجیوں کو ختم کرنے کے لیے جا رہا ہے جن کو خلیفہ نہ صرف مسلمان نہیں سمجھتا بلکہ کافر سمجھتا ہے۔ خارجی ان باغی قبائل کو سمجھا جاتا ہے جو عرب سلطنت اور خلافت میں سیاسی تبدیلیوں اور اختلافات کی بنیاد پر یا تو عرب سے ان علاقوں کی طرف آئے خاص طور پر ایران کی فتح کے بعد ایرانی علاقوں سے بھی باغی قبائل آتے رہے۔ یہ قبائل موجودہ پاکستانی بلوچستان، افغانی بلوچستانی اور ایرانی بلوچستان میں آ کر بستے رہے اور ان میں سے اکثر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کچھ

بلوچ قبائل اپنا حسب نسب اپنی سینہ بہ سینہ چلتی روایت کے مطابق عرب کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ عرب خلافت میں سیاسی تبدیلیاں اور اختلافی لڑائیاں اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں۔

اکثر بلوچ قبائل کی تاریخ ایران کے شمال سے جنوب کی طرف اور پھر بلوچستان تک کی ہجرت کا قصہ سناتی ہے۔ بلوچوں کی اس ہجرت کے پیچھے حملہ آوروں کا دباؤ دکھائی دیتا ہے جو ان علاقوں پر چڑھائی کرتے رہتے تھے اور دوسری وجہ ایرانی حکومت سے سیاسی اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ بلوچ قبائل مویشی پال ہوتے تھے کیونکہ ان کے جانوروں کو کھانے کے لیے گھاس اور پینے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے بھی یہ گھاس اور پانی کی تلاش میں نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچ قبائل کی نقل مکانی بلوچستان میں گیارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک جاری رہی۔ اسی دوران بلوچ قبائل کی پرانی نسلی شناخت نئی شکلوں میں تبدیل ہوئی اور آج کے بلوچ قبائل کی قبائلی اور نسلی شناخت اسی دور میں تکمیل پذیر ہوئی۔ پندرھویں صدی کے بعد بلوچ سندھ اور پنجاب کی طرف بھی جانے لگے۔

بلوچی شاعری جس میں بلوچ سرداروں کی بہادری اور لڑائی کے قصے بھی شامل ہیں اور ہجرت کے بھی، یہ زیادہ تر گیارہویں بارہویں صدی کے بارے میں ہیں یہی وقت ہے جب بلوچ سیتان اور پھر مکران تک ہجرت کرتے ہوئے آئے۔

پندرھویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے شروع میں کچھ بلوچ قبائل مکران سے قلات پھر سبی حتیٰ کہ پنجاب کی طرف بھی منتقل ہوئے۔ مشہور بلوچی

داستان کا ہیرو میر چاکر رند اور اس کے رقیب گواہرام لشاری کی تیس سال تک آپس میں جنگ انہیں علاقوں میں جاری رہی۔ پھر چاکر اپنے عوام اور سپاہ کے ساتھ پنجاب کی طرف نکلا۔ ہمایوں اپنا تخت واپس لینے کے لیے ایران سے آیا تو چاکر کی افواج نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ خود چاکر پنجاب میں ساہیوال جا کر بس گیا جہاں آج بھی اس کی قبر موجود ہے اور باقی ماندہ بلوچوں کے گاؤں بھی ہیں۔

ایک جگہ سے دوسری کی طرف منتقل ہوتے رہنا بلوچ قبائل کی معاشی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ یہ ان کی عادت اور رویہ کا حصہ بھی بن گئی تھی۔ قبائلی سرداروں کی آپس کی جنگوں میں جو ہارتا تھا نقل مکانی اس کی سیاسی ضرورت بن جاتی تھی مگر جو جیت گئے اور اپنی ایک قبائلی طرح کی حکومت بنا بھی لی ان میں سے بھی کئی سردار ایسے ملیں گے جو بنی بنائی حکومت چھوڑ کر آگے چل پڑے۔ حمزہ خراسانی اور میر چاکر کی لوک داستانوں میں یہ مماثلت نظر آتی ہے اور یہ روایت آگے بھی چلتی نظر آتی ہے۔

بلوچستان کی وسیع و عریض دھرتی گو کہ بے آب و گیاہ ہے مگر کہیں کہیں سر سبز وادیاں اور تھوڑی بہت بارش ان بلوچ قبائل کے مویشیوں کو زندہ رکھ سکتے ہوں گے مگر پانی کی شدید کمی کی وجہ سے زمین اتنی پیداوار نہیں دے سکتی تھی کہ یہ لوگ ایک ہی جگہ بس کر رہ جاتے۔ دوسری بات یہ کہ عرب میں اسلام کی آمد اور ایران کی فتح کے بعد مختلف علاقوں سے آنے والے یہ قبائل شاید اس علاقے میں ہی آنا چاہتے تھے ایک ایسا علاقہ جہاں تک ان کے دشمنوں اور حملہ آوروں کی پہنچ نہ ہو۔ اگرچہ مویشی پال خانہ بدوش قبائل اپنی ضرورت کے تحت قدرتی طور پر زیادہ زرخیز علاقوں کی

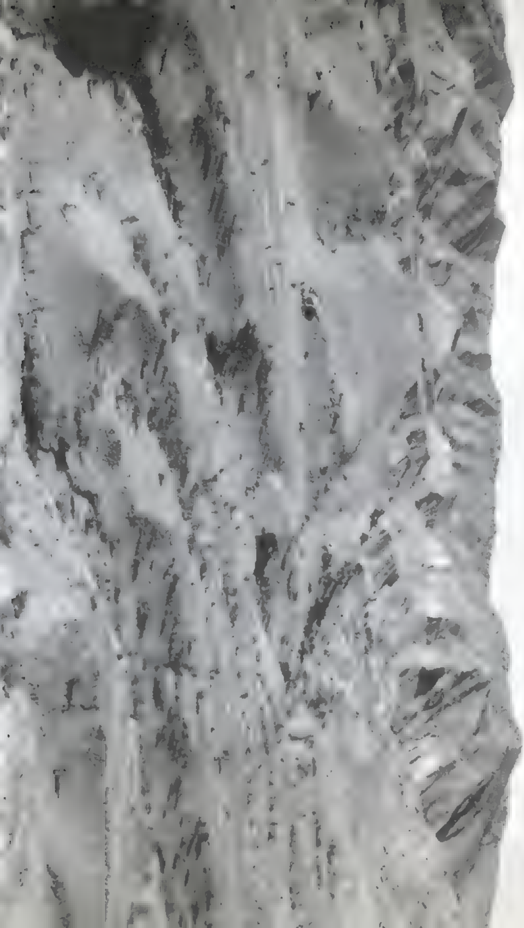
طرف چلے جاتے تھے گو کہ بعد کی تاریخ میں یہ رجحان بھی بلوچوں میں ہمیں دکھائی دیتا ہے مگر بلوچستان کے اندر رہ جانے والے بلوچ بہر حال زمین سے کم پیداوار کے باوجود بلوچستان میں رہتے رہے۔ حتیٰ کہ بعد کے آنے والے وقتوں میں ان قبائل کے اپنے اپنے مخصوص علاقے بھی بن گئے اور خانہ بدوشی اسی کے اندر چلتی رہی۔

جب موجودہ بلوچ قبائل بلوچستان میں آ کر بس رہے تھے تب بھی یہاں پر کچھ لوگ رہتے تھے جن کے پاس ایک تہذیب تھی۔ اس بات کی تصدیق خود بلوچوں کی زبانوں سے ہوتی ہے۔ براہوی زبان 'بلوچی زبان' لاسی اور سرائیکی زبان تمام ایسی زبانیں ہیں جن کا ماضی آج کے بلوچ قبائل سے زیادہ قدیم ہے۔ براہوی اور بلوچی تو ایسی زبانیں ہیں جو صرف بلوچستان میں ہی بولی جاتی ہیں باہر سے صرف مماثلت ہے۔ زبانوں کا دھرتی کے ساتھ رشتہ ایک وقت کے لوگوں کی نسبت اس لیے زیادہ گہرا ہوتا ہے کہ اسی دھرتی پر پہلے اور لوگ بھی تھے۔ اگر ہم صرف ان بلوچوں کی طرف دیکھ لیں جو بلوچستان سے سندھ اور پنجاب کی طرف منتقل ہو گئے تو ہمیں اس بات کا یقین آجائے گا کہ ان کے پاس اپنی زبان ہونے کے باوجود وہ سندھ اور پنجاب کی زبانوں میں جذب ہو گئے۔ بلوچستان میں آنے والے قبائل بھی اپنے سے پہلے لوگوں اور ان کی زبان میں جذب ہوئے۔ بلوچوں کا یہ نسلیاتی ملاپ بہت عرصہ تک جاری رہا۔ قبائل ایک دوسرے میں ملتے رہے اور نئی شناخت بناتے رہے ۔ قبیلوں کے دھڑے ٹوٹ کر دوسرے قبیلوں میں جذب ہو گئے اور نئے نام اپنا لیے حتیٰ کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی قبیلے کا رکن بن سکتا ہے اگر وہ جسمانی طور پر ان کے ساتھ مل جائے۔ لڑائی میں ساتھ دے تو اسے عورت اور زمین بھی مل جائے گی اور یوں اس

کی اولاد نسلی طور پر بھی اسی قبیلے کی کہلائے گی۔ جس طرح بلوچ قبیلے کے اندر داخل ہونے کا دروازہ تاریخی طور پر کھلا رہا اسی طرح باہر نکلنے کا در بھی کھلا تھا۔ کوئی بھی بلوچ مرد یا دھڑہ قبیلے کو چھوڑ کر جا سکتا ہے اور کسی دوسرے قبیلے یا علاقے کے ساتھ اپنا ناطہ بنا سکتا ہے ۔

قبائلی ساخت





بلوچستان کو سر زمین کے طور پر دیکھا جائے تو اس علاقے میں بسنے والوں کو بلوچ کہا جا سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ بلوچ ایک نسلیاتی، لسانی اور ثقافتی سطح پر علیحدہ شناخت کی حامل قوم بھی ہے۔

بلوچ قبائل کی شناخت کے لیے اس کی ایک علاقائی تقسیم کی جاتی ہے جو یوں ہے۔

1 رخشانی بلوچ

بلوچوں میں تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ رخشانی بلوچ ہیں یہ بلوچستان میں چاغی، نوشکی، خاران کے علاقے میں رہتے ہیں اور اُس کے علاوہ یہ افغانستان میں نمروز اور ہلمند کے علاقوں میں اور ایران کے علاقہ رخشان میں بھی رہتے ہیں۔ ان کی زبان کو بھی رخشانی بلوچی کہا جاتا ہے۔ رخشانی بلوچ عام طور دو زبانیں بولتے ہیں، ایک رخشانی اور دوسری براہوی۔

2 مکرانی بلوچ

یہ بلوچستان کے جنوب مغرب میں مکران کے بلوچ قبائل ہیں جو مکران کے دشت سے سمندر کے ساحلوں تک بسے ہوئے ہیں۔ ان کی زبان کو بھی مکرانی بلوچی کہا جاتا ہے جو بڑی اکائی میں بلوچی زبان کا ہی ایک رنگ ہے۔

3 سلیمانی بلوچ

یہ قبائل بلوچستان کے مشرق میں رہتے ہیں۔کوہ سلیمان سے کچھی کے میدانوں تک۔ان کی زبان کو سلیمانی بلوچی یا مشرقی بلوچی کہا جاتا ہے۔سلیمانی اور مکرانی بلوچی میں کچھ فرق ضرور ہے مگر یہ باآسانی ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیتے ہیں۔

4 براہوئی قبائل

ان دونوں کے درمیان کے علاقے میں رہتے ہیں یعنی جھلاوان اور ساراوان کے علاقے میں۔براہوئی ایک علیحدہ زبان بھی ہے جو بلوچستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی قدیم ترین زندہ زبانوں میں سے ہے۔

ہر بلوچ قبیلہ ایک گروہ یا برادری کی طرح ہوتا ہے۔قبیلے کو 'تمن' کہا جاتا ہے اور سردار کو تمن دار۔قبیلے کے لئے قدیم ترین لفظ بولک ہے جس کے معنی گروہ کے ہیں۔ہر تمن کے اندر کئی پاڑے ہوتے ہیں 'پاڑا' قبیلے کی بڑی شاخ ہوتی ہے۔ہر پاڑے کا اپنا نام ہوتا ہے اور پاڑا قبیلے کے اندر چھوٹا قبیلہ ہوتا ہے۔کئی پاڑوں سے مل کر ایک قبیلہ بنتا ہے ان پاڑوں کا ایک سردار پاڑا بھی ہوتا ہے جس کا سردار سارے قبیلے کا سردار ہوتا ہے۔سرداری موروثی ہوتی ہے۔

ہر پاڑے کے اندر کئی پھلیاں ہوتی ہیں۔پھلی وہ بنیادی شاخ ہے جو کئی خاندانوں سے مل کر بنتی ہے 'عام طور پر رشتہ دار خاندانوں سے 'سب سے چھوٹی شاخ کو 'پھرا' کہا جاتا ہے۔براہوی قبائل میں قبائلی ساخت یہی ہے صرف کچھ ناموں کا فرق ہے جیسے قبیلے میں بڑا دھڑا "تک" کہلاتا ہے جس کا سربراہ ٹکری ہوتا ہے۔اسی طرح اس سے چھوٹی شاخ کو 'شلوار' کہا جاتا ہے۔

بلوچ قبیلے کی بنیادی اکائی تو ایک مرد اور ایک عورت ہے جن کی اولاد خاندان

بنتی ہے اور کئی خاندان مل کر ایک پھلی یا شلوار بنتے ہیں۔اسی طرح کی کئی ٹکڑیاں جڑ کر ایک 'پاڑا' یا 'ٹک' بناتی ہیں۔ایک مرد اور ایک عورت کے خاندان سے لے کر پھلی پاڑے تک سب درجوں کا ایک سربراہ ہوتا ہے جس کے نام مختلف ہوتے ہیں مگر وہ مرد ہوتا ہے۔اسی طرح سردار پاڑے کا سردار سب کا سردار۔

بلوچ قبیلے کی ساخت مکمل طور پر نسلیاتی نہیں ہے۔ کئی علاقوں سے آنے والے قبائل یا چھوٹے گروہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر نئی شناخت بناتے رہے ہیں مگران میں بنیادی اکائی وہ قبائلی تنظیمی ساخت ہے جس میں وہ جڑ جاتے ہیں اور یہ ساخت جنگی تنظیمی ساخت ہے جس میں ہر بندے کے لیے اپنے سے اوپر والے کی اطاعت لازمی ہے۔ قبیلے کی ساخت ہی خود اس لمبے تاریخی عمل کا اظہار کرتی ہے جس میں سے وہ گزرا ہے یعنی خانہ بدوشی اور جنگ بازی۔اپنے مویشیوں کو گھوم پھر کر پالنا یا پھر حملہ آوروں سے دفاع کرنا اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دوسروں کو لوٹ لینا۔ یہی بلوچ قبائل کی قدیم معیشت بھی رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عام بلوچ کا دھرتی سے زیادہ قبیلے کے ساتھ رشتہ گہرا ہوتا ہے۔

بلوچ قبیلہ لوگوں کا ایک بڑا دائرہ ہے جس میں سرداری نظام ایک تکون کی طرح ہے، پہاڑ کی شکل والی تکون جس کے اوپر صرف ایک چوٹی ہے جو سردار ہے۔اس تکون میں سب سے نیچے اسکی پھیلی ہوئی بنیاد ہے اور یہ بنیاد عام بلوچ لوگ ہیں۔ان میں سب سے کم تر عورتیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بلوچ عورتوں کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ایک اطاعت پسند عام بلوچ مرد ذہن جنگی حالات نہ ہونے کی باوجود یہ نہیں سوچتا کہ روزمرہ کا سخت محنت والا کام اسے کرنا چاہیے یا اسے بھی کرنا چاہیے۔بلوچستان

میں دور دراز سے پانی بھر کر لانا جنگ جیسا ہی مشکل کام ہے اور پھر پانی کے بغیر تو جنگ بھی نہیں ہو سکتی۔

بلوچ قبیلے کو اگر ہم ریاست فرض کر لیں (خانہ بدوش ہی سہی) تو سرداری نظام اسی ریاست کا حکومتی نظام ہے۔ اس کے اپنے روایتی قوانین ہیں جن کو استعمال کرتے ہوئے سردار ہر قسم کے فیصلے کرتا ہے۔ اور قبیلے کا روایتی کلچر سرداری نظام کو نظریاتی اساس فراہم کرتا ہے۔ سردار بیک وقت سیاسی' انتظامی اور جنگی سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں قابل ترین شخص کو قبیلے کا سردار بنایا جاتا تھا مگر سردار کی حیثیت صرف سیاسی نہیں تھی بلکہ معاشی بھی تھی یعنی قبیلے کے پاس اگر کوئی ملکیت تھی تو سردار کے پاس سب سے زیادہ تھی۔ لہذا اس منصب کا قدرتی رجحان موروثی ہونے کی طرف تھا اور عام طور پر یہ موروثی ہی رہا ہے۔

اگر معاشی طبقات کی شکل میں ہم قبیلے کو دیکھنے کی کوشش کریں تو عام بلوچ نچلا طبقہ ہیں۔ اس طبقہ کو اگر محنت کش کہا جائے تو محنت میں زیادہ حصہ عورتوں کا ہے۔ قبیلے میں کئی درجے ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار ہیں اور پھر بڑے سردار۔ یہ سردار لوگ قبائل کے بالائی طبقے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اک عام بلوچ اور بڑے سردار کی طبقاتی حیثیت میں فرق بالکل اتنا ہی زیادہ ہے جتنا کہ پہاڑ کی چوٹی اور زمین میں ہوتا ہے۔

پرانے وقتوں سے ہی قبیلے کے مال مویشی میں سے ایک حصہ سردار کو دیا جاتا تھا۔ قبیلے کی زرخیز زمین سردار کے پاس ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی سردار ضرورت

کے وقت کئی طرح کی وصولیاں کرتا رہتا تھا۔ عام لوگ یہ محصولات اپنی اطاعت اور رضامندی سے ادا کرتے تھے مگر کبھی یہ وصولیاں زبردستی بھی کی جاتی تھیں۔ انگریزوں کے وقت کئی سرداروں نے زبردستی وصولیاں کیں اور انگریزوں نے ان کی مدد کی۔ اس کے علاوہ سرداروں کو اپنے قبیلے کے باہر سے بھی کافی کچھ مل جاتا تھا' شروع میں تو جنگ اور لوٹ مار میں سردار کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ پھر اپنے سے بڑی حکومتوں سے انعامات اور بخشش کی شکل میں نقد رقوم اور جاگیریں وغیرہ بھی مل جاتی تھیں خاص طور پر انگریزوں نے تو تمام سرداروں کو جاگیریں اور نقد رقوم مسلسل دیں تاکہ وہ اپنے سامراجی عزائم کو پورا کر سکیں۔

عمومی طور پر براہوئی اور بلوچی قبائل کی ساخت بالکل ایک جیسی ہے۔ یہ قبائل آپس میں رشتہ داری بھی کر لیتے ہیں۔ براہوی اور بلوچی نسلی طور پر کوئی خاص فرق نہیں رکھتے وہ نسلی طور پر اُس ملی جُلی صورت سے تعلق رکھتے ہیں جس میں آریائی اور ہندی خون اور شباہت کا ملاپ موجود ہے۔ سندھ اور پنجاب کی نسلیاتی ساخت بھی کم وبیش یہی ہے۔

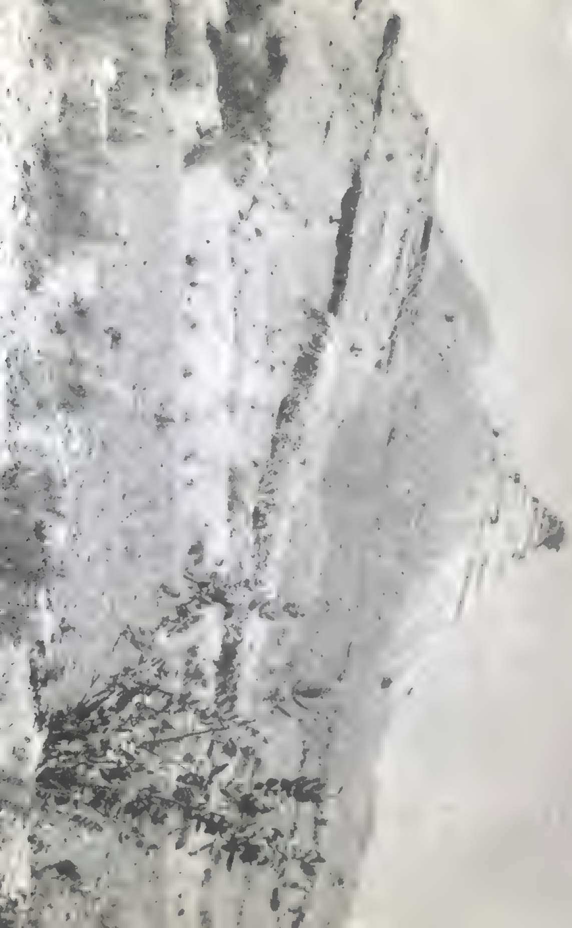
سلیمانی اور بروہی بلوچوں میں قبائلی نظام بلکہ یوں کہئے سرداری نظام ابھی بھی کافی مضبوط ہے اور عام بندے کی زندگی پر اس کا اثر اور اختیار زیادہ گہرا ہے۔ مگر مکرانی بلوچوں میں سرداری نظام اتنا زیادہ بااثر نہیں ہے بلکہ ڈھیلا ڈھالا ہو گیا ہے۔ یہاں سردار ایک کل مختار قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی شکل علاقے کے جاگیردار کی بن گئی ہے جس کی بنیادی وجہ مکرانی بلوچوں کی معیشت ہے۔ کیونکہ سمندر سے خوراک حاصل کرنا سب سے بڑا معاشی وسیلہ ہے۔ تھوڑی زراعت اور غلہ بانی بھی ہے۔ مکران

کی معیشت میں خانہ بدوشی بہت کم ہے اور سرداری نظام بھی کم ہے۔ مکرانی بلوچوں میں سمندر کی طرف سے آنے والی عرب افریقی آمیزش شکل وصورت میں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ مکرانی بلوچوں کی زبان اور ثقافت میں بھی یہ فرق نظر آتے ہیں۔

بلوچوں میں کچھ قبیلے یا چھوٹے ٹکڑے ایسے بھی ہیں جن کو نسلی طور پر کمتر خیال کیا جاتا ہے۔ ان میں زیادہ تر قدیم مقامی آبادی کے لوگ یا پھر خدمت گزار لوگ شامل ہیں۔ ان کو روایت میں غلام قبائل کہا جاسکتا ہے۔ ہر قبیلے کے اندر بھی ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو خدمت گزاری کرتے ہیں۔ جیسے بھانڈ، میراثی، ماچھی وغیرہ۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو پنجابی کمّی کہتے ہیں اور بلوچی ان کو 'لوڑی' کہتے ہیں۔ انہیں بھی نسلی طور پر کم تر خیال کیا جاتا ہے اور معاشی طور پر بھی یہ لوگ کمتر ہی ہوتے ہیں۔

بلوچستان اور بیرونی حکومتیں





بلوچستان کی ریاست اور حکومت کی تاریخ کو ایک سادہ نظر میں نہیں دیکھا جا سکتا اس کے لیے ہمیں ریاست اور حکومت کی مختلف سطحوں کو دیکھنا پڑے گا جو بلوچستان میں جاری رہیں۔ ان تمام سطحوں کی تاریخ مل کر ہی بلوچستان کی سیاسی تاریخ کا خاکہ بنا سکتی ہے۔ جیسے یہ کہ بلوچستان کا علاقہ بطور 'بفر سٹیٹ' کے کام کرتا رہا۔ خاص طور پر ایران اور دہلی کی سلطنت کے درمیان۔ بلوچستان باقاعدہ طور پر نہ تو کبھی باہر کی حکومتوں کے براہ راست اختیار میں رہا اور نہ ہی بیرونی ریاست کا مقبوضہ رہا مگر بلوچستان کے علاقائی سردار اور قلات کے خان باہر کی بڑی حکومتوں کی بڑائی کو تسلیم کرتے رہے اور اُن کی آشیر باد حاصل کرتے رہے۔ تاریخ میں بلوچستان کے مختلف علاقے دہلی، قندھار یا ایران کا حصہ ہوتے ہوئے بھی آزاد ہی رہے۔ قبیلے اپنے اپنے علاقے میں اپنی اپنی سرداری حکومتوں کی ساتھ رہتے رہے۔ کبھی لڑ بھڑ کر کوئی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیتا اور کوئی علاقہ چھوڑ جاتا۔ کبھی اتحاد کر کے قبائل کی مشترکہ حکومت بنالی جاتی۔ ریاست اور حکومت کی ان تمام سطحوں کے تال میل سے ہی بلوچستان کی گذشتہ دو ہزار سال کی تاریخ بنتی ہے۔ اور خاص طور پر گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ۔

بلوچستان جغرافیائی طور پر ایسا خطہ رہا ہے جو ان تمام حملہ آوروں اور قبائل کے لیے ایک گزر گاہ تھا جو پنجاب اور ہندوستان تک پہنچنا چاہتے تھے کیونکہ زمانہ قدیم

ہی سے وادی سندھ اور گنگا جمنا کی وادی سر سبز، زرخیز اور مال و دولت سے بھر پور علاقے تھے۔ حملہ آوروں کا مقصد انہیں لوٹنا یا پھر ان پر حکومت کرنا ہوتا تھا اور قبائل کا مقصد وہاں جا کر بس جانا اور خوشحال زندگی گزارنا ہوتا تھا۔ بلوچستان زرخیز نہیں تھا نہ ہی یہاں مال و دولت تھی یہ تو زرخیز علاقوں اور مال و دولت تک پہنچنے کا راستہ تھا اور اسی وجہ سے اسے زیر اختیار رکھنا بھی ضروری تھا۔

قدیم آرین قبائل بلوچستان سے گزر کر پنجاب اور پھر ہند تک گئے ہونگے۔ ایرانی کئی بار یہاں سے گزرے۔ ہن قبائل بلوچستان سے گزر کر اپنے اثرات چھوڑتے ہوئے وادی سندھ میں پھیل گئے۔ ساکا قبائل بھی یہیں سے گزرے۔ اسلام آنے کے بعد وسطی ایشیا' عرب' افغانستان اور ایران سے آنے والے حملہ آور بھی بلوچستان سے گزر کر گئے۔ جب ہزار سال قبل دہلی کی سلطنت مسلمان بادشاہوں نے بنائی تب سے بلوچستان وسطی ایشا، افغانستان اور ایران سے آنے والے قافلوں کے لیے متواتر چلنے والا راستہ بن گیا۔

سکندر یونانی بلوچستان سے آیا تو نہیں مگر واپسی پر اسی راہ سے گیا تھا اور جاتے جاتے بلوچستان کو بھی اپنے مفتوحہ علاقوں میں شامل کر گیا۔ اگلی دو صدیاں قریباً تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح یونانیوں کی پنجاب پر حکومت رہی اور بلوچستان بھی یونانی اختیار میں رہا۔

ایرانی حکمران بلوچستان کو مختلف وقتوں میں اپنی سلطنت کا حصہ بناتے رہے فردوسی کے شاہنامہ میں کیخسرو کے مکران فتح کرنے کا حال درج ہے۔ اس کے بعد یہ

علاقہ داریوس ہیسٹاپس کی سلطنت کا حصہ بنا۔ یونانیوں کے بعد کی صدیوں میں ایرانی اختیار کا اثر پھر بڑھنا شروع ہوا۔ 529ء کے لگ بھگ نوشیر اوان نے بلوچستان کو فتح کیا اور پھر ایک صدی تک یہ ایرانی حکومت کا حصہ رہا۔ ایرانیوں کی گرفت کمزور ہوئی تو سندھ کے حکمران رائے چچ نے بلوچستان کو فتح کر لیا اور رائے چچ کی حکومت قندھار تک پھیل گئی۔ جلد ہی عرب آگئے۔ 643ء میں مکران کو عربوں نے فتح کر لیا جسے وہ توران کے نام سے جانتے تھے۔ عربوں کی حکومت دسویں صدی تک چلتی رہی اسی دوران ابن حوقل دو دفعہ بلوچستان سے گزرا۔

محمود غزنوی نے گیارہویں صدی میں بلوچستان کو فتح کر لیا اور قریباً ایک صدی یہ غزنوی سلطنت کا حصہ رہا۔ 1219ء میں اسے دہلی کی غوری حکومت کا حصہ بنا لیا گیا۔ اسی دوران 1223ء میں چنگیز خان کے بیٹے چغتائی نے مکران پر قبضہ کر لیا اور پھر منگولوں نے جنوبی بلوچستان پر بھی قبضہ کر لیا جو اس سے پہلے دہلی کے سلطان التمش کی حکومت کے تحت تھا۔ منگولوں کے حملے بلوچستان کی یادداشت پر گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ آج بھی بلوچوں میں منگولوں کی بربریت اور جہالت کے قصے کہانیاں سنائی دیتے ہیں۔

1398ء میں تیمور کے پوتے پیر محمد نے بلوچستان کو فتح کر لیا یوں بلوچستاان قندھار کی حکومت کے ماتحت چلا گیا۔ مغلوں نے پھر اسے دہلی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ مگر آنے والے وقتوں میں بلوچستان کا مرکز کبھی دہلی رہا تو کبھی قندھار۔ اسی دوران بلوچستان پر بلوچوں کی حکومت کافی مضبوط ہوتی چلی گئی جس کا مرکز قلات

بنا۔ حتیٰ کہ انگریز جب آئے تو انہوں نے بھی قلات کی حکومت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک صدی تک بلوچستان کو اپنے بالواسطہ اور براہ راست اختیار میں رکھا۔ یہاں تک کہ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان سلطنت پاکستان کا ایک صوبہ بن گیا۔

سیاسی تاریخ، عہد وسطیٰ





بلوچستان کے اندر بلوچوں کی تاریخ کے کئی ادوار کی دریافت ابھی باقی ہے۔

ہمیں یونانی ' عربی اور ایرانی تاریخ دانوں کی تحریروں میں اس دھرتی پر اور اس کے آس پاس بلوچوں کی موجودگی کا ذکر تو ملتا ہے مگر تاریخ کا تسلسل نہیں ملتا۔ قریباً تین ہزار سال قبل یہاں بلوچوں کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے پھر ایک لمبا وقفہ ہے اور پھر بلوچوں کی لوک داستانیں ان بلوچوں کا ذکر کرتی ہیں جو عرب میں اسلام آنے کے بعد اور ایران کو فتح کر لینے کے بعد مکران اور پھر قلات کی طرف آئے۔ یہ وہی بلوچ قبائل ہیں جو کم و بیش آج بلوچستان میں موجود ہیں۔

بلوچستان میں قدیم دراوڑوں کی موجودگی حتیٰ کہ سیوا خاندان کی حکومت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جدگالوں جاٹوں اور کئی دوسری قوموں یا لوگوں کا پتہ تو چلتا ہے مگر یہ سب کچھ پھر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو جاتا ہے۔

تاریخ ایک دریافت کا عمل ہے۔ ہم جو ڈھونڈتے ہیں اسے پانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ہم اپنی ذاتی یا اجتماعی برتری کو ثابت کرنے کے لیے جھوٹی سچی گواہیاں بھگتاتے ہیں۔ پاکستان میں تاریخ نویسی کا یہی المیہ ہے کہ ہمارے تاریخ دان اپنی

دھرتی اور عوام کی تاریخ لکھنے کی جگہ مسلمانوں کی عظمت اور برتری کی تاریخ مرتب کرنے لگتے ہیں اور انجانے میں ہی اپنی دھرتی چھوڑ کر کسی اور دھرتی پر جانکلتے ہیں اور کسی اور قوم یا عوام کی تاریخ بیان کرنے لگتے ہیں کیونکہ وہ اپنی ہی دھرتی پر موجود پرانے لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں بنا پاتے۔ قبائلی اور مذہبی نفسیات رکھنے والوں کے لیے دھرتی کی تاریخ ڈھونڈنا اور بھی مشکل کام ہے کیونکہ جن کی برتری کے وہ گیت گا رہے ہوتے ہیں وہ انہیں حملہ آور ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ حقیقت ہمیں مان لینی چاہیے کہ بلوچستان کی تاریخ ہم خود ہی دریافت کر سکتے ہیں اور ہمیں کرنی بھی چاہیے۔ اس کے لیے موجودہ قبائلی نفسیات اور ذات سے بالاتر ہو کر دھرتی سے رشتہ جوڑنا پڑے گا پھر اپنی تاریخ کا تسلسل پہلے سے موجود کتابوں سے نہ بھی ملے تو بھی سب سے زیادہ اور بہتر مواد بلوچی اور براہوی زبانوں سے مل سکتا ہے۔

تاریخ کی ایک شکل انگریز مورخین نے بھی ہمیں دکھائی ہے۔ انگریزوں نے نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے برصغیر کی تاریخ حکمرانوں کے نقطہ نگاہ سے تحریر کی اس لیے ایک تو انہیں عوام کی تاریخ سے زیادہ سروکار نہیں تھا اور دوسرے وہ عوام کو انکی اجتماعی کلیت میں نہیں دیکھتے تھے بلکہ انہیں قبائل، ذات پات اور مذہبوں میں تقسیم کر کے دیکھتے تھے۔ یہ ان کی ضرورت تھی کہ وہ عوام کے اندر موجود اختلافات کو نظر میں رکھیں نہ کہ اتحاد کو۔ (یہ تو تھی بلوچستان پر موجود تاریخی مواد کے حوالے

سے ایک تنقیدی بات)

بلوچستان میں موجود بلوچ قبائل کی سیاسی تاریخ کو قلات کے مرکز پر بلوچ حکومت بننے سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ قلات پر بلوچ حکومت کی ابتداء بلوچستان پر منگولوں کے حملوں کے بعد ہوئی۔ تیرہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے منگولوں کے ہندوستان پر حملوں کا زور ٹوٹ گیا قلات پر ابھی تک منگولوں کا قبضہ تھا۔ میروانی قبیلے کا سردار میرو جو کہ براہوی بلوچوں کا بھی سردار تھا جس نے منگولوں کا ساتھ دے کر علاقے میں خود کو مضبوط کر لیا تھا اور مقامی دراوڑوں اور جدگالوں کو دھکیل کر باہر کر دیا تھا۔ جب دہلی کے کامران مغل نے قندھار میں ارغونوں کو شکست دی تب میرو تو فوت ہو چکا تھا مگر اُس کا بیٹا میر عمر اُس کا جانشین تھا۔ میر عمر نے قلات کے قندھار کی طرف سے مقرر حاکم زنون بیگ کو شکست دے کر قلات پر قبضہ کر لیا یہیں سے قلات پر بلوچی حکومت کا تسلسل شروع ہوا جلد ہی مکران سے نکل کر رند اور لاشاری قبائل نے قلات پر حملہ کر دیا۔ مکران کے رند اور لاشاری بڑے بلوچ قبائل سمجھے جاتے ہیں۔ میر چاکر رند اور میر شہک لاشاری کا قلات پر قبضہ ہو گیا مگر رند اور لاشار زیادہ دیر قلات میں نہیں رہے بلکہ قلات چھوڑ کر کچھی کی طرف چلے گئے اسی دوران میر چاکر رند اور میر شہک کے بیٹے میر گوہرام کی آپس میں لڑائیاں شروع ہو گئیں بلوچ روایت اور تاریخ کا ہیرو چاکر اعظم ان تیس سالوں پر محیط لڑائیوں میں

آخر کار شکست کھا کر پنجاب کی طرف نکل پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ لاشاری قبائل بھی سندھ کی طرف چلے گئے۔

یہ وہ وقت تھا جب بلوچستان پر بہت سی چھوٹی چھوٹی مقامی سرداروں کی حکومتیں تھیں مگر بلوچستان مکمل آزاد اور خود مختار علاقہ نہیں تھا۔ آئین اکبری میں 1590ء کا اندراج ہے کہ بلوچستان کے مغربی علاقے قندھار کی حکومت کے تحت تھے جبکہ سیوی صوبہ ملتان کی بھکھر سرکار میں شامل تھا۔ صرف مکران آزاد تھا جو ملک، بلیدی اور گچکی قبائل کی مقامی حکومتوں کے تحت رہا حتیٰ کہ اٹھارویں صدی میں نصیر خان اول نے اسے فتح کر کے قلات کی حکومت کا حصہ بنالیا۔

میر حسن جو قلات کے گذشتہ براہوئی حکمران میروانی خاندان سے تھا نے براہوئی اور جدگال قبائل کی مدد سے پھر قلات مغلوں سے واپس لے لیا۔ میر حسن کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اس کے بعد اس کے بھائی میر سنجر کو سردار منتخب کر کے قلات کی مسند پر بٹھایا گیا۔ میروانی سرداروں کی قلات پر تقریباً ایک صدی تک حکومت چلتی رہی۔

1666ء میں میر احمد جو احمد زئی خاندان کا بانی مانا جاتا ہے قلات کا خان بنا۔ اس کے بعد میروانی خاندان کے حکمران احمد زئی کہلانے لگے۔ پھر قلات پر احمد زئی خاندان کی حکومت مسلسل چلتی رہی۔

1695ء میں میر احمد خان کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا اور ولی عہد میر محراب خان قلات کی مسند پر بیٹھا مگر جلد ہی فوت ہو گیا اور اس کا چچا زاد بھائی میر سمندر خان **1697**ء میں خان قلات مقرر کیا گیا۔

1714ء میں میر محراب خان کا بڑا بیٹا میر احمد خان قلات کا خان بنا مگر دو سال بعد ہی اس کے چھوٹے بھائی میر عبداللہ خان نے اسے قید کر دیا اور قلات کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ میر عبداللہ خان نے قلات کی ریاست کو اپنی لگاتار فتوحات سے کافی وسعت دی۔ میر گل خان نصیر اپنی کتاب 'تاریخ بلوچستان' میں کہتے ہیں "میر عبداللہ خان ایک فاتح شخص تھا۔ محمود غزنوی کی طرح علاقوں پر علاقے فتح کرتا، لوٹتا اور اپنی جیبیں بھر کر واپس قلات چلا آتا۔" "ان تمام سپاہیانہ صفات کے علاوہ میر عبداللہ خان بلوچی زبان کا ایک عمدہ شاعر بھی تھا۔"

میر عبداللہ خان نے کچھی سے کلہوڑوں کو سندھ کی طرف دھکیل دیا میر عبداللہ خان کے اکثر حملے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان علاقوں کو لوٹنے کے لیے ہوتے تھے۔ لوٹ مار میں کامیابی نے اس کی فوج کے حجم کو کافی بڑا کر دیا تھا اور وہ اپنی بڑی اور مضبوط فوج کو پالنے کے لیئے مسلسل لوٹ مار کرتا رہا۔ اس نے کچھی کی طرح مکران، کیچ، بندر عباس، گوادر حتیٰ کہ ڈیرہ غازی خان کو بھی جی بھر کر لوٹا اور وہاں قتل و غارت کی گئی۔ میر عبداللہ خان کچھی میں کلہوڑوں کے ساتھ دوسری بار لڑتا ہوا

مارا گیا اور **1731**ء میں اس کا بڑا بیٹا میر محبت خان قلات کی خانی کی مسند پر بیٹھا۔ اس دوران بلوچستان پر باہر کی بڑی حکومتیں تبدیل ہوتی رہیں۔ مغلوں کے بعد **1638**ء میں بلوچستان ایرانی سلطنت کے تحت آ گیا۔ اسی صدی کے درمیان سے لے کر **1708**ء تک یہ صفوید حکمرانی کے تحت رہا حتیٰ کہ غلزئی آگئے تو اٹھارویں صدی کے پہلے حصے میں نادر شاہ نے بلوچستان پر کئی حملے کئے یا وہ حملے کرتا ہوا پنجاب و ہند کی طرف گیا۔ پھر احمد شاہ ابدالی نے حملوں کا آغاز کیا۔

میر محبت خان کو اس کے بھائی میر الہتاز خان نے معزول کر کے خود حکومت سنبھال لی مگر کچھ عرصے کے بعد نادر شاہ کے حکم سے میر محبت خان پھر اپنی مسند پر بحال ہوا۔

میر نصیر خان اول جسے بلوچ تاریخ کا ہیرو مانا جاتا ہے میر عبداللہ خان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ میر نصیر کو اس کے بڑے بھائی اور خان قلات میر محبت نے نادر شاہ کی یرغمال میں دے رکھا تھا۔ وہ دس سال نادر شاہ کی یرغمال میں رہا اور نادر شاہ کی وفات کے بعد پھر واپس آ کر اُس نے مختلف قبائل سے فوجی مدد حاصل کی اور قلات کی خانی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ احمد شاہ لبدالی جو نادر شاہ کا جرنیل اور میر نصیر خان کا دوست تھا اب افغانستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے میر محبت کو گرفتار کر لیا اور میر نصیر خان کو قلات کا خان مقرر کیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد احمد شاہ لبدالی کے

ساتھ اُس کی ناچاقی ہو گئی جس پر ابدالی نے قلات پر حملہ کیا مگر پھر صلح کرلی جس کے نتیجے میں میر نصیر خان نے احمد شاہ درانی کا ہندوستان اور ایران کی مہموں میں ساتھ دیا۔

میر نصیر خان اول جسے بروہی عظیم مانتے ہیں نے پینتالیس سال حکومت کی ۔ اس نے قلات کی ریاست کی حدیں مکران سے سندھ تک پھیلا دیں۔ اس نے انتہائی محنت سے جنگوں سے پامال علاقوں کے نظم و نسق کو بحال کیا۔ اور اپنے بھائی میر محبت خان کی طرح تمام قبائل کو ان کے علاقے اور زمینیں تقسیم کیں۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ قبائل کے ملکیتی علاقے وہی ہیں جو میر نصیر خان نے طے کیے تھے۔ میر نصیر خان نے تمام بلوچ قبائل کو قلات کی میری میں اکٹھا کیا اور تمام قبائل سے ایک مشترکہ فوج تیار کی گئی جو جنگ کے دنوں میں میر نصیر خان کے طلب کرنے پر حاضر ہو جاتی تھی۔ میر نصیر خان کا دور آپس میں لڑتے ہوئے بلوچ قبائل کے درمیان بھائی چارے، صلح امن اور مل کر ایک بڑی طاقت بننے کا دور ہے۔

1794ء میں میر نصیر خان فوت ہوا تو اس کے بیٹے میر محمود خان کو جو صرف سات سال کا تھا خان قلات مقرر کیا گیا۔ میر محمود خان نے قلات پر 24 سال حکومت کی۔ اس کا دور اندرونی سازشوں درباری تفرقہ بازی کا دور تھا۔ جب انگریز آہستہ آہستہ بلوچستان کی طرف بڑھ رہا تھا تو بلوچستان پر ایک عیاش حکمران موجود تھا جس کے دربار میں ہر وقت سازش کی کھچڑی پکتی رہتی تھی۔ جب 1810ء میں سیاح

پونٹنگر قلات آیا تو اس نے دیکھا کہ مختلف سرداروں نے اپنی اپنی حکومتیں بنا رکھی تھیں اور وہ قلات کی حکومت کی کچھ خاص پرواہ نہیں کرتے تھے۔

سیاسی تاریخ، انگریزی دور





میر محمود خان کی وفات کے بعد میر محراب خان قلات کا خان مقرر ہوا۔ میر محراب خان کا دور درباری سازشوں اور سرداروں کی بغاوتوں اور لڑائیوں کا دور ثابت ہوا۔ اسی دور میں افغانستان میں بغاوت کے نتیجے میں شاہ شجاع الملک افغانستان سے نکل کر پہلے قلات میں آیا پھر انگریزوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے سندھ میں ان کے پاس چلا گیا۔ انگریز شاہ شجاع الملک کی مدد کر کے افغانستان میں اپنا اثر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ افغانستان تک پہنچنے کے لیے میر محراب خان کے ساتھ معاہدہ کرنا ضروری تھا میر محراب خان سید محمد شریف اور ملا محمد حسن جو کہ اس کے اپنے درباری تھے کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا جبکہ یہ لوگ چالبازی کر رہے تھے۔

میر محراب خان کا چچازاد بھائی میر احمد یار خان قلات کی خانی حاصل کرنے کے لیے مسلسل بغاوتیں کرتا رہا تھا اب اس کا بیٹا میر شاہنواز خان قلات کا سردار بننے کے لیے انگریزوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

الگزینڈر برنز میر محراب خان سے افغانستان جانے کے لیے درہ بولان سے گزرنے کا معاہدہ کرنے کے لیے مشن لے کر قلات گیا مگر واپسی پر اسے ڈاکوؤں کا سامنا کرنا پڑا جنہوں نے ان کا مال اسباب لوٹ لیا۔ گو کہ خان قلات سے انگریزوں کا معاہدہ طے پا گیا تھا مگر پھر بھی میر محراب کو انگریزوں کا مخالف سمجھ کر قلات پر حملہ کیا گیا۔ شال کوٹ جسے بعد ازاں کوئٹہ کا نام دیا گیا کو انگریزوں نے پٹے پر حاصل کر کے سر تھامس ولشائر کو فوجی دستے کے

ساتھ وہاں رکھا ہوا تھا۔ اسی فوجی دستے نے 1839ء میں قلات پر حملہ کر کے میر محراب خان کو قتل کر دیا اور انگریزوں کے کیمپ میں موجود میر شاہنواز خان کو قلات کا خان مقرر کیا اور اس کے ساتھ لیفٹننٹ لوڈے کو پولیٹیکل آفیسر مقرر کر دیا گیا۔ (میر محراب خان نے قلات پر بائیس سال حکومت کی)

شاہنواز خان کو قلات کی گدی دلوانے کے عوض انگریزوں نے قلات کی ریاست سے کچھی اور مستونگ کے علاقے حاصل کر کے شاہ شجاع الملک کی برائے نام حکومت کے سپرد کر دیئے اس دوران مری قبائل نے انگریزوں کے خلاف خود کو منظم کیا۔ کپتان براؤن کو مریوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجا گیا مگر انگریز فوج کا یہ دستہ مریوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور کپتان براؤن سمیت قریباً سب انگریزی فوجی مارے گئے۔

میر شاہ نواز زیادہ دیر قلات کی حکومت نہ کر سکا۔ میر محراب خان کے بیٹے میر نصیر خان نے بغاوت کی اور قلات پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ شاہ نواز بھاگ گیا اور 1841ء میں میر محمد حسن جو کہ میر نصیر خان دوم کے نام سے مشہور ہوا قلات کا خان مقرر ہوا۔ اسی دوران مری قبائل کی بغاوتیں جاری رہیں اور انہوں نے انگریز فوجی دستوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ میر نصیر خان دوم نے شروع میں انگریزوں کی مزاحمت کی مگر بعد ازاں اس کی مزاحمت ختم ہوتی چلی گئی۔ کرنل سٹیسی کی کوششوں سے میر نصیر خان کو راغب کیا گیا کہ وہ انگریزں کے ساتھ عہد نامہ کرے۔ 1841ء میں یہ عہد نامہ ہوا جس کے تحت انگریزوں نے افغانستان تک پہنچنے کا راستہ حاصل کیا۔

1857ء میں نصیر خان فوت ہو گیا خیال یہ کیا جاتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا۔ قلات کی مسند پر میر خداداد خان کو بٹھایا گیا جو ابھی لڑکا سا ہی تھا۔

میر شیر دل خان میر اعظم خان کا بیٹا اور میر خداداد خان کا چچازاد بھائی تھا۔ اس نے سراوان کے سرداروں کی حمایت حاصل کر کے بغاوت کر دی۔ گنداوا میں میر خداداد پر

حملہ کیا گیا جس میں وہ زخمی ہو گیا۔ میر شیر دل نے 1862ء سے 1864ء تک یعنی قریباً 2 سال قلات کی حکمرانی کی اس دوران اس کا انگریزوں کے ساتھ کوئی خاص گٹھ جوڑ نہ بن سکا بلکہ وہ انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہا۔ 1864ء میں میر شیر دل کو قتل کر دیا گیا اور میر خداداد خان پھر قلات کا خان بن گیا جس میں اسے سرداروں کی مدد و تعاون حاصل تھا۔ چونکہ کے شیر دل خان مقامی سرداروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا اور انہیں برا بھلا کہتا رہتا تھا اس لیے سردار بھی اُس کے خلاف ہو گئے تھے۔ میر خداداد خان کا دور سرداروں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے کا دور تھا خاص طور پر لسبیلہ کے جام خان قلات کے خلاف لڑتے رہے۔ اسی دوران مری قبائل کی انگریزوں کے خلاف جنگی کاروائیوں نے انہیں پریشان کیا ہوا تھا۔ میر خداداد خان نے مری قبائل کے خلاف انگریزوں کی کوئی خاص مدد نہ کی سرداروں کی بغاوتیں بھی مسلسل چل رہی تھیں۔ حتیٰ کے 1873ء میں کمشنر سندھ کی جانب سے فریقین میں معاملہ طے کرنے کی کوشش کی گئی جسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ جس پر انگریز سرکار نے اپنا نمائندہ میجر ہیریسن قلات سے واپس بلا لیا اور خان کو جو پچاس ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا بند کر دیا۔ یہی موقعہ تھا جب میجر رابرٹ سنڈیمن (جو بعد ازاں سر رابرٹ سنڈیمن کہلایا) بلوچستان کے سیاسی منظر پر ظہور پذیر ہوا۔ اس کا 1875ء میں قلات کا پہلا مشن پوری طرح کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس مشن کی واپسی کے فوری بعد مینگل سردار نورالدین کو خان قلات کے کہنے پر قتل کر دیا گیا جس پر الزام یہ لگایا گیا کہ اس سے خان کو جان کا خطرہ تھا۔ چند ماہ بعد میجر سنڈیمن پھر قلات پہنچ گیا۔ اس نے انتہائی بہتر طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے 13 جولائی 1875ء کو معاہدہ مستونگ کروادیا اور اسے کھلے عام دربار میں پڑھ کر بھی سنایا گیا۔ اب برطانوی حکومت نے خود کو اقتدار اعلیٰ قبول کرتے ہوئے ایسے اقدامات کرنے شروع کیے جو مستقبل میں ان کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔

1896ء کے دسمبر میں وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے جیکب آباد کا دورہ کیا تو سنڈیمن سرداروں اور خان قلات کو اکٹھا کر کے جیکب آباد لا چکا تھا۔ یہاں خان قلات اور لارڈ لٹن کے درمیان ایک اور معاہدہ طے ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ خان انگریز کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھے گا۔ برطانیہ کو اقتدار اعلیٰ مانے گا اور اجازت کے بغیر باہر کسی سے خط وکتابت یا روابط نہیں بنائے گا۔ اور یہ کہ برطانیہ اس کے بدلے قلات کی خود مختاری کو تسلیم کرتا ہے۔اس معاہدے کے بعد خان کو تین لاکھ روپے بخشیش کی گئی اور سنڈیمن کو ایجنٹ ٹو گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ سنڈیمن کی زندگی میں کوئی خاص بغاوت نہیں ہوئی سوائے خان قلات کی دماغی شورش کے جس کے تحت خان نے مستوفی فقیر محمد اور اس کے بیٹے کو انگریزوں سے سازباز کرنے کے شک میں قتل کروا دیا۔ جس پر مارچ 1893ء میں خان کو معزول کر دیا گیا اور لورالائی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ولی عہد شہزادہ میر محمود خان کو قلات کا خان مقرر کر دیا گیا۔ میر محمود خان کا عہد بھی سرداروں کی سرکشی اور علاقائی بغاوتوں کا دور ہی رہا۔ 1897ء میں سراوان کے سرداروں میں سے دو سرداروں کو گرفتار کرنے سے بے چینی کی لہر پیدا ہوئی۔ اسی سال مکران میں بغاوت پھوٹ پڑی برطانوی فوجی دستوں نے گوکھ پرش کے مقام پر باغیوں کا مقابلہ کر کے ان کے لیڈر اور کئی دوسرے افراد کو ختم کر دیا۔ ایک اور بغاوت مکران میں 1901ء میں ہوئی جسے انگریزوں نے نودیر کے قلعہ پر قبضہ کر کے ختم کر دیا۔

میر محمود خان ایک عیاش طبع حکمران تھا جس کی زیادہ توجہ امور مملکت کی طرف نہیں رہتی تھی۔ لہذا انگریزی سرکار نے قلات کے دربار میں ایک سیاسی مشیر مقرر کیا جو انگریز سرکار کا ملازم تھا مگر خان قلات کی جگہ امور مملکت چلاتا تھا۔

1931ء میں میر محمود خان کے بھائی میر محمد اعظم جان کو خان قلات مقرر کیا گیا۔ 1933ء میں میر محمد اعظم جان فوت ہو گیا اور پھر ان کے بیٹے میر احمد یار خان کو والئی قلات مقرر کیا گیا۔ میر احمد یار خان برطانوی دور کے اختتام یعنی 1947ء کے وقت بھی والئی قلات تھا۔

انگریز دور، سیاسی معاهدات





انگریز سندھ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ایک طرف پنجاب میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف ان کی نظر بلوچستان پر تھی۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت زار کے روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ بھی تھی اور ایران وافغانستان تک رسائی بھی چاہتی تھی۔ وہ خاص طور پر افغانستان کو برطانوی ہندوستان اور روس کے درمیان بفر سٹیٹ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں بلوچستان کی جغرافیائی حالت انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ ہمیشہ سے حملہ آور مغرب اور شمال کی طرف سے آتے تھے اور ہندوستان تک جاتے تھے تب بھی بلوچستان جغرافیائی طور پر ان حملہ آوروں کے لیے انتہائی اہم رہا تھا۔ اب پہلی بار انگریزی سامراج مشرق کی طرف سے بلوچستان کی طرف آیا۔ یہاں سے وہ شمال میں افغانستان اور مغرب میں ایران تک پہنچنا چاہتا تھا سو اسے محفوظ گزرگاہ کی شدید ضرورت تھی۔ بلوچستان کو وہ اپنا راستہ بنانا چاہتا تھا اور اسی لیے انگریز نے بلوچستان سے گزرنے اور اپنے راستے کو محفوظ بنانے کے لیے کوششیں بہت پہلے سے شروع کر دی تھیں۔ کچھ معاملات طے بھی ہوئے معاہدے بھی کیے گئے مگر ان پر عمل درآمد کچھ خاص نہ ہو سکا۔ 1836ء میں میر مہراب خان والئی قلات سے انہوں نے درہ بولان سے گزرنے کا معاہدہ طے کیا مگر میر مہراب خان نے انگریزوں کی طرف کچھ خاص توجہ نہیں دی تھی۔ پہلی افغان جنگ کے وقت انگریزوں کو درہ بولان میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انگریزوں نے

قلات پر حملہ کر کے میر مہراب خان کو ختم کر دیا اور چودہ سالہ میر شاہنواز خان کو خان قلات مقرر کر دیا اور اس کے عوض اس سے کوئٹہ مستونگ اور کچھی کا علاقہ پٹہ پر حاصل کر لیا۔ جب شاہ شجاع افغانستان سے ملک بدر ہو کر انگریزوں کے پاس سندھ شکار پور آ گیا تو اس کی ایک برائے نام حکومت بنا کر کوئٹہ مستونگ اور کچھی کے علاقے شاہ شجاع کے حوالے کر دیئے گئے مگر ان علاقوں کا انتظام انگریز کے پولیٹیکل ایجنٹ ہی سرانجام دیتے رہے اور ایک جاسوسی کا نظام بھی قائم کیا۔ یہ علاقے 1842ء تک ان کے قبضے میں رہے۔ کچھی کے قبائل میں مسلسل گڑبڑ ہوتی رہی۔ 1840ء میں کاہان اور مری کی پہاڑیوں میں بھی گڑبڑ ہوئی۔ کیپٹن براؤن شورش ختم کرنے کے لیے آیا تو مری قبائل نے اسے پانچ ماہ تک محصور کیے رکھا۔ مریوں نے میجر کلی بون کی زیر قیادت فوج کو بھی شکست دی۔ اسی دوران کوئٹہ گریژن پر سرکش قبائل نے حملہ کر دیا اور نصیر خان دوم کو قلات کے تخت پر بٹھا دیا۔

1841ء میں انگریزوں نے خان قلات کے ساتھ معاہدہ کیا جس کے مطابق انہیں بلوچستان میں فوج رکھنے کی اجازت مل گئی۔ اور میر نصیر خان دوم والئی قلات کو پچاس ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ مل گیا۔ اسی سال میر نصیر خان نے مری سردار کو لہڑی بلا کر کرنل سٹیسی سے ملایا اور انگریزوں کے خلاف ہاتھ روک لینے پر آمادہ کر لیا جس کے عوض مری سردار کو گنداوا کا ایک گاؤں جاگیر میں ملا۔ 1845ء میں جنرل سر چارلس نیپئر نے سات ہزار کی فوج کے ساتھ بگٹی قبائل پر چڑھائی کر دی اس مہم کو مشکل سے ہی کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ بگٹی قبائل کے خلاف پھر 1847ء میں بھی کاروائی کی گئی۔ بگٹی سردار اسلام خان نے انگریز کی اطاعت قبول

کر لی اور اسے لاڑکانہ میں جاگیر دی گئی۔ کیپٹن جان جیکب جو بعد ازاں جنرل بنا کو 1847ء میں ہی مغربی سندھ اور بلوچستان کا چارج دیا گیا جو اس کی موت یعنی 1858ء تک اس کے پاس رہا۔ جان جیکب کا زیادہ تعلق سندھ کے معاملات سے رہا مگر اس کا قلات میں اثر کافی اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے 1854ء میں قلات کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔

انگریزوں کے لیے ہندیورپ ٹیلیگراف لائن بہت اہمیت رکھتی تھی سو اس کی حفاظت کے لیے پہلا معاہدہ 1862ء میں قلات کے ماتحت جام لسبیلہ میر خان کے ساتھ ہوا۔ جام لسبیلہ کو لائن کی حفاظت کرنے پر -/8400 روپے سالانہ دینے کا معاہدہ طے ہوا۔ اسی سال کیچ میں خان قلات کے نائب میر فقیر محمد سے گوادر سے کلمیر تک ٹیلیگراف لائن کی حفاظت کا معاہدہ ہوا۔ 1869ء میں خان آف قلات کی طرف سے مکران کے گورنر گاجیان کچکی کے ساتھ اسی طرح کا معاہدہ ہوا۔ انگریزوں نے خان قلات کے ساتھ ایک معاہدے کے ذریعے یہ اجازت حاصل کر رکھی تھی کہ وہ اس کے علاقے میں جہاں چاہیں ٹیلیگراف لائن لے جاسکتے ہیں۔

جیسا کہ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ بلوچستان صوبہ کا بانی سر رابرٹ سنڈیمن تھا جو حقیقت میں برطانوی راج کو بلوچستان میں بہت موثر طریقے سے نافذ کرنے کے لیے انتہائی اہم شخص ثابت ہوا۔ اس نے بلوچستان میں زوال پذیر سرداری نظام کو پھر سے طاقتور صرف اس لیے بنایا کہ ان سرداروں کو لڑائی کر کے زیر کرنے کی جگہ انہیں مراعات جاگیریں اور نقد رقوم دے کر برطانوی سامراج کے زیر نگیں کر لیا جائے۔ ان معاملات میں سنڈیمن کامیاب بھی رہا۔

کر لی اور اسے لاڑکانہ میں جاگیر دی گئی۔ کیپٹن جان جیکب جو بعد ازاں جنرل بنا کو 1847ء میں ہی مغربی سندھ اور بلوچستان کا چارج دیا گیا جو اس کی موت یعنی 1858ء تک اس کے پاس رہا۔ جان جیکب کا زیادہ تعلق سندھ کے معاملات سے رہا مگر اس کا قلات میں اثر کافی اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے 1854ء میں قلات کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔

انگریزوں کے لیے ہندیورپ ٹیلیگراف لائن بہت اہمیت رکھتی تھی سو اس کی حفاظت کے لیے پہلا معاہدہ 1862ء میں قلات کے ماتحت جام لسبیلہ میر خان کے ساتھ ہوا۔ جام لسبیلہ کو لائن کی حفاظت کرنے پر -/8400 روپے سالانہ دینے کا معاہدہ طے ہوا۔ اسی سال کیچ میں خان قلات کے نائب میر فقیر محمد سے گوادر سے کلمیر تک ٹیلیگراف لائن کی حفاظت کا معاہدہ ہوا۔ 1869ء میں خان آف قلات کی طرف سے مکران کے گورنر گاجیان گچکی کے ساتھ اسی طرح کا معاہدہ ہوا۔ انگریزوں نے خان قلات کے ساتھ ایک معاہدے کے ذریعے یہ اجازت حاصل کر رکھی تھی کہ وہ اس کے علاقے میں جہاں چاہیں ٹیلیگراف لائن لے جاسکتے ہیں۔

جیسا کہ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ بلوچستان صوبہ کا بانی سر رابرٹ سنڈیمن تھا جو حقیقت میں برطانوی راج کو بلوچستان میں بہت موثر طریقے سے نافذ کرنے کے لیے انتہائی اہم شخص ثابت ہوا۔ اس نے بلوچستان میں زوال پذیر سرداری نظام کو پھر سے طاقتور صرف اس لیے بنایا کہ ان سرداروں کو لڑائی کر کے زیر کرنے کی جگہ انہیں مراعات جاگیریں اور نقد رقوم دے کر برطانوی سامراج کے زیر نگیں کر لیا جائے۔ ان معاملات میں سنڈیمن کامیاب بھی رہا۔

انگریز تاریخ دانوں نے سنڈیمن کی حکمت عملی کو "انسانیت پرور اور مہذب" لکھا ہے۔ اس نے سرحدوں کو بند رکھنے کی جگہ سرحدوں کو کھول دینے کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے محسوس کیا کہ بلوچ بروہی سرداروں اور ان کی حیثیت اور اثر کو برطانوی راج کے فائدے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مختصر طور پر سنڈیمن کی پالیسی یہ تھی کہ سرداروں کے مفادات کے مطابق ہی بلوچستان میں عمل دخل بڑھایا جائے۔ سرداروں کو انگریز سرکار کی ضرورت کے کام کرنے کے عوض نقد قیمت ادا کی جائے۔ انہیں فائدہ مند نوکریاں دی جائیں اور انہیں سندھ اور پنجاب میں جاگیریں عطا کی جائیں اور ان سے محصول بہت ہی کم لیا جائے۔ سنڈیمن کی اس پالیسی نے بلوچ بروہی سرداروں کو انگریزوں کا دست بستہ غلام بنادیا تو دوسری طرف یہی سردار اپنے ہی عوام پر زیادہ طاقتور اور ظالم حکمران کی حیثیت سے گرجنے برسنے لگے۔

کیپٹن سنڈیمن 1867ء میں ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے سب سے پہلے بگٹی اور مری قبائل کے ساتھ رابطہ پیدا کیا۔ اس نے خان قلات کے ساتھ کامیابی سے معاملات چلائے جس کے نتیجے کے طور پر مٹھن کوٹ کانفرنس 1871ء منعقد کی گئی جس میں برطانوی سرکار کے پنجاب اور سندھ سے نمائندے بھی شریک تھے۔ اس کانفرنس نے سنڈیمن کو بالائی سندھ کے سیاسی سپرنٹنڈنٹ کے ماتحت بگٹی اور مری قبائل میں معاملات طے کرنے کا اختیار دیا۔ اسے ان قبائل کو گھڑسوار کی نوکریاں دینے کا اختیار بھی دیا گیا۔ اسی دوران قلات کے حالات خراب ہوتے چلے گئے تب تک 1875ء اور 1876ء کے مشن یہ رپورٹ دے چکے تھے کہ قلات کو انگریزی عمل دخل میں لے لیا جائے چنانچہ بلوچستان براہ راست گورنر جنرل کے ماتحت

آ گیااور 1877ء میں قلات پولیٹیکل ایجنسی کا قیام عمل میں آیا۔

1878ء میں دوسری افغان جنگ شروع ہوئی تو قندھار کی سرحد کے ساتھ مواصلات کی حفاظت کے لیے فوج بھیجی گئی۔ جنگ کے پہلے دور کے خاتمے پر سنڈیمن خود جنرل بوڈلف کی فوج کے ہمراہ گئے تاکہ ڈیرہ غازی خان اور پشین کے درمیان مواصلات جاری رکھنے کے لیے راستہ کھلا رکھیں۔ 1879ء میں معاہدہ گندومک ہوا جس میں افغان بادشاہ یعقوب خان نے پشین، سبی، ہرنائی اور تھل چھوٹیالی برطانوی حکومت کے حوالے کر دیئے مگر یہ معاہدہ اس وقت منسوخ کر دیا گیا جب کابل میں برطانوی ریذیڈنٹ اور اس کے دستے کو قتل کر دیا گیا اور یعقوب خان کو ہٹا دیا گیا۔ اسی سال یعنی 1879ء میں ہی سکھر سے سبی تک ریلوے لائن مکمل ہو گئی اور انگریز حکومت نے اس ریلوے لائن کو کوئٹہ تک لے جانے کی منظوری دی۔ مری قبیلے سمیت ان تمام قبائل سے معاملات طے کیے گئے جن کے علاقوں سے یہ ریلوے لائن گزرتی تھی۔

1880ء میں افغان جنگ کا دوسرا دور شروع ہوا تو برطانویوں کو میوند میں شکست ہوئی۔ نئے سرے سے پھر فوجی مہمات شروع کی گئیں تو کچھ افغان قبائل جو ایجنسی کی حدود میں رہتے تھے نے سرکشی شروع کر دی۔ مریوں میں بھی بغاوت کے معاملات پھٹ پڑے تو ایک مہم کے ذریعے اسے ختم کیا گیا۔ افغان جنگ کے خاتمے پر علاقائی تقسیم جو معاہدہ گندومک میں تھی کا فیصلہ بھی سنڈیمن نے ہی طے کروایا۔

1882ء کے بعد کے دس سال میں نظم و نسق کو بہتر بنایا گیا زمین سے محصول کی وصولی کو باقاعدہ بنایا گیا۔ زرعی آب پاشی کی سکیمیں وجود میں آئیں کچھ

ڈسپنسریاں شروع کی گئیں۔ جنگلات کو بڑھایا گیا اور مواصلات کو ترقی دی گئی۔ اس دوران مکران میں دو مہمات روانہ کی گئیں۔ پہلی مہم 84-1883ء میں بھیجی گئی جس میں نوشیروانیوں اور خان قلات کے درمیان تنازعات کو ختم کرایا گیا۔ دوسری مہم 91-1890ء میں ہوئی جس میں مکران میں بہتر انتظامی مشینری کا معاملہ اٹھایا گیا۔ شمال مشرق میں ژوب کے کاکڑوں کے خلاف ایک مہم روانہ کی گئی جس کے نتیجے میں وہ تابع ہو گئے۔ 1886ء میں بوہری پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور لورالائی کی چھاؤنی بنائی گئی۔

1887ء میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کا عہدہ ریزیڈنٹ درجہ دوم سے درجہ اول کر دیا گیا۔ معاہدے میں لکھے اضلاع کو برطانوی حدود قرار دے دیا گیا اور ایجنٹ گورنر جنرل نے ان اضلاع کے لیے چیف کمشنر مقرر کیا۔ 1889ء میں ایک مہم ژوب کے راستے درہ گومل بھیجی گئی اور ضلع پر قبضہ کر لیا گیا۔ 1890ء میں سر جارج وائٹ کی سرکردگی میں ایک مہم ژوب کے دو سرداروں کے خلاف بھیجی گئی جو وادی میں لوٹ مار کرتے رہے تھے۔ درہ گومل کے دونوں اطراف فوج کو تعینات کیا گیا اور شیروانیوں اور تخت سلیمان کے دیگر قبائل کو برطانوی نظام کے تابع کر لیا گیا۔

سنڈیمن 1892ء میں اس وقت مختصر علالت کے بعد مر گیا جب اس نے لسبیلہ میں کیمپ لگا رکھا تھا۔ سنڈیمن نے بلوچستان میں جو سیاسی نظام نافذ کیا اس کے اثرات کو مختصر طور پر یوں دیکھا جا سکتا ہے۔

سنڈیمن نے خان قلات اور سرداروں کی حیثیت کو تاج برطانیہ کے تنخواہ خور ایجنٹ میں بدل دیا۔ اس نے خان قلات کے کردار میں ایک بنیادی تضاد متعارف

کرایا۔ ایک طرف خان قلات بلوچ کنفیڈریسی کی صدارت کرتا تھا، سرداروں کے علاقے مقرر کرنے کے حکم دیتا تھا اور کچھی اور سراوان کے سرداروں کی تنخواہیں دیتا تھا۔ مگر حقیقت میں سرداروں کے معاملات طے کرنے کے اختیارات انگریزوں کے پاس تھے اور انہیں پولیٹکل ایجنٹ استعمال کرتا تھا اور وہی خان اور سردار کے درمیان جھگڑوں کے فیصلے بھی کرواتا تھا۔

سنڈیمن کی انتظامیہ نے جرگہ کے کردار کو بھی یکسر بدل دیا۔ پہلے جرگہ شراکتی انصاف مہیا کرنے کا ادارہ تھا اس کی جگہ شاہی جرگہ بنایا گیا جس میں صرف سردار اور قبائلی اشراف ہی بیٹھ سکتے تھے۔ اس سے ایک طرف تو انگریزوں کے خلاف بغاوتوں کو کنٹرول کیا گیا اور دوسری طرف سرداروں کو عوام کے اوپر بے پناہ اختیارات حاصل ہو گئے۔ نیا شاہی جرگہ نہ صرف جائیداد پر بلکہ محنت پر بھی ٹیکس لاگو کر سکتا تھا اور عورتوں کو ضبط بھی کر سکتا تھا۔ اس جرگہ کے فیصلے کے خلاف نظر ثانی صرف پولیٹیکل ایجنٹ ہی کر سکتا تھا۔

سنڈیمن کے نظام کے تحت سرداروں کو انتظامی ڈھانچہ بنانے کے اختیارات ملے اور یہ اختیارات بھی ملے کہ سردار اپنے قبیلے کے افراد کو فوج اور لیوی میں بھرتی کرے۔ ان کے تمام اخراجات سردار کو ادا کیئے جاتے تھے۔ سردار کو اختیار تھا کہ وہ جس قدر چاہے تنخواہ ادا کرے۔ سرداروں نے اپنے عزیزوں کو بڑے عہدوں پر بھرتی کر لیا جبکہ عام بلوچی کو معمولی عہدوں اور تھوڑی تنخواہ کے ملازم رکھا۔ برطانوی حکومت کی عطا کردہ رقوم کو سردار زیادہ تر اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا۔ سرداروں کو اختیار مل گیا کہ وہ اپنے علاقے میں جتنا چاہیں زمین پر محصول لگا سکتے تھے۔

قبائل کی طرف سے سردار کو رضاکارانہ طور پر ادا کئے جانے والے نذرانے، عطیات اور امداد اس وقت سردار کا سرکاری حق بن گئے جب انگریزی حکومت نے اسے سرداری ٹیکس کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ سردار کے لیے یہ ٹیکس لیویز والے اکٹھا کرتے تھے اس طرح انگریز کی یہ لیوی فورس سردار کی ذاتی فورس کا کام بھی کرنے لگی۔

سنڈیمن کے بعد اس کا جانشین سر جیمز براؤن 1896ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد نوشکی کو انگریزوں نے پٹہ پر حاصل کر لیا۔ 1903ء میں سندھ کی نہروں سے آبپاشی شروع ہوئی تو موجودہ نصیر آباد کا علاقہ قلات سے پٹہ پر حاصل کر لیا گیا۔ جنوبی بلوچستان سے پولیٹیکل ایجنٹ کو واپس بلا لیا گیا اور لسبیلہ کو قلات کے پولیٹیکل ایجنٹ کے تحت دے دیا گیا۔ ژوب اور تھل چھوٹیالی کے کچھ حصے لے کر لورالائی ضلع بنایا گیا اور بعد ازاں اس کا نام سبی رکھ دیا گیا۔

بیسویں صدی کے پہلے 47 سالوں میں انگریز راج انتہائی پر امن طریقے سے جاری رہا۔ قبائلی بلوچستان بھی انگریز کی مکمل اطاعت میں رہا سوائے چھوٹی موٹی ناچاقی کے جیسے مری مینگل یا بگٹی وغیرہ کے ساتھ مگر اسے بھی بڑی آسانی سے طے کر لیا گیا۔ مجموعی طور پر بلوچستان میں برطانوی راج کی عمل داری میں سرداروں نے انگریز کا ساتھ دیتے ہوئے بلوچستان کو انگریز کی سلطنت کا حصہ بنایا تو انگریز نے بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتے ہوئے سرداری نظام کو نہ صرف مرنے سے بچایا بلکہ اس قدر مضبوط کر دیا کہ آنے والے وقتوں میں بھی یہ فرسودہ نظام بلوچ عوام کے سروں پر قائم رہ سکے۔

انگریز اور بلوچ سیاست





بلوچستان پر برطانوی راج کی عمل داری کادور تب شروع ہوا جب افغانستان کے معزول شاہ شجاع نے افغانستان پر دوبارہ قبضے کی مہم میں انگریزوں کو بلوچستان کی راہ دکھائی ۔ جس طرح کابل کو فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے شاہ شجاع کو افغانستان کا امیر مقرر کردیا تھا اسی طرح انہوں نے قلات فتح کرنے کے بعد وہاں بھی شاہنواز خان کو گدی پر بٹھادیا تھا۔ مگر بلوچوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ نصیر خان دو سال تک مسلسل لڑتا رہا آخر کامیاب ہوا اور انگریزوں نے بھی اُسے تسلیم کرلیا۔ نصیر خان اور انگریزوں کی آپس میں کش مکش بھی چلتی رہی اور دوستی بھی۔ خداداد خان کے دور میں انگریزوں نے اپنے قدم جمالیے تھے، سو مختلف معاہدات کے ذریعے بلوچستان کے مختلف علاقے اجارا داری پر حاصل کر کے براہ راست اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔ سب سے پہلے کوئٹہ کو اجارہ پر حاصل کر کے انگریزوں نے وہاں اپنی چھاونی بنائی۔ پھر بولان، نوشکی اور نصیر آباد کے علاقے حاصل کر کے انگریز عمل داری میں شامل کئے گئے۔ اور پھر دوسری اینگلو افغان جنگ کے بعد گندومک معاہدے کے ذریعے چمن، پشین، لورالائی اور تھل چھوٹیالی کے علاقے انگریزی سلطنت کا حصہ بنالئے گئے۔ خان قلات سے اجارہ پر حاصل کئے گئے علاقے اور امیر افغانستان سے حاصل کئے گئے

علاقوں کو ملا کر 1887ء میں برٹش بلوچستان کے نام سے ایک علیحدہ علاقہ قائم کر لیا تھا' جس کا سربراہ گورنر جنرل کا ایجنٹ ہوتا تھا اور اس کا مرکز کوئٹہ تھا۔ بعد میں مری، بگٹی اور ژوب کے قبائلی علاقوں کو ان کے سرداروں سے مل کر برٹش بلوچستان میں شامل کر لیا گیا۔

ریاستی بلوچستان اس علاقے کو کہا جاتا تھا جو انگریزوں کے براہ راست تسلط میں نہیں تھا بلکہ وہاں انگریز خان آف قلات اور مقامی سرداروں کے توسط سے حکومت کرتے تھے۔ ریاستی بلوچستان چار صوبوں میں تقسیم تھا۔ ساراوان، جھالاوان، کچھی اور مکران۔ قلات ان کا مرکز تھا خاران اور لس بیلا کی ریاستیں بھی ریاستی بلوچستان میں شامل تھیں۔

پرانے وقتوں میں کسی بھی قبیلہ میں باہر سے آنے والے افراد اور مہمانوں کی رہائش اور کھانے کا بندوبست کرنا سردار کی ذمہ داری تھی سو قبیلے کے افراد سردار کی مالی معاونت کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ شادی غمی اور دیگر معاملات کے لیئے بھی خان کی معاونت کی جاتی تھی مگر تب اس کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ قبیلے کے افراد کی طرف سے سردار کو حاصل ہونے والی ادائیگیوں کو بجار اور پوڑی کہا جاتا تھا۔ یہ ٹیکس ایک طرح سے پرانی قبائلی معیشت کا حصہ تھا اور ان کی بنیاد پر ہی سردار کا لنگر چلتا تھا اور دیگر قبائلی اخراجات پورے ہوتے تھے۔ مگر یہ ٹیکس تب سردار کے خزانے کا حصہ بن گئے جب بیرونی اثرات بڑھنے لگے خاص طور پر انگریزوں کے آنے کے بعد جب انہوں نے سرداروں میں یہ تحریک پیدا کی کہ وہ اسے اپنا حق سمجھیں اور بزور قوت اس

کی وصولی میں انگریزی حکومت نے ان کی مدد کی۔ انگریزوں نے بجار، پوڑی یا امداد، نذرانے اور تحفے وغیرہ کو سرداری ٹیکس تسلیم کر لیا اور یوں اسے قانونی حیثیت دے کر قبائلی عوام کے لئے جبر بنا دیا گیا۔ پھر انگریزوں نے سرداروں کو لیوی میں بھرتی کے اختیارات بھی دے دیئے اور یہی لیوی سردار کے لیے عوام سے سرداری ٹیکس بھی وصول کرتی تھی۔

جب برٹش بلوچستان بنایا گیا اور جو پشتون علاقے اس کا حصہ بنائے گئیان کے سرداروں اور معتبرین کو جنہوں نے انگریز کا ساتھ دیا **Grain allownce** کے نام سے وظیفہ دینا شروع کیا جو صرف پشتون سرداروں کے لئے تھا۔ پہلی افغان جنگ کے وقت سراوان کے سرداروں اور دوسرے بڑوں کیلیے انگیریز سے وفاداری کرنے کا وظیفہ جاری کیا گیا۔ اس کے علاوہ ذاتی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے بھی وظائف مخصوص کیے گئے۔ پروفیسر عزیز محمد بگٹی نے بلوچستان پر اپنی کتاب میں چارٹ کے ذریعے ان مراعات یافتہ افراد کی گنتی کی ہے جس کے مطابق چار والیان ریاست **60** بلوچ نوابین ریاست، **13** پٹھان نوابین، **53** بلوچ ملک و معتبر اور **48** پٹھان ملک و معتبر انگریز سرکار کے وظیفہ خور تھے اور دیگر مراعات حاصل کر رہے تھے۔ شاہی جرگہ کے تمام اراکین جن میں **13** بلوچ اور **74** پٹھان تھے یہ مراعات حاصل کر رہے تھے۔ جبکہ ذاتی خدمات کے عوض مراعات حاصل کرنے والے ملک و معتبرین کی کل تعداد **3614** تھی جن میں سے **1091** بلوچ اور **2524** پشتون تھے موروثی حیثیت میں اعزازیئے اور الاونس حاصل کرنے والے **117**۔ بلوچ اور **61**۔ پٹھان تھے۔

ذاتی حیثیت میں انگریزوں کی خدمت گزاری پر معاشی مراعات حاصل کرنے والے 914 بلوچ اور 2168 پٹھان ملک و معتبر تھے۔ مراعات حاصل کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مشکل سے ہی سرداری نظام میں کوئی بڑا بچا ہو گا جس نے مراعات حاصل نہ کیں ہوں۔ اس طرح باقاعدہ مشاہرے، اعزازیئے اور الاونسز مقرر کر کے انگریز سرکار نے بلوچستان کے نوابوں سرداروں وڈیروں ملک اور معتبرین کو باقاعدہ ایک تنخواہ دار طبقے کی حیثیت دے دی۔ وہی بڑے جو بلوچستان کے قبائلی معاشرے میں بزرگ، منصف اور قائد کی حیثیت رکھتے تھے اب اپنے ہی عوام کے حاکم بن گئے اور آہستہ آہستہ ظلم و جبر کی علامت بنتے چلے گئے۔

انگریزی راج کے خلاف آخری مسلح جدوجہد پہلی جنگ عظیم کے وقت پیدا ہوئی جب انگریزوں نے بلوچ قبائل سے اپنی فوج کے لئے بھرتی طلب کی۔ مری علاقے میں اور جھلاوان کے علاقے میں بھرتی کے خلاف ہتھیار اُٹھا لئے گئے۔ اس بغاوت کو جلد ہی ختم کر دیا گیا۔ اس واقعہ کی بعد اس بات کو بلوچ اشرافیہ نے تسلیم کر لیا کہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کر کے بلوچستان کو آزاد نہیں کروایا جاسکتا۔ ان حالات نے نئی سیاسی سوچ کو جنم دیا کہ مسلح لڑائی کی بجائے سیاسی جدوجہد کو اپنایا جائے۔ ان حالات میں بلوچستان میں پہلی تنظیم کا قیام عمل میں آیا جس کا نام 'انجمن اتحاد بلوچاں تھا۔

انجمن اتحاد بلوچاں پوری طرح سیاسی تنظیم تو نہ تھی مگر بعد ازاں اس کے اثرات سیاسی ہی مرتب ہوئے۔ اس انجمن کا مقصد بلوچوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد

کرتا تھا۔ یہ تنظیم میر عبدالعزیز کرد، گل خان نصیر اوران کے چند ساتھیوں نے قائم کی تھی۔

1929ء میں نوابزادہ یوسف عزیز مگسی نے ذاتی طور پر بلوچستان کے حالات کو محسوس کرتے ہوئے ایک مضمون "فریاد بلوچستان" کے نام سے لکھااور لاہور کے ایک اخبار 'ہمدرد' میں شائع کروادیا۔ سرداروں کے جرگہ نے میر یوسف عزیز مگسی کو اس جرم میں ایک سال کے لئے قید کردیا۔ جب یوسف عزیز مگسی مستونگ جیل میں اپنی سزا کاٹ رہا تھاتب انجمن اتحاد بلوچاں کے لوگوں نے ان کے ساتھ رابطہ پیدا کیا۔ رہائی کے بعد 1931ء میں اس تنظیم کی تشکیل نو کی گئی اور اب اس کے رہنما نوابزادہ یوسف عزیز مگسی بنے۔ یہ تنظیم ریاستی بلوچستان کی اشرافیہ پر مشتمل تھی جبکہ برٹش بلوچستان میں اس کا کوئی ممبر یا ساتھی نہیں تھا۔ اسی دوران یوسف عزیز مگسی کی کوششوں سے 1932ء میں جیکب آباد میں بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے پہلے اجلاس کی صدارت عبدالصمد اچکزئی نے کی۔ اس کے بعد کئی کارکنوں کو قید کر لیا گیااور کئی لوگ جو سرکاری ملازمت میں تھے ان کو نکال باہر کر دیا گیا۔ نوابزادہ یوسف عزیز مگسی کو انگریزوں نے میر احمد یار خان جو کہ خان قلات بن چکے تھے کے ساتھ مل کر برطانیہ بھجوادیا۔ مگسی ایک سال سے بھی کم عرصہ برطانیہ میں رہ کر 1935ء کے شروع میں ہی وطن واپس آگئے۔ ابھی انہوں نے انجمن کی سرگرمیوں کو پھر سے شروع کیا ہی تھا کہ 1935ء میں کوئٹہ کے زلزلہ میں ان کی وفات ہو گئی۔ اس طرح سے یہ ابتدائی تنظیم اپنے

انجام کو پہنچی مگر اس کے اثرات آنے والے وقتوں میں اپنے آپ کو نئی شکلوں میں ظاہر کرتے رہے۔

1937ء میں انجمن اتحاد بلوچاں کے لوگوں نے باقاعدہ ایک سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام تھا ’قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی‘۔ اپنے نام کی مناسبت سے ہی یہ پارٹی قلات کو بلوچستان کا مرکز سمجھ کر اور خان قلات کی معاونت سے بلوچستان کی آزادی کی خواہش مند تھی۔ اس پارٹی کے صدر میر عبدالعزیز کرد نائب صدر میر گل خان نصیر اور جنرل سیکریٹری ملک فیض محمد یوسف زئی بنے۔ اس پارٹی کو خان قلات میر احمد یار خان کی حمایت حاصل تھی۔ خان قلات کا جو دوسرے سرداروں سے تضاد تھا اس میں وہ اس پارٹی کی سیاسی حمایت سے اپنا پلہ بھاری رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دیگر سرداران قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی سے ناراض ہو گئے۔ انگریز حکام بھی اس بات کو سمجھ رہے تھے اور انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اس پارٹی کے ذریعے خان قلات انگریزوں پر بھی دباؤ بڑھا سکتے ہیں لہذا انہوں نے خان قلات کے ہاتھوں ہی اس پارٹی پر پابندی بھی لگوائی۔ پہلے سرداران نے 1941ء میں پارٹی کے سالانہ اجلاس میں جو مستونگ میں ہوا پر حملہ کر کے اجلاس کو درہم برہم کر دیا ۔ پھر مطالبہ کیا کہ اس پارٹی پر پابندی عائد کی جائے۔ خان قلات جس نے اس پارٹی کے عہدیداران کو اپنی ریاست میں اچھے عہدوں پر بھی فائز کر رکھا تھا کے پاس سرداروں کا مطالبہ ماننے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ قلات نیشنل پارٹی کو ریاست قلات کی حدود کے اندر غیر قانونی قرار دے گیا، اور عہدیداروں کو ریاست بدر کر دیا

گیا۔ علاقہ بدر ہونے والے افراد نے پارٹی کا دفتر کوئٹہ میں قائم کر کے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

جب ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو بلوچستان میں دو ایوانی پارلیمنٹ بنائی گئی۔ دیوان عام کی 52 منتخب نشستوں میں سے 39 قلات نیشنل پارٹی نے حاصل کر لیں اور میر غوث بخش بزنجو ایوان میں پارٹی کے قائد مقرر ہوئے۔ جب ایوان میں بلوچستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا سوال زیر بحث آیا تو پارٹی نے الحاق کی سخت مخالفت کی۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی کے بعد بلوچستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق کیئے جانے کے فوراً بعد قلات نیشنل پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بعد ازاں پاکستان میں بلوچستان کی خود مختاری کی حمایت کرنے والی سیاسی پارٹیوں پر نہ صرف اس پارٹی کے اثرات بہت گہرے ہوئے بلکہ اس پارٹی کے اکابرین ہی وہ لوگ تھے جو آنے والے وقت میں خود مختاری کی تحریک کے قائد بھی رہے۔ یہاں تک کہ بعد میں بننے والی پارٹیوں میں لفظ 'نیشنل' اس پارٹی کی ہی باقیات تھا۔

انجمن اتحاد بلوچاں اور قلات نیشنل پارٹی دونوں ہی بلوچوں کی پارٹیاں تھیں۔ پشتون لیڈر عبدالصمد اچکزئی ان پارٹیوں کے پر جوش حامی رہے تھے مگر دوسری طرف ان پر انڈین نیشنل کانگرس کے گہرے اثرات تھے۔ ان کا نیشنلزم کانگریس کے نظریات سے زیادہ قریب تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے پشتون قومی سیاست کی بنیاد رکھتے ہوئے انجمن وطن قائم کی۔ اسی زمانے میں وہ 'بلوچی گاندھی' کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ پشتونوں کی جماعت تھی۔ اسی سیاسی عمل میں اچکزئی نے ایک اخبار

'استقلال' کے نام سے بھی جاری کیا۔ عبدالصمد اچکزئی کے سیاسی عمل یعنی انجمن وطن اور اخبار کو خان قلات میر احمد یار خان کی حمایت حاصل تھی یہاں تک کہ اخبار کے پریس کے لیے انہوں نے مالی معاونت بھی کی۔

مسلم لیگ قاضی عیسٰی نے کوئٹہ میں قائم کی۔ جلد ہی مسلم لیگ برٹش بلوچستان کے سرداروں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی کیونکہ اس کے بارے میں تاثر تھا کہ انگریز حکام مسلم لیگ کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔ بیشتر سرداروں نے بھی ان کی ہی خوشنودی کے لیے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ میر جعفر خان جمالی، سردار عثمان جوگیزئی، ارباب کرم خان اور سردار غلام محمد ترین مسلم لیگ بلوچستان کے اولین رہنماؤں میں سے تھے۔ خان قلات میر احمد یار خان کی بھرپور مدد بھی مسلم لیگ کو حاصل تھی کیونکہ قائداعظم محمد علی جناح اس وقت خان قلات کے قانونی مشیر تھے اور ان کے آپس میں ذاتی تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت برٹش بلوچستان کے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے ارکان جن کی تعداد 62 تھی نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا فیصلہ دیا۔ یہ بلوچستان میں مسلم لیگ کے لیے ایک بڑی کامیابی تھی۔ مسلم لیگ بلوچستان میں چند سرداروں کی حد تک محدود تھی اور شروع سے ہی مرکز پسند سیاست کرتی رہی گوکہ اُس وقت آل انڈیا مسلم لیگ صوبائی خودمختاری کی بات کرتی تھی۔

بلوچستان پر انگریزوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ اپنی براہ راست یا بالواسطہ عمل داری جاری رکھی۔ اس دوران صرف چند سرداروں نے انگریزوں کی

مختلف وقتوں میں مخالفت کرنے کی کوششیں کیں جو زیادہ بار آور نہیں ہوئیں۔ زیادہ تر قبائلی اشرافیہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر انگریز سرکار کی خدمت گزار اور وفادار بننے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ قبائل کی اشرافیہ کے آپس میں تضادات بھی چلتے رہتے تھے اور خان قلات کی مرکزی حیثیت کے ساتھ دیگر سرداروں کا تضاد بھی تھا۔ ان تضادات کو انگریز حکام برقرار رکھتے اور ضرورت پڑنے پر بڑھاوا بھی دیتے تھے کیونکہ یہی ان کے سیاسی مفاد میں تھا۔ یہی آپس کے تضادات آنے والے وقتوں کی سیاست میں صاف دیکھے جاسکتے ہیں جب انگریزی راج کی صدی کے آخری چوتھائی حصہ میں جماعتی سیاست شروع ہوئی تو اس وقت کی تمام پارٹیوں یعنی انجمن اتحاد بلوچاں، قلات نیشنل پارٹی، انجمن وطن اور مسلم لیگ کو خان قلات کی حمایت حاصل رہی۔ اس میں خان قلات کا انگریزوں کے ساتھ تضاد کے علاوہ بلوچی سرداروں کے ساتھ تضادات کا عمل دخل بھی تھا۔ خان قلات کو ایک طرف انگریزوں سے اپنے لئے زیادہ اختیارات کی طلب تھی تو دوسری طرف سرداروں میں اپنی برتر حیثیت کو منوانے اور اس پر عمل کروانے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے قبل کی ساری سیاست میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے خان قلات کے اقتدار اور طاقت کے لئے فائدہ مند سیاست تھی۔

روس میں 1917ء میں اشتراکی انقلاب آنے کے بعد اشتراکی خیالات کا اثر بلوچستان میں بھی پہنچا۔ انجمن اتحاد بلوچاں اور قلات نیشنل پارٹی اور پھر ان سے آگے پیدا ہونے والی پارٹیوں اور بلوچ قومی سیاست پر ان اشتراکی خیالات کے

اثرات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پاکستان سے قبل کی سیاست میں ترقی پسند اثرات صرف چند قبائلی سرداروں یا بڑوں تک ہی محدود تھے۔ ان کے ترقی پسند خیالات نے عوام میں کوئی خاص تحریک پیدا نہیں کی بلکہ یہ خیالات ان تک پہنچانے کی کبھی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ یہ سیاسی رجحان البتہ انگریز مخالف سیاست کی بنیاد ضرور تھا جو قیام پاکستان کے بعد مرکز مخالف سیاست کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس وقت کی جماعتی سیاست کا دوسرا رجحان انگریز کا حامی تھا یا زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اُسے مرکز کی حامی سیاست کہیں۔ اس میں مسلم لیگ زیادہ نمایاں تھی۔ برٹش بلوچستان یا پشتون علاقوں کی سیاست میں بھی یہی رجحان زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

پاکستان اور بلوچستان





بلوچستان کی تاریخ قیام پاکستان کے ساتھ ہی ایک نیا موڑ مڑ گئی۔ جب تک تقسیم ہند کا فیصلہ نہیں ہوا تھا تب تک خان قلات ریاستی امور میں اپنے لیے وہ اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے جو انگریزوں نے ایک ایک کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے قلات نیشنل پارٹی کی بھر پور معاونت کی۔ یہ پارٹی ریاست کے ملازمین نے ہی بنائی تھی یا پھر ان کے عہدیداروں کو ریاست میں اہم ملازمتیں دی گئیں۔ دیگر بلوچ بروہی سرداران نہیں چاہتے تھے کہ خان قلات بااختیار ہو جائے کیونکہ اس طرح ان کے اپنے اختیارات کم ہوتے تھے سو وہ اپنے آپ کو طاقتور رکھنے کے لیے انگریز حکام کے زیادہ نزدیک اور تابع ہونے کی کوشش کرتے رہتے اور انگریز حکام خان قلات اور دیگر سرداروں کے مابین تضادات سے کھیلتے رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں سرداروں کے کہنے پر انگریزوں نے قلات نیشنل پارٹی پر پابندی خود خان کے ہاتھوں لگوائی۔

خان قلات قانونی سطح پر اپنے اختیارات واپس حاصل کرنے کی کوشش نامور وکیل جناب محمد علی جناح کے ذریعے کر رہے تھے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ قائداعظم قلات کے ریاستی امور میں خان قلات کے وکیل تھے اور ان کے مقدمات اور معاملات کی پیروی بھی کرتے رہے تھے۔ انہی حالات میں خان قلات اور قائداعظم میں اچھے ذاتی تعلقات بھی استوار ہو چکے تھے۔ اسی دوران تقسیم ہند کی

تحریک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی اور یہ طے ہو گیا کہ ہندوستان کو آزادی دے دی جائے اور اسے دو ملک یعنی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے۔ اب ایکدم سے یہ سوال کھڑا ہو گیا کہ برصغیر کی چھوٹی ریاستوں خاص طور پر بلوچستان کا درجہ کیا ہو گا؟

قیام پاکستان کے وقت بلوچستان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک برٹش بلوچستان اور دوسرا ریاستی بلوچستان۔ برٹش بلوچستان براہ راست انگریزوں کے زیر انتظام تھا۔ 3جون 1947ء منصوبہ آزادی کے مطابق برٹش بلوچستان کے لیے پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کا اختیار شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے اراکین کو دیا گیا۔ انگریز حکام کا واضح جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف تھا اور شاہی جرگہ کے سرداروں نے پاکستان کے ساتھ الحاق میں اگر کوئی ہچکچاہٹ محسوس بھی کی تھی تو صرف یہ کہ نیا ملک پاکستان ان سرداروں کے وظائف جاری رکھ سکے گا یا نہیں؟ اور یہ کہ ان کے مفادات کو پاکستان کس حد تک پورا کرئے گا۔ جب کچھ اعلیٰ عہدیداروں نے ان سرداروں کو ان کے مفادات کے تحفظ کا یقین دلا دیا تو انہوں نے فوراً حامی بھر لی۔ یوں 29 جون 1947ء کو کوئٹہ میونسپلٹی کے ارکین اور شاہی جرگہ کے اراکین نے برٹش بلوچستان کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر دیا۔

4 اگست 1947ء کو دہلی میں وائسرائے ہند لارڈ ماونٹ بیٹن کی سربراہی میں ریاست قلات کے بارے میں اجلاس ہوا جس میں قائداعظم کے علاوہ خان آف قلات، ان کے وزیراعظم اور ریاست کے قانونی مشیر بھی شریک ہوئے۔ اجلاس میں قلات کی آزاد اور خود مختار حیثیت کو تسلیم کیا گیا اور ایک معاہدہ جاریہ پر دستخط کیے گئے

اور یہ بھی طے کیا گیا کہ قلات کے دفاع' خارجہ امور، کرنسی اور جو علاقے برٹش بلوچستان میں آگئے تھے کے بارے میں کراچی میں مزید بات چیت طے کی جائے گی۔ ان مذاکرات میں لسبیلہ اور خاران کی ریاستوں کا مستقبل طے کرنے کے اختیارات بھی قلات کو دے دیئے گئے۔ اس دوران خان قلات نے محسوس کیا کہ ان پر پاکستان کے ساتھ غیر مشروط الحاق کرنے کے لئے دباؤ بڑھ رہا ہے۔ خان قلات صوبائی خود مختاری کے معاملات طے کرنے کے بعد ہی کچھ فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران ماؤنٹ بیٹن کا تار خان قلات کو پہنچا کہ ہم گیارہ اگست 1947ء کو رات آٹھ بجے دہلی ریڈیو سے قلات کی آزادی کا اعلان کریں گے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اعلان کیا بھی گیا۔

ان حالات میں خان قلات نے 12 اگست 1947ء یعنی پاکستان کی آزادی سے دو روز قبل ہی قلات کی آزادی کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی قلات میں ایک دو ایوانی پارلیمنٹ کے قیام کا اعلان بھی کیا۔ دیوان عام کے اراکین کی تعداد 52 مقرر کی گئی اور محدود رائے دہی کی بنیاد پر ان کا انتخاب کیا گیا۔ غیر قانونی قرار دے دی گئی قلات نیشنل پارٹی کے اراکین نے انفرادی طور پر 52 میں سے 39 نشستیں حاصل کر لیں۔ میر غوث بخش بزنجو قائد ایوان مقرر ہوئے۔ دیوان خاص موروثی سرداروں پر مشتمل تھا جس کی تعداد 36 تھی۔ قلات کے دونوں ایوانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کی مخالفت کی اور آزاد رہنے کا فیصلہ کیا۔

پاکستان کی آزادی کے بعد خان قلات نے اپنے وزیر اعظم کو گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے بات چیت کرنے کے لئے کراچی بھیجا۔ بعد ازاں خان قلات کو قائداعظم نے قاضی عیسیٰ صدر مسلم لیگ بلوچستان کے ذریعے بلوا

بھیجا۔ کراچی کی ملاقات میں قائداعظم نے خان قلات کو ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ غیر مشروط طور پر کرنے کی بات کی جبکہ باقی معاملات کو بعد ازاں طے کر لینے کی یقین دہانی بھی کروائی۔

17 مارچ 1948ء کو حکومت پاکستان نے خاران، لسبیلہ اور مکران کو قلات سے علیحدہ ریاستوں کی شکل میں ان کا پاکستان کے ساتھ الحاق منظور کرنے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ 3 جون 1947ء کے اجلاس میں حکومت برطانیہ نے رسمی طور پر لسبیلہ اور خاران کا کنٹرول ریاست قلات کے حوالے کر دیا تھا۔ ان ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اب معاملات بات چیت کی بجائے طاقت سے حل کرنے کے اقدامات کئے جائیں گے اور ہوا بھی یہی کہ قلات کے خلاف فوجی کاروائی کی دھمکی دے دی گئی۔ چنانچہ 27 مارچ 1948ء کو خان قلات نے ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی فوری طور پر قلات نیشنل پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ پارٹی کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا جن میں میر غوث بخش بزنجو مولانا عمر اور گل خان نصیر بھی شامل تھے۔ پارٹی کے کئی درجن اراکین کو نوکریوں سے نکال دیا گیا اور قلات کا انتظام براہ راست حکومت پاکستان نے سنبھال لیا۔ حکومت پاکستان کے ان غیر جمہوری اقدامات سے ہی بلوچستان میں قوم پرست سیاست کا آغاز ہوتا ہے۔

شہزادہ میر عبدالکریم خان جو خان قلات میر احمد یار خان کا چھوٹا بھائی اور اس وقت مکران کا گورنر تھا جب مکران کا الحاق پاکستان سے کیا گیا۔ جس سے اُسے دکھ پہنچا اور پھر جب فوجی کاروائی کے دباؤ پر قلات کا الحاق پاکستان سے ہو گیا تو شہزادہ کریم اس

صورت حال کو برداشت نہ کر سکا اور مئی 1948ء میں اپنے چند ساتھیوں سمیت بلوچستان چھوڑ کر سرحد پار کر کے افغانستان کے علاقے میں چلا گیا۔ بعد ازاں قریباً پانچ ہزار مسلح افراد بھی قلات سے شہزادہ کریم کے پاس چلے گئے۔ شہزادہ کریم کے اس اقدام کو پاکستان کے حکومتی حلقوں نے بغاوت سمجھا۔ احکام کی یقین دہانیوں کے بعد جب وہ واپس پاکستان آئے تو شہزادہ کریم اور ان کے کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کو مختلف معیاد کی سزائیں سنادی گئیں۔

جب شہزادہ کریم افغانستان چلے گئے تھے تو اسی دوران جھلاوان کے قبائلی افراد میں خاصی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ میر گوہر خان زرکزئی کی قیادت میں مسلح افراد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے مگر جب انہیں شہزادہ کریم کے گرفتار ہونے کی اطلاع ملی تو یہ مہم نہ صرف آگے نہیں بڑھی بلکہ مایوسی میں اختتام پذیر ہو گئی۔

اپریل 1949ء میں حکومت پاکستان نے برٹش بلوچستان میں ایک مشاورتی کونسل مقرر کی جس کا کام ایجنٹ گورنر جنرل کو مشورے دینا تھا۔ یہ کونسل پندرہ ارکان پر مشتمل تھی۔ ان میں سے دوارکان قاضی عیسیٰ اور نور محمد خان کو ایجنٹ گورنر جنرل کا ایڈوائزر مقرر کیا گیا۔ یہ کونسل انتظامی افسروں کی سفارش پر نامزد کی گئی تھی۔ مقامی قبائلی سردار اس کونسل سے خوش نہیں تھے کیونکہ اس میں انہیں نمائندگی نہیں ملی تھی لہذا سرداروں نے مسلم لیگ سے الگ اپنی ایک تنظیم بنالی جس کا نام تھا بلوچستان قبائلی فیڈریشن' اور اس کے سربراہ تھے نواب محمد خان جوگیزئی۔ اس تنظیم کا مقصد سرداروں کو مشاورتی کونسل میں نمائندگی دلوانا تھا۔ اس تنظیم نے واضح طور پر کہا کہ ان کا مقصد مسلم لیگ سے علیحدہ نہیں ہے مگر بلوچستان کی سطح پر فیڈریشن کو

مسلم لیگ سے اختلاف ہے اور فیڈریشن پچانوے فی صد نمائندگی سرداروں کے لئے چاہتی ہے۔

ریاستی بلوچستان میں ایک حکمران کونسل 1952ء میں تشکیل دی گئی جس کادائرہ اختیار قلات، خاران، لسبیلہ اور مکران تک تھا۔اس کونسل کا سربراہ خان قلات کو مقرر کیا گیا۔یہ انتظام 1955ء تک یعنی ون یونٹ کے قیام تک جاری رہا۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی پاکستان میں شامل ہونے والی قوموں یعنی بنگالیوں، سندھیوں، پشتونوں اور بلوچوں کو اپنی خود مختاری کی فکر لاحق ہو گئی۔اس ضمن میں سیاسی سطح پر اس کا اظہار بھی ہوتا رہتا تھا۔ جبکہ پنجابیوں اور اُردو بولنے والے مہاجرین کا مرکزی حکومت پر تسلط بڑھتا چلا جارہا تھا۔

مشرقی پاکستان کی بنگالی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی اور وہاں سیاسی اختیار کا سوال اُٹھنے لگا تھا۔ پاکستان میں ابھی تک کوئی متفقہ آئین بھی نہیں بنایا جاسکا تھا۔ پرانے دستوری ڈھانچے کی نوک پلک درست کر کے اسے ہی استعمال کیا جارہا تھا۔ 1955ء میں مرکزی حکومت کے سرکردہ افراد نے ایک نئے دستوری نظام کے تحت ملک کے دونوں حصوں یعنی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لیے 'پیریٹی' کا اصول وضع کیا اور مغربی پاکستان کی چاروں قوموں یا صوبوں کو ون یونٹ میں تبدیل کر دیا گو کہ ون یونٹ کا خان قلات اور زیادہ تر سرداروں نے خیر مقدم کیا مگر درحقیقت سبھی اس کے مخالف تھے مگر اپنے مفادات کی بنیاد پر اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ 1955ء میں ہی شہزادہ عبدالکریم جو کچھ عرصہ پہلے ہی اپنی سزا ختم ہو جانے پر رہا ہو کر آئے تھے نے اپنے پرانے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ایک نئی سیاسی تنظیم 'اُستمان گل' بنائی۔ اس تنظیم

کا بنیادی مقصد ون یونٹ کی مخالفت اور صوبوں کی خود مختاری کے حق کی علمبرداری تھی۔ شہزادہ کریم اس نئی پارٹی کے صدر اور محمد حسین عنقا اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔

اس سے پہلے یعنی 1954ء میں عبدالصمد اچکزئی سات سال بعد جیل سے باہر آئے تو انہوں نے پشتونوں کی علیحدہ جماعت 'ورور پشتون' بنائی۔ خود اچکزئی اس کے صدر اور ہاشم خان غلزئی اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔

ون یونٹ کے قیام سے مرکزی حکومت کو بے پناہ اختیارات حاصل ہو گئے تھے جبکہ بنگالیوں بلوچیوں سندھیوں اور پشتونوں میں احساس محرومی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور تمام قوموں میں مقامی سطح کی پارٹیاں اپنے حقوق کے لئے جدوجہد میں مصروف تھیں حتیٰ کہ پنجابیوں میں بھی ترقی پسند حلقہ اس مرکزیت کے خلاف تھا۔ جولائی 1956ء میں میاں افتخار الدین نے تمام قوموں کے ترقی پسند دھڑوں اور جماعتوں کا لاہور میں اجلاس بلایا۔ اس میٹنگ میں میاں افتخار الدین کی آزاد پاکستان پارٹی، جی ایم سید کی عوامی تحریک، شہزادہ کریم کی اُستمان گل اور عبدالصمد اچکزئی کی ورور پشتون شامل تھیں۔ بعد ازاں عوامی لیگ سے الگ ہونے والے مولانا بھاشانی بھی اس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس نئی پارٹی کا نام نیشنل عوامی پارٹی رکھا گیا۔ یہ پارٹی ترقی پسند سیاست اور قومی تحریک میں اپنے کردار کے حساب سے سنگ میل ثابت ہوئی۔

پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی غیر جمہوری عناصر کی حاکمیت میں آتا چلا گیا۔ مسلم لیگ جسے پاکستان بنانے کا دعویٰ تھا نہ تو پاکستان کو آئین دے سکی اور نہ ہی جمہوریت۔ بلکہ مسلم لیگ عوام سے کٹ کر محض حکمرانوں کا ایک چھوٹا سا ٹولہ بن

گئی جو مسلسل ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور حکومت میں رہنے کے لیے ہر طرح کی بدعنوانی کو جائز سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں بیوروکریسی سیاسی سطح پر زیادہ طاقتور ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ اعلیٰ انتظامی افسر براہ راست سیاسی اقتدار سنبھالنے لگے۔ جب سول انتظامیہ برتر ہو گئی اور مسلم لیگ کے سیاسی رہنما اُن کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچنے لگے تو فوج جو کہ مسلح اور منظّم ادارہ تھا میں اعلیٰ سطح پر ایسی ذہنیت تشکیل پائی جس نے لولی لنگڑی سول حکومت کی بساط لپیٹ دی اور ملک میں فوجی آمریت جو کہ حکمرانی کی بدترین شکل ثابت ہوئی نافذ کر دی۔

اکتوبر 1958ء میں فوج کے سربراہ جنرل ایوب خان نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ اس سے پہلے ایوب خان فوجی جرنیل ہوتے ہوئے بھی کابینہ میں ایک وزیر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ صدر سکندر مرزا نے شاید خود آمر بننے کی خواہش کے تحت خان قلات کو اشارہ دیا تھا کہ ان کی پرانی بااختیار 'میری' انہیں واپس کر دی جائے گی۔ جس پر خان قلات نے پھر سے بااختیار حاکم بننے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور مطالبہ کیا تھا کہ بلوچستان بمعہ برٹش بلوچستان اور سندھ پنجاب کے بلوچ علاقوں کے قلات کی میری کے ماتحت کر دیا جائے۔ یہی وہ جواز تھا جس کی بنا پر مارشل لاء سے ایک روز قبل قلات پر فوج کشی کی گئی۔ خان قلات اور ان کے کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا کچھ لوگ اس ایکشن میں مارے گئے۔ قلات کے محل کو فوج نے اپنے قبضہ میں لے کر وہاں سے نوادرات قیمتی اسلحہ اور دیگر اشیاء اپنے ساتھ لے گئی۔ فوجی حکومت نے الزام لگایا کہ خان قلات اور اس کے قریبی ساتھی افغانستان کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف سازش کر رہے تھے۔

قلات کے فوجی ایکشن اور خان قلات کی گرفتاری نے بلوچ عوام میں شدید اضطراب پیدا کر دیا۔ کوئٹہ میں ایک احتجاجی جلوس نکالا گیا جس میں تقریباً پچاس سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

سیاسی بے چینی کا سب سے بڑا اظہار جھلاوان میں ہوا جہاں نواب نوروز خان کی قیادت میں بلوچوں نے بغاوت کر دی۔ 8۔ اکتوبر 1958ء کو پاکستانی فوج جھلاوان میں گئی اور دیہاتوں میں وسیع پیمانے پر اسلحہ کی تلاشی شروع کر دی۔ دان سر کے مقام پر فوج کو پہلی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جہاں تین نوجوانوں نے ان کو تین دن تک روکے رکھا حتیٰ کہ ان میں سے ایک مر گیا اور دو شدید زخمی ہو گئے۔ پھر فوج وڈھ کے علاقے میں گئی جہاں اس نے عوام کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور میر نوروز خان کی قیادت میں پہاڑیوں پر مورچہ زن ہو گئے۔ کرنل ٹکا خان نے میر نوروز کے گاؤں پر بمباری کا حکم دیا اور بمباری سے پورا گاؤں نیست و نابود کر دیا گیا۔ میر نوروز خان فوج کے خلاف تقریباً ایک سال تک لڑتا رہا۔ فوج نے اس دوران بمباری سے کئی گاؤں تباہ کیئے اور بہت سے لوگ مارے گئے مگر بغاوت ختم نہ ہوئی اور نہ ہی وہ کسی بندے کو گرفتار کر سکے۔ تب فوج نے میر نوروز خان کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ بغاوت ختم کر دے تو اس کے مطالبات بھی مان لئے جائیں گے اور باغیوں کو بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ان معاملات کی یقین دہانی قرآن شریف پر حلف دے کر کرائی گئی۔ سادہ دل میر نوروز خان اس یقین دہانی پر جب پہاڑ سے اتر آیا تو اُسے اور اُس کے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ میر نوروز خان کو بڑھاپے کی وجہ سے عمر قید کی سزا دی گئی اور ان کے سات ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دی گئی جبکہ باقی سات لوگوں کو عمر قید کی سزا

دی گئی۔ میر نوروز 1964ء میں جیل میں ہی فوت ہو گئے۔

میر نوروز خان کی بغاوت اور فوجی حکومت کی عہد شکنی نے بلوچستان کے عوام میں اور خصوصی طور پر سیاسی کارکنوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی اور انہوں نے اپنے سیاسی مطالبات کے لیے بندوق اٹھانے کی ٹھان لی۔ دوسری طرف فوجی حکومت انتہائی سختی سے بلوچستان میں اُٹھنے والی قوم پرستی کی تحریک کو کچل دینا چاہتی تھی۔ 1962ء میں ایوب خان نے جب کوئٹہ کا دورہ کیا تو سیاسی کارکنوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں بلوچ قائدین نے ایوب خان کو خبردار کیا کہ بلوچستان کے مسائل کا فوجی حل اچھے نتائج بر آمد نہیں کر سکتا۔ جب کہ ایوب خان نے عام جلسہ میں دھمکی دی کہ اگر بلوچستان میں مزاحمت ختم نہ ہوئی تو انتہائی قدم اُٹھانے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ آنے والے سالوں میں بلوچستان میں مسلح مزاحمت بڑھتی چلی گئی۔ جھلاوان اور مری علاقے میں گوریلا تربیت کے کئی کیمپ بن گئے جہاں ایک اندازے کے مطابق دونوں علاقوں میں چار چار سو باقاعدہ گوریلے منظم کیئے گئے جب کہ ان سے کہیں زیادہ وہ کارکن تھے جو کم سطح پر منظم تھے۔ 1964ء اور 65ء کے سالوں میں فوج اور قوم پرست گوریلوں میں کئی جھڑپیں ہوئیں جن میں دونوں طرف سے لوگ مرتے رہے۔ اس دوران فوج نے بڑی سطح کے ایکشن کیئے جن میں ہوائی فوج کے جہازوں نے بمباری بھی کی۔ ایوب خان نے بلوچ قیادت اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے سردار عطاءاللہ مینگل، نواب خیر بخش مری اور سردار اکبر بگٹی کی جگہ نئے سردار مقرر کر دیئے مگر عوام نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے قبیلوں کے لوگوں نے نئے سرداروں کو مار دیا۔ 1967ء میں حکومت نے ایک امن معاہدے

کے تحت اس جاری لڑائی کو ختم کر دیا۔ یوں تقریباً ایک دہائی سے جاری مسلح جدوجہد کا ایک دور اپنے اختتام کو پہنچا۔

جنرل ایوب خان کا دور پاکستان میں آمریت اور مرکزیت کا دور تھا جس میں نہ صرف عوام کے جمہوری حقوق کو تسلیم نہیں کیا گیا اور سیاسی جمہوری تحریکوں کو سختی سے دبا دیا گیا بلکہ پاکستان میں بسنے والی قوموں کے حقوق کو بھی نہیں مانا گیا اور قومی تحریکوں کو انتہائی بے رحمانہ طریقے سے کچل دینے کی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کا قومی سطح پر احساس محرومی اس قدر بڑھ گیا کہ ان میں قوم پرستی کی تحریک انتہائی مضبوط اور منظم ہوتی چلی گئی۔ مغربی پاکستان کی قوموں میں بھی یہی احساس کار فرما تھا جب کہ بلوچستان میں تو قومی تحریک مسلح مزاحمت کی شکل اختیار کر گئی۔ اسی دوران سارے ملک میں ایوب آمریت کے خلاف عوامی تحریک چل نکلی تو ایوب خان نے جاتے جاتے اقتدار ایک بار پھر فوجی جرنیل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا جس نے مارچ 1969ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔

یحییٰ حکومت نے جولائی 1970ء میں ون یونٹ ختم کر دیا۔ ون یونٹ کے خاتمے کے ساتھ ہی پاکستان کے سابقہ صوبے یعنی مشرقی پاکستان، پنجاب، سندھ اور سرحد بحال ہو گئے اور بلوچستان کو بھی ایک علیحدہ صوبے کا درجہ حاصل ہو گیا۔ یوں بلوچستان کو پہلی دفعہ ایک صوبہ کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ اس کے بعد کی سیاست میں بلوچستان ایک صوبہ کی حیثیت سے سامنے آیا۔ بلوچستان کی اس صوبائی حیثیت کے اندر ایک تضاد بھی تھا کہ اس میں رہنے والے پشتون عوام کے قائدین خود کو صوبہ سرحد کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے اور کئی بلوچ قائدین سندھ کے ضلع جیکب آباد اور پنجاب

کے ضلع ڈیرہ غازی خان کو بلوچستان کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ مگر مارشل لاء حکومت نے ایسی کسی بات کا دھیان نہیں رکھا اور بلوچستان کی نسلی، لسانی اور ثقافتی حدبندی تکمیل پذیر نہ ہو سکی۔

دسمبر 1970ء میں پاکستان میں پہلی بار عام آزادانہ انتخابات کرائے گئے۔ مشرقی پاکستان سے مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور سابقہ مغربی پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی اکثریتی جماعتوں کی حیثیت سے انتخاب جیت کر سامنے آئیں۔ بلوچستان میں بلوچ علاقے سے نیشنل عوامی پارٹی اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے سامنے آئی اور پشتون علاقے سے جمعیت علمائے اسلام نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ پاکستان کی فوجی حکومت اکثریتی پارٹی عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنا نہیں چاہتی تھی سو مشرقی پاکستان میں احتجاجی تحریک کے نتیجے کے طور پر فوجی ایکشن ہوا پھر ہندوستان کے ساتھ جنگ بھی ہوئی جس سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے ایک علیحدہ ملک کی حیثیت اختیار کر گیا۔ باقی ماندہ پاکستان میں حکومت پیپلز پارٹی نے سنبھالی۔ بلوچستان میں سردار عطاءاللہ مینگل کی سرکردگی میں نیپ، جے یو آئی کی مخلوط حکومت وجود میں آئی۔ بلوچستان میں سردار مینگل اور میر بزنجو جیسے قوم پرست قائدین کی حکومت کو بھٹو کی مرکزی حکومت نے جمہوری سطح پر دل سے تسلیم نہیں کیا کیونکہ یہ حکومت بھٹو کی اپنی پارٹی کی حکومت نہیں تھی اور یہ کہ اس قدر تابعدار بھی نہیں تھی جتنا کہ وہ چاہتا تھا۔ ایک بڑی وجہ شاہ ایران بھی تھا جس کو احساس تھا کہ بلوچستان میں قوم پرست حکومت بننے سے ایرانی بلوچستان میں بلوچ قومی تحریک کو تقویت مل سکتی ہے۔ سو فروری 1973ء میں سردار مینگل کی حکومت

کو بر طرف کر دیا گیا اور نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے لئے ان پر علیحدگی پسندی اور اسلحہ جمع کرنے کے الزامات لگائے گئے۔ صوبہ سرحد کی نیپ۔ جے یو آئی مخلوط حکومت نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ نیپ کے سر کردہ لیڈروں اور بلوچ قائدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ بھٹو نے ایک طرف بلوچستان میں مفاد پرست عناصر کو ساتھ ملا کر پیپلز پارٹی کی حکومت بنانے کی کوششیں شروع کر دیں اور دوسری طرف قلات ،خضدار اور دیگر علاقوں کے ارد گرد پیرا ملٹری فورس اکٹھی کرنا شروع کر دی۔ مرکزی حکومت نے ایک بار پھر بلوچستان کی قومی سیاسی تحریک کو جمہوری راستوں سے ہٹا کر مسلح مزاحمت کی طرف دھکیل دیا۔

بلوچستان میں فوج کے تین ڈویژن اور پیرا ملٹری فورس سمیت تقریباً ایک لاکھ نفری بلوچوں کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجے گئے۔ **1974**ء تک سارا مری علاقہ ان افواج کی زد میں تھا۔ اس ایکشن میں فوجی ہیلی کاپٹر اور جنگی ہوائی جہاز بھی استعمال کیے گئے۔ مری قبائل اس بڑی سطح کے حکومتی تشدد کے نتیجے میں بلوچستان چھوڑ کر افغانستان منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ بلوچستان میں فوجی کاروائی **1977**ء تک جاری رہی جب ضیاء الحق نے ملک میں ایک بار پھر مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ضیاء کی مارشل لاء حکومت نے بلوچ قائدین پر سے مقدمات ختم کر کے انہیں رہا کر دیا جس کے بعد سردار عطاءاللہ مینگل اور سردار خیر بخش مری رضاکارانہ جلاوطنی پر برطانیہ چلے گئے۔ جہاں وہ **1992**ء تک رہتے رہے۔ ضیاء کے دور سے پہلے بلوچستان کے وہ سردار جو پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے اب ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں شامل ہو گئے۔ سیاسی جماعتوں کی بحالی کے بعد یہی عناصر جونیجو مسلم لیگ کے کرتا دھرتا رہے۔

1988ء میں پھر انتخابات ہوئے جس میں کوئی پارٹی اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ مسلم لیگ نے دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت بنائی مگر انہیں اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ ہو سکی جس کے نتیجے میں صوبائی اسمبلی توڑ دی گئی۔ بعد ازاں بلوچستان ہائیکورٹ نے اسمبلی بحال کر دی اور سردار اکبر بگٹی نے مخلوط حکومت بنائی۔

1990ء کے انتخاب میں جمہوری وطن پارٹی نے 13 سیٹیں حاصل کیں اور وہ صوبائی اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی تھی مگر مسلم لیگ اور دیگر پارٹیوں کے اتحاد، آئی جے آئی، نے پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر صوبائی حکومت تشکیل دی جب کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ بے نظیر بھٹو ملک میں مسلم لیگ کے خلاف تحریک چلا رہی تھیں۔

1993ء میں ذوالفقار علی مگسی نے مخلوط حکومت بنائی اور اسمبلی کے اپنے حامی تمام ممبران کو وزارتیں دے کر ساتھ رکھا۔

1996ء کے انتخابات کے بعد قوم پرست رہنما سردار عطاءاللہ مینگل کے بیٹے اختر مینگل کی سربراہی میں مخلوط حکومت بنی۔ مگر بعد ازاں اُن کے پاکستان کی حکمران جماعت مسلم لیگ سے اختلافات ہو گئے۔ اس دوران اُن کی اپنی پارٹی بلوچستان نیشنل موومنٹ میں بھی اندرونی اختلاف پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں مینگل حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور ایک نئی مخلوط حکومت جان محمد جمالی کی زیرِ قیادت برسرِ اقتدار آگئی۔

بلوچ پشتون تعلقات





1880ء کی دہائی میں جب افغان جنگ کے بعد تاوان کے طور پر انگریزوں نے کچھ پشتون علاقے افغانستان سے کاٹ کر براہ راست اپنے کنٹرول میں لئے تھے تو انگریزوں نے خان قلات میر خداداد خان کو تجویز پیش کی تھی کہ ان علاقوں کو بھی قلات کا حصہ بنالیا جائے اور چار نمائندے مقرر کئے جائیں جو پورے بلوچستان کا انتظام سنبھالیں ان میں دو نمائندے قلات کی طرف سے ہوں۔ مگر خان خداداد خان نے یہ پیش کش قبول نہیں کی تھی۔ یہ علاقے تھے، ہرنائی، ڈکی، پشین اور تحصیل چمن، تحصیل سبی کا کچھ حصہ، لورالائی اور ژوب کے قبائلی علاقے۔ بعد ازاں انگریزوں نے کوئٹہ کا علاقہ اجارہ پر حاصل کر کے اور ان علاقوں کو ملا کر برٹش بلوچستان بنایا تھا۔ جوں جوں انگریزوں کی طاقت بڑھتی گئی برٹش بلوچستان کا علاقہ بھی بڑھتا گیا۔

پشتونوں اور بلوچوں کے پڑوسیوں کی حیثیت سے ہمیشہ تعلقات اچھے رہے تھے مگر یہ دونوں اپنی علیحدہ زبان اور ثقافت کی وجہ سے اپنی اپنی شناخت رکھتے تھے۔ دونوں قومیں بلوچستان کے اندر رہتے ہوئے بھی الگ الگ انتظامی مشینری کے تحت رہتی رہیں۔ بلوچ علاقے خان قلات اور مقامی سرداروں کے ماتحت تھے۔ انگریزوں کے عمل دخل نے ان علاقوں میں انگریزی سرکار کے افسروں کے اختیارات بڑھادیے تھے مگر یہ علاقے براہ راست انگریزوں کے ماتحت نہیں تھے۔ جبکہ پشتون علاقے بلوچستان کا حصہ بننے کے ساتھ ہی انگریزوں کے براہ راست عملداری

میں آگئے تھے۔ پشتونوں میں بلوچوں جیسا سرداری نظام موجود نہیں تھا البتہ ان کا اپنا قبائلی نظام اور ثقافتی روایات تھیں جو چلتی رہیں۔

انگریزی دور میں بلوچستان کی سیاسی جدوجہد میں پشتون اور بلوچوں کی دوستی تھی اور وہ مل کر جدوجہد کرتے تھے۔ خاص طور پر عبدالصمد اچکزئی سیاسی جدوجہد میں بلوچوں کے ساتھ شامل رہے۔ مگر آہستہ آہستہ ان میں تبدیلی پیدا ہوئی اور 1954ء میں انہوں نے نئی سیاسی جماعت پختون ورور بنائی تو انہوں نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔ اب وہ صرف پشتونوں کی سیاست کے علم بردار بن کر سامنے آئے۔ اچکزئی کی نئی پارٹی کا منشور ہی یہ تھا کہ پاکستان میں بسنے والے پشتونوں کا علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔ اس سے پہلے عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر اچکزئی پشتونوں کے لیئے علیحدہ صوبے کا مطالبہ کر چکے تھے۔ 1956ء میں عبدالصمد اچکزئی نے اپنی پارٹی کو نیشنل عوامی پارٹی میں ضم کر دیا اور پشتون صوبے کے مطالبے کو وہ اس نئی پارٹی کے پلیٹ فارم سے اٹھانے لگے۔ ون یونٹ کے خاتمے کے بعد صوبہ سرحد کے پشتون قائدین نے لسانی سطح پر صوبہ بنانے کی پرزور حمایت نہیں کی تھی اس لیے اچکزئی نے دلبرداشتہ ہو کر پھر اپنی پارٹی علیحدہ کر لی جو کہ 'پختونخواہ نیپ' کہلائی۔

بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی مخلوط حکومت میں پشتونوں کی نمائندگی جے یو آئی کر رہی تھی جو کہ مذہبی جماعت ہے۔ جب نیپ کی مخلوط حکومت کو برطرف کر دیا گیا اور بلوچ قائدین کو گرفتار کر لیا گیا اور نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگا دی گئی تو جیل سے باہر سیاسی افراد نے مل کر نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی بنالی جس کے صدر شیر باز مزاری تھے۔ این ڈی پی کا بھی وہی منشور تھا جو نیپ کا تھا یعنی لسانی بنیادوں پر صوبوں کی

تقسیم۔

بلوچوں نے کبھی بھی پشتونوں پر حکمرانی کرنے کی خواہش نہیں کی نہ اس وقت جب انگریزوں نے پشتون علاقوں کو قلات ریاست کا حصہ بنانے کی پیش کش کی تھی اور نہ پاکستان بننے کے بعد۔ حتیٰ کہ وہ ہمیشہ ہی پشتونوں کے علیحدہ صوبہ کے حق میں رہے ہیں اور وہ بلوچستان کو لسانی سطح پر تقسیم کرنے کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ جب ون یونٹ کو ختم کیا گیا تو خان قلات نے جنرل یحییٰ خان کو لکھا کہ پشتون علاقوں کو بلوچستان کا حصہ نہ بنایا جائے۔ میر غوث بخش بزنجو اور اکبر بگٹی نے واضح طور پر بلوچستان صوبہ کی لسانی بنیاد پر تقسیم کے حق میں بیانات دیے۔ سردار عطاءاللہ مینگل نے تو بلوچستان کے پشتون علاقوں کو صوبہ سرحد کے ساتھ جوڑنے کی تجویز بھی دی۔

بھٹو دور میں جب نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگا دی گئی تھی تو پارٹی کے پشتون اور بلوچ سبھی قائدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ جس کے بعد بلوچستان میں جو مسلح مزاحمت شروع ہوئی اس میں صرف بلوچ ہی شامل تھے۔ جبکہ پارٹی کے صدر عبدالولی خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یقین دہانی کروائی تھی کہ پشتون ان کی حمایت کریں گے اور افغانستان سے بھی وہ مراعات لے کر دیں گے جہاں ان کا کافی اثر تھا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ بعد ازاں جب جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء آیا تو جیل میں بند نیپ کے قائدین کو ضمانت نامے داخل کروانے کے لیے کہا گیا تاکہ انہیں رہا کیا جا سکے۔ ولی خان اور پانچ دوسرے پشتون قائدین نے حکومت کی اس پیش کش کو قبول کر لیا تھا جبکہ بلوچ قائدین کا مطالبہ تھا کہ ان کے مقدمات واپس لیے جائیں۔ بلوچوں کو مرکزی حکومت کے ساتھ لڑائی میں اکیلا چھوڑ دینے پر پشتونوں کے ساتھ رنجش پیدا

ہوئی۔ بلوچ سیاسی کارکنوں کو این ڈی پی سے بھی شکایت پیدا ہوئی کہ اس میں ان کے نقطہ نظر کو نہ صرف سمجھا نہیں جارہا بلکہ اکثر اوقات ان کی مخالفت کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ آخر کار بلوچ قائدین نے پارٹی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور میر غوث بخش بزنجو کی قیادت میں پاکستان نیشنل پارٹی بنائی۔ بعد ازاں این ڈی پی کے صدر شیر باز مزاری جو پشتونوں کے کافی قریب سمجھے جاتے تھے نے بھی پارٹی چھوڑ دی۔ تب سے اب تک بلوچستان میں پشتونوں اور بلوچوں کی سیاسی پارٹیاں علیحدہ علیحدہ ہو گئیں۔

بلوچستان کے 26 اضلاع میں سے 8 یعنی ایک تہائی پشتون اضلاع ہیں جبکہ باقی ماندہ اضلاع میں بلوچ بستے ہیں۔ پشتونوں کو بلوچستان میں اپنی شناخت محسوس نہیں ہو پا رہی جسکی وجہ سے وہ شروع دن سے ہی مطالبات کے ذریعے اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ پہلے یہ مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان کے پشتونوں کو صوبہ سرحد کے ساتھ شامل کیا جائے۔ اس مطالبے کے لیے سرحد کے پشتون زیادہ پر جوش نہیں رہے اور نہ ہی مرکزی حکومت نے اس پر زیادہ غور کیا۔ عبدالصمد اچکزئی 1970ء میں پختون خواہ کے صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو کر آئے مگر انہوں نے کبھی بھی حکمران نیپ کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کی مخالفت ہی کرتے رہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پٹھانوں کو بلوچوں کے برابر نوکریوں میں حصہ دیا جائے اور یہ کہ صوبے کے دو بڑوں یعنی گورنر اور وزیر اعلیٰ میں سے ایک پٹھان ہونا چاہیے اور کابینہ میں بھی پشتونوں کو برابر کا حصہ دیا جائے۔ اس کے بعد ان کے سیاسی جانشین اور بیٹے محمود اچکزئی نے بھی اپنی سیاست انہیں مطالبات پر کی بلکہ وہ بلوچ مخالفت میں مرکزی حکومت سے بھی اتحاد کرتے رہے ہیں۔

پشتون اور بلوچ سیاست آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ متصادم بھی ہونے لگی۔ افغانستان میں نور محمد ترہ کئی کے انقلاب اور خاص طور پر روسی افواج کے افغانستان میں آنے کے بعد افغان مہاجرین نے پاکستان کا رُخ کیا تو قریباً دس لاکھ مہاجرین کو بلوچستان میں رکھا گیا۔ ان مہاجرین نے یہاں آکر جائیدادیں خریدیں کاروبار کیے حتیٰ کہ قومی شناختی کارڈ وغیرہ بنوا کر پاکستانی شہریت بھی حاصل کرلی۔ یہ مہاجرین بلوچوں اور پشتونوں کے درمیان ایک متنازعہ مسئلہ بنا دیئے گئے۔ پشتون سیاسی جماعتیں اوران کے قائدین ان پشتونوں کو بلوچستان کا حصہ منوانے پر اصرار کرنے لگے جبکہ بلوچ انہیں بلوچستان کے باشندے ماننے کے لیے تیار نہیں۔

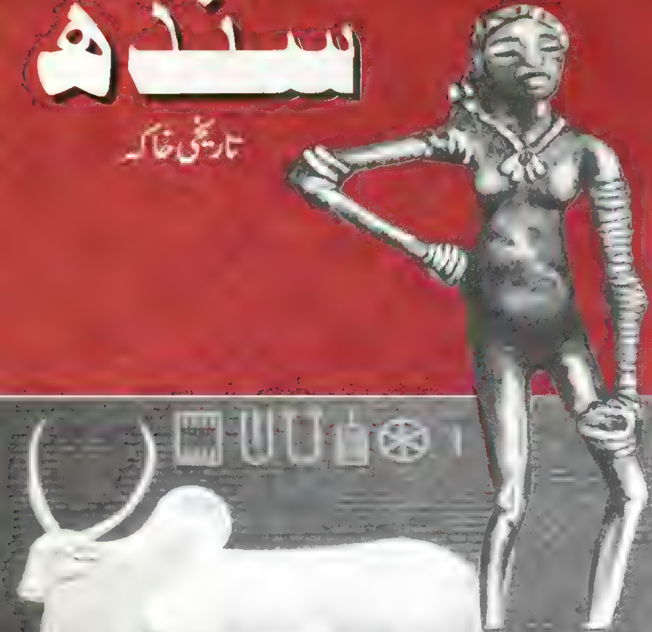
1992ء میں بلوچستان میں ایک زرعی کالج کی تعمیر کے لیے غیر ملکی امداد ملی۔ کالج کی تعمیر کے لیے پہلے بلوچ علاقہ منتخب کیا گیا۔ پھر اس کی بجائے پشتون علاقے میں تعمیر کے لئے جگہ تجویز کی گئی تو اختلاف کھل کر سامنے آگیا۔ بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے نوجوانوں نے زبردست احتجاج کیا، ہڑتالیں کی گئیں اور جلسے جلوس ہوئے۔ دوسری طرف سے پختون طلبا نے بھی ایسے ہی مظاہرے کیے۔ نتیجتاً کالج کی تعمیر نہ ہو سکی بلکہ وہ امداد ہی منسوخ ہو گئی۔

بلوچستان میں سرکاری زبان اُردو مقرر کیے جانے کے بارے میں بلوچوں کا موقف یہ ہے کہ وہ بلوچستان میں پشتو کو سرکاری زبان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جبکہ پشتونوں کا یہ مطالبہ تھا کہ اگر بلوچی کو سرکاری زبان بنایا جائے تو پشتو کو بھی ساتھ ہی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔

1981ء کی مردم شماری کے بعد پختونوں کو شدید اعتراضات پیدا ہو گئے تھے۔ان کا خیال یہ تھا کہ بلوچوں نے آبادی کا تناسب اپنے حق میں کرنے کے لیئے اپنی تعداد اصل سے کہیں زیادہ لکھوائی ہے۔اس مردم شماری میں بلوچ آبادی میں اضافہ کی شرح پاکستان بھر میں سب سے زیادہ تھی۔بلوچوں کا کہنا تھا کہ ان کی آبادی میں واقعی اس قدر اضافہ ہوا ہے اور یہ کہ آبادی کے تناسب سے بلوچ ہمیشہ بلوچستان کا اکثریتی حصہ رہے ہیں۔حال ہی میں سترہ سال کے بعد پاکستان میں مردم شماری کروائی گئی۔ اتنی دیر سے مردم شماری ہونے میں مرکزی حکومت کی نااہلی کے علاوہ سندھ میں سندھیوں اور مہاجروں کے مابین تضادات اور بلوچستان میں بلوچوں اور پشتونوں کے مابین تضادات کارفرما تھے۔

سندھ

تاریخی خاکہ



ساؤتھ ایشیاء پارٹنرشپ پاکستان

سندھ

ایک تاریخی خاکہ

انور چودھری

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان
حسیب میموریل ٹرسٹ بلڈنگ، ناصر آباد، 2 کلومیٹر رائیونڈ روڈ، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور
فون نمبر: 6-042-35311701-3,5 فیکس: 042-35311710 ای میل: info@sappk.org

نام کتاب: سندھ تاریخی خاکہ

تحریر: انور چودھری

ٹائیٹل: محبوب علی

کمپوزنگ: انجم شہزاد خان

اشاعت دوئم: جنوری 2014ء

تعداد 500

پرنٹر: جمال پرنٹرز، لاہور۔

ناشر: ساؤتھ ایشیاء پارٹنرشپ، پاکستان

آواز

VOICE & ACCOUNTABILITY PROGRAMME

آواز اور جوابدہی پروگرام

یہ دستاویز ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان نے انسانی بھلائی کے لیے ترتیب دی ہے۔

مندرجات

پیش لفظ

"سندھ تاریخی خاکہ" ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان کے شعبہ برائے ترقیاتی معلومات کی طرف سے شائع کیے جانے والے صوبائی کتابچوں (ہینڈ بکس) کے سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ پنجاب اور بلوچستان پر کتابچے پہلے ہی شائع کیے جا چکے ہیں اور صوبہِ سرحد پر کتابچہ بھی جلد ہی متوقع ہے۔ ایس اے پی، پاکستان نے صوبائی ہینڈ بکس تیار اور شائع کرنے کا آغاز کیا تو اس کی توقعات خاصی محدود تھیں۔ بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترقیاتی کارکنوں کو پاکستان کے چاروں صوبوں کے تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی عوامل سے آگاہ کیا جا سکے۔ توقع یہ تھی کہ اس طرح نہ صرف انہیں اپنے کام میں خاطر خواہ مدد ملے گی بلکہ صوبائی تعصّبات بھی دور ہوں گے۔ لیکن پنجاب اور بلوچستان ہینڈ بکس کو جو پذیرائی ملی وہ توقعات سے بڑھ کر تھی۔

ان کتابچوں میں تاریخ کو پیش کرنے کے جس انداز کو اپنایا گیا اس کی خاص طور پر تعریف کی گئی۔ کچھ لوگوں کے خیال میں غالباً پہلی مرتبہ پاکستان کی صوبائی تاریخ معروضی انداز میں تحریر کی گئی اور ایک نئی ریت ڈالی گئی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ایک بہت بڑی کمی دور کر دی گئی کیونکہ اس سے پہلے لکھی جانے والی تاریخ عموماً معروضیت سے عاری اور کسی خاص فرد یا گروہ کی بے جا تعریف یا تنقید پر مبنی ہے۔ پہلی مرتبہ ایسی تاریخ منظر عام پر لائی گئی جس کی تصدیق غیر متنازع ذرائع سے ہوتی ہے اور جس کی عکاسی اب تک اس صوبے کے رسم و رواج میں نظر آتی ہے۔

"سندھ تاریخی جائزہ" بھی اسی قسم کی کوشش ہے۔ کسی قسم کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر حقیقت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت سی ایسی باتوں کو جھٹلایا گیا ہے جو عوامی رائے کا حصہ بن چکی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑیوں کی طرح "سندھ تاریخی خاکہ" کی معروضیت ہی اس کی طاقت ہے۔ متن کی صحت پر خاص دھیان دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ابہام نہ پیدا کیا جائے۔

اس کتابچے کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ سندھ کے نامور صوفیاء اور اولیاء کرام کا مختصر تعارف ضرور کروایا گیا ہے۔ ان ہستیوں کا پیغام جس کامیابی سے پھیلا اور جس عزت واحترام کا حقدار انہیں اب تک ٹھہرایا جاتا ہے وہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ سندھ کا کلچر بنیادی طور پر سیکولر رہا ہے۔ اسی طرح تاریخ کے کسی بھی کردار کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ہر کردار سے انصاف کیا گیا ہے اور مذہب یا کسی دوسری بنیاد پر اس سے فرق نہیں برتا گیا۔

اس کتاب کا ابتدائی مسودہ سندھ کے مشہور اہلِ قلم اور دانشور جناب ابراہیم جویو نے فراہم کیا جس کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں۔ ان کے مسودے کو ادارہ اپنی پالیسی کی وجہ سے شائع نہیں کر سکا لیکن اس سے اسی طرح اقتباس کیا گیا ہے جیسے سندھ کی تاریخ پر دستیاب دوسرے طبع شدہ مواد سے۔ اس کتابچے کو تحریر کرنے کی ذمہ داری جناب انور چودھری نے انتہائی خوبی سے نبھائی۔ اس سے پہلے شائع ہونے والی دونوں ہینڈ بکس بھی انہوں نے ہی تحریر کی تھیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ کتابچہ بھی اس کامیابی سے ہمکنار ہوگا جو اس سلسلے کی پہلی دو کوششوں کا مقدر بنی۔

محمد تحسین

ایگزیکٹیو ڈائریکٹر

ایس اے پی، پاکستان

قدیم تاریخ

جب آریہ لوگ ہزاروں برس پہلے اس سرزمین پر پہنچے تو انہوں نے اس وادی کا نام سندھ رکھا۔ اصل میں ان کی زبان میں سندھو 'دریا' کو کہا جاتا ہے یہاں بہتے ہوئے عظیم سندھو کے حوالے سے ہی انہوں نے اس وادی کو سندھ کا نام دیا۔ آج بھی موجودہ پاکستان کی دھرتی پر پھیلی ہوئی قدیم تہذیب جیسے مہر گڑھ (بلوچستان)، موہنجو داڑو (سندھ) اور ہڑپہ (پنجاب) وغیرہ کو وادی سندھ کی تہذیب ہی کہا جاتا ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بعد ازاں سندھ کو ایرانیوں نے ہند کہا یونانیوں نے اند کہا اور رومن سے ہوتا ہوا لفظ 'سندھ' انگریزی زبان میں اندیا سے انڈیا ہو گیا۔ بہر حال تاریخ دانوں نے قدیم ہندوستان کے اس علاقے کو وادی سندھ لکھا جبکہ باقی ماندہ کو ہندیا ہندوستان کہا۔ دنیا کی اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ چار تہذیبیں قدیم ترین ہیں : مصر کی تہذیب ؛ نینوا کی تہذیب ؛ چین کی تہذیب ؛ اور وادی سندھ کی تہذیب۔

وادی سندھ کی تہذیب سندھ کی جغرافیائی حدود سے باہر کافی دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ سندھ میں اس تہذیب کے قدیم ترین آثار ان جگہوں سے ملے ہیں : موہنجو داڑو جو لاڑکانہ کے نزدیک ہے ؛ آمری سن ؛ کوٹ ڈیجی جو خیر پور

کے نزدیک ہے ؛ کاہو جو داڑو جو میر پور خاص کے قریب ہے ؛ سون چڑی ؛ جھکر ؛ مانک تارو ؛ اور گاڑھو بھڑو۔ یہ سب سندھ کے قدیم ترین شہر تھے جن کا عروج پانچ ہزار برس قبل مسیح سے دو ہزار برس قبل مسیح تک رہا۔ ان میں سے موہنجوداڑو نے دنیا کو متحیر کیا۔

وادی سندھ کی قدیم تہذیب پر ابھی تحقیق ہو رہی ہے مگر اب تک کی معلومات کے مطابق یہ تہذیب ہزاروں برس کے لمبے عہد پر محیط ہے۔ سندھ میں اس تہذیب کے جو آثار ملے ہیں ان کو تاریخی ادوار کے حساب سے مختلف حصوں میں بانٹ کر دیکھا جاتا ہے۔ یہ تقسیم صرف وقت کی ہے جبکہ مجموعی طور پر یہ سارے عہد ایک ہی تہذیب، یعنی وادی سندھ کی تہذیب، کی ارتقائی منزلیں ہیں۔

آمری تہذیب: 3770 ق م سے 3370 ق م

قدیم مہر گڑھ کی تہذیب (6500 ق م) کے لوگ دریائے بولان کے ساتھ ساتھ آباد ہوئے جو اس وقت بہتا ہوا منچھر جھیل میں آتا تھا اور پھر وہاں سے نکل کر دریائے سندھ میں جا گرتا تھا۔ گرمیوں میں منچھر جھیل بھر جاتی جبکہ سردیوں میں اس جھیل کا پانی آگے بہہ جاتا۔ اس طرح سردیوں میں بھی کاشتکاری کے لیے پانی میسر ہوتا۔ ان لوگوں نے برساتی نالوں پر بند باندھ کر بھی اس کے پانی کو کاشتکاری کے لیے استعمال کیا۔ وہ سندھ کے سیلابی پانی کو بھی کاشتکاری کے لیے استعمال میں لائے۔ یوں سندھ کے دونوں کناروں پر وہ تہذیب پروان چڑھنا شروع ہوئی جو آمری تہذیب کہلائی۔ اس تہذیب کے

آثار نہ صرف سندھ کے دونوں کناروں پر ملے ہیں بلکہ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کے کناروں پر بھی ملے ہیں۔ یہ تہذیب اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے موہنجوداڑو (سندھ) اور ہڑپہ (پنجاب) سے وسعت میں کافی کم تھی۔

کوٹ ڈیجی تہذیب: 3370 ق م سے 2500 ق م

یہ تہذیب آمری تہذیب کے چار پانچ سو برس بعد اس کی ہی ارتقائی شکل کے طور پر ظہور پذیر ہوئی اور پھر موہنجوداڑو تہذیب میں مدغم ہو گئی۔

موہنجوداڑو تہذیب: 2350 ق م سے 1650 ق م

مہر گڑھ میں جو تہذیب پروان چڑھی اُس کو عروج موہنجوداڑو اور ہڑپہ تہذیب کی شکل میں حاصل ہوا۔ یہ مصر اور میسوپوٹیمیا کی تہذیبوں کی ہم عصر تھی مگر وسعت میں ان تہذیبوں سے دس گنا سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ اس تہذیب کا پھیلاؤ افغانستان، ایرانی مکران، گجرات کاٹھیاواڑ اور دہلی کے نزدیک عالمگیر پور تک تھا۔ اس تہذیب کے بڑے شہر یہ تھے: لوتھل (کاٹھیاواڑ)؛ موہنجوداڑو (سندھ)؛ ہڑپہ (پنجاب)؛ اور کالی بنگاں (بیکانیر، راجستھان)۔ یہ تمام شہر اپنے نقشے، طرزِ تعمیر اور اینٹوں کے سائز کے حساب سے ایک جیسے ہیں۔ ان سے ملنے والے وزن اور ناپ کے پیمانے بھی ایک طرح کے ہیں۔ یہ تہذیب زرعی پیداوار کی مرہون منت تھی جس کی بناء پر یہ شہر بسائے گئے۔ اس کے علاوہ درختوں کی پیداوار اتنی زیادہ تھی کہ پکی ہوئی اینٹوں کی یہ تہذیب پروان چڑھی۔

اس کے بعد کے ادوار کی تہذیبوں میں جھکر تہذیب کا نام آتا ہے جس کا زمانہ 1750 ق م سے 1300 ق م طے کیا گیا ہے اور جان گڑھ کے آثار

جن کی عمر 1300ق م سے 950 ق م طے کی گئی ہے۔

دنیا کی قدیم کتاب "رگ وید" دریائے سندھ کے کناروں پر لکھی گئی۔ اس میں سات دریاؤں کا ذکر بھی ملتا ہے جن کے آج کل نام یہ ہیں : ستلج، بیاس، راوی، جہلم، چناب، کابل اور سندھ۔ دوسری کتاب "رامائن" ہے جس میں پانڈوؤں اور کوروؤں کے یدھ کا احوال ملتا ہے۔ سندھ کے راجہ جئدراتھ کا ذکر بھی تفصیل سے ہے۔ پارسیوں کی مقدس کتاب "زنداوستا" میں مہران ندی کا ذکر ملتا ہے جو دراصل سندھو ہے۔ اس کی پارسی شاعری میں دریائے سندھ کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا گیا ہے :

(ترجمہ)

سندھ کے محبت بھرے دل کی وادی میں مہران رواں ہے
گویا کہ معشوق کے وصال والے وعدہ کی خوشی کا منظر ہے۔
مصر کے نیل نے شرمندگی سے اپنا چہرہ نیر میں ڈھانپ لیا
اور مہران کو دیکھ کر آبِ حیات بھی بحر خفا میں غوطہ زن ہے۔

سندھ جغرافیائی طور پر بحیرہِ عرب کے مشرق میں واقع ہے اور مغرب میں بھی اس کے ساتھ کئی بندرگاہیں بناتا ہے۔ ان میں سب سے بڑی بندرگاہ کراچی کی ہے جو آبادی اور رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ اس کے علاوہ کیٹی بندر ہے جہاں سے مال آتا اور جاتا ہے۔ قدیم بندرگاہوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں دیبل، ٹھٹھہ، سندھو بندر اور شاہ بندر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سندھ کے شمال میں بلوچستان کا صوبہ واقع ہے جبکہ مشرق

میں پنجاب اور جنوب میں ہندوستان کا صوبہ راجستھان ہے۔

دریائے سندھ اس سرزمین کا واحد دریا ہے اور اس کے قرب وجوار میں ہی قدیم تہذیب پروان چڑھی ہے۔ یہ دریا تبت کے پہاڑوں سے نکل کر تقریباً 1100 میل تک کشمیر، صوبہ سرحد اور پنجاب سے گزرتا ہوا مٹھن کوٹ کے مقام پر پنجاب کے باقی پانچ دریاؤں کو اپنے اندر سموتا ہوا کشمور کے مقام پر سندھ میں داخل ہوتا ہے اور پھر جنوب مغرب کی طرف 700 میل بہہ کر کیٹی بندر کے نزدیک ڈیلٹا بناتا ہوا بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ یہ سمندر میں گیارہ دہانے بناتا ہے جن میں سے کچھ جہازرانی کے قابل ہیں۔ قدیم زمانے میں دریائے سندھ کے ذریعے تجارت کی جاتی تھی اور یہ دریا ہی اس علاقے کو سمندر سے ملاتا تھا۔

وادیِ سندھ کی قدیم ترین تاریخ کے بارے میں محققین نے قدیم آثار اور تحریروں سے اندازے اخذ کر کے جو تاریخ بنائی ہے اُس کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ آریاؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ وسط ایشیا سے دو ہزار سال قبل مسیح میں یہاں پہنچے جس وقت وادیِ سندھ کی موہنجوداڑو تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آریاؤں نے اُس عظیم تہذیب کو نیست و نابود کر دیا۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ آریاؤں کی آمد کے بارے میں قیاس محض افسانہ طرازی ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو وادی سندھ میں قدیم زمانوں سے ہی باہر کے قبائل آتے رہے ہیں اور مقامی آبادی کے ساتھ لڑ بھڑ کر انہیں مغلوب کرتے رہے یا ان میں جذب ہوتے رہے ہیں۔

سنسکرت میں لکھی گئی قدیم ترین کتاب "رگ وید" کو آریاؤں کی

کتاب کہا جاتا ہے اور اس میں آریاؤں اور مقامی باشندوں کی لڑائیوں کا ذکر جابجا موجودہ ہے۔ اس کتاب میں مقامی باشندوں کو حقارت اور نفرت کے ناموں سے پکارا گیا ہے۔ آریاؤں کی مقامی باشندوں سے لڑائیاں سپت سندھو کے مقام پر ہوئیں جو آج کا پنجاب ہے۔ بعد ازاں یہ لوگ گنگا جمنا کی وادی کی طرف منتقل ہو گئے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابتدائی طور پر موجودہ سندھ میں ان آریاؤں کے بہت زیادہ اثرات نہیں ہوئے۔ مگر بعد کے ادوار میں یہ اثرات بڑھتے چلے گئے کیونکہ ایران میں بھی انہیں آریاؤں نے ایک بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی اور چھٹی صدی قبل مسیح میں سندھ کو بھی زیر نگین کر لیا۔ ایرانی بادشاہ دارا (522ق م) کی سلطنت کا ایک صوبہ ہندوش تھا جو موجودہ سندھ اور پنجاب پر مشتمل تھا۔

327ق م میں یونانیوں نے حملہ کر کے ایرانی سلطنت کو تہہ وبالا کر دیا اور یونانی فوج سکندر اعظم کی قیادت میں فتوحات کرتی ہوئی سندھ اور پنجاب تک آ گئی۔ سکندر ٹیکسلا سے واپس یونان جاتے ہوئے راستے میں ہلاک ہو گیا۔ اس کی فوج سندھ اور مکران کے راستے سے واپس گئی اور وہ اپنے پیچھے پنجاب اور سندھ پر یونانی حاکم چھوڑ گئی۔ سندھ پر یونانیوں کی حکومت لمبا عرصہ نہیں چلی۔ قبل مسیح کی آخری صدیوں میں سندھ میں بدھ مت کا غلبہ ہونا شروع ہوا اور ٹیکسلا میں موریہ خاندان نے یونانیوں کو نکال کر اپنی حکومت قائم کی۔

سندھ قریباً ایک صدی (321 ق م سے 187 ق م) تک موریہ سلطنت کے ماتحت رہا۔ موریہ سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت اشوکِ اعظم کے زمانے میں ملی۔ اسی زمانے میں بدھ مت کو بھی عروج حاصل ہوا۔ سندھ

میں بھی بدھ مت پھیل گیا اور آنے والی چند صدیوں تک اس کا سندھ پر خاصا گہرا اثر رہا۔ اشوکا کے میناروں کے آثار سندھ میں اب بھی ملتے ہیں۔

سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں وسطی ایشیاء کے کشان اور ساکا قبائل یہاں حکومتیں بناتے رہے۔ ساکاؤں کی ایک شاخ نے، جو سیتان تک آچکی تھی، اپنی حکومت کو سندھ و گجرات تک پھیلا دیا۔ ان قبائل کی سندھ پر 400ء تک حکومت جاری رہی۔ اگلی صدی میں سندھ پھر سے ایران کے ساسانی بادشاہوں کی سلطنت کا حصہ بنالیا گیا۔

پانچویں صدی میں ہی چین کے سرحدی علاقوں میں بسنے والے ہن قبائل نے وادیٔ سندھ میں آکر مقامی حکومتیں تشکیل دیں۔ ہن حکمرانوں نے بدھ مت کی مخالفت کی اور برہمن ازم کی حوصلہ افزائی کی۔ گو کہ بدھ مت کو نقصان پہنچا مگر وہ بالکل ختم نہیں ہوا اور عوام میں موجود رہا۔ البتہ برہمن ازم نے، جسے بدھ مت نے آکر پیچھے دھکیل دیا تھا، پھر سے زور پکڑنا شروع کر دیا اور اس دور میں اس کا احیاء ہوا۔

پانچویں صدی کے آخری نصف میں سندھ پر رائے گھرانے کی حکمرانی قائم ہوئی۔ رائے خاندان کے پانچ حکمرانوں نے کل 137 برس سندھ پر حکمرانی کی: رائے دیواجی، رائے سہارس، رائے سہاسی، رائے سہارس دوم اور رائے سہاسی دوم۔ جب رائے سہاسی دوم سندھ کا حکمران تھا تو اس کے دربار میں ایک برہمن نوجوان چچ عہدہ حاصل کر کے داخل ہوا اور اپنی ذہانت سے ترقی کرتا ہوا وزیر بن گیا۔ رائے سہاسی کی کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا اس کی ۲۱۱

بیماری کے وقت چچ کو نیا حکمران بنانے کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ کیونکہ پہلے ہی چچ اور رانی میں قریبی تعلقات قائم ہو چکے تھے، اس لیے رانی نے اسے حکمران بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور اسے رائے سہاسی کا جانشین مقرر کروادیا۔ یوں چچ سندھ کا حکمران بنا۔ چچ ایک ذہین اور پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے اپنادارالخلافہ ارور (الور) کو بنایا۔ اس وقت سندھ کی ریاست موجودہ سندھ سے کافی بڑی تھی۔ راجہ چچ نے اپنی حکمتِ عملی اور فتوحات سے اس میں کافی وسعت پیدا کر کے اپنی سرحد کو ملتان اور سیوی (سبی) تک پھیلادیا۔

اس زمانے میں حکمرانی کرنا کھشتریوں کا کام تھا جبکہ برہمن مذہبی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ جب برہمن چچ راجہ بنا تو رائے خاندان کے مقامی حکمرانوں نے، جو راجہ رائے سہاسی کے رشتے دار تھے، بغاوتیں کیں اور لڑائیاں بھی کیں مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ راجہ چچ نے سندھ پر چالیس برس حکومت کی اور وہ 660ء میں فوت ہوا۔ یہ دور سندھ کی تاریخ کا اہم دور اس لیے بھی سمجھا جاتا ہے کہ اس دور سے سندھ کی تاریخ باقاعدہ تحریری حالت میں دستیاب ہونا شروع ہوئی۔ چچ کے بعد اس کا بھائی راجہ چندر سندھ کا حکمران بنا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا رجحان بدھ مت کی طرف تھا۔ وہ سات برس حکومت کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔

668ء میں راجہ چندر کی وفات کے بعد سندھ کی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور ارور (الور) کے تخت پر چچ کا چھوٹا بیٹا راجہ داہر بیٹھ گیا جبکہ برہمن آباد کا حاکم راجہ چندر کا بیٹا راج بنا مگر وہ ایک سال بعد ہی فوت ہو گیا۔ پھر

برہمن آباد کا حاکم راجہ داہر کا بڑا بھائی دہر سنگھ بنا۔ کچھ عرصہ حکومت کرنے کے بعد دہر سنگھ بھی فوت ہو گیا تو راجہ داہر پورے سندھ کا حاکم بن گیا۔

راجہ داہر کی حکومت قریباً پوری وادی سندھ پر تھی جو کشمیر، قنوج اور افغانستان پر مشتمل تھی۔ بلاذری کی کتاب "فتوح البلدان" کے مطابق قلات کا علاقہ بھی سندھ کے حکمران راجہ داہر کے ماتحت تھا۔ راجہ داہر نے 43 برس سندھ پر حکمرانی کی اور اس کا اقتدار محمد بن قاسم کی سرکردگی میں عربوں کی سندھ میں آمد سے ختم ہوا۔

ساتویں صدی عیسوی میں سندھ کو سیاسی استحکام نہیں مل سکا بلکہ متضاد مفادات کے ٹکراؤ سے اندرونی خلفشار اور بے چینی کی حالت چلتی رہی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ راجہ چچ برہمن ہونے کی وجہ سے سندھ کے مقامی حکمرانوں کو قابل قبول نہیں تھا۔ رائے سہاسی دوم کے بھائی مہرتھ نے چچ کے خلاف بغاوت کر دی۔ گو کہ چچ نے مہرتھ اور دیگر باغی مقامی حکمرانوں پر فتح حاصل کر لی مگر تضادات موجود رہے اور وقتاً فوقتاً اپنا اظہار کرتے رہے۔ اندرونی خلفشار اور عدمِ استحکام کی دوسری وجہ برہمن ازم اور بدھ مت کا تضاد تھا۔ عوام کی سطح پر بدھ مت کافی مضبوط تھا جبکہ حکمران اشرافیہ برہمنوں پر مشتمل تھی۔ یہی تضادات سندھ میں عربوں کی کامیابی کی وجہ بھی بنے۔ کتابوں میں ایسے واقعات کافی تعداد میں درج ہیں جن کے مطابق راجہ داہر کے افسروں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے عربوں کا ساتھ دیا۔

سندھ میں عرب حکمران

سندھ کی تاریخ کے بارے میں زیادہ کتابیں عربوں کی آمد کے بعد لکھی گئیں۔ ان میں البلاذری کی کتاب "فتوح البلدان" میں سندھ میں عربوں کی فتح کے بارے میں حقائق دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ احمد بن داؤد اور طبری کی کتابیں ہیں جن میں سندھ میں عربوں کی فتح کا کسی حد تک ذکر موجود ہے۔ مگر سب سے اہم کتاب "چچ نامہ" ہے جس میں عربوں کی آمد کے بارے میں کافی تفصیل موجود ہے۔ یہ کتاب عربی میں لکھی گئی مگر اس کا فارسی ترجمہ ہی دستیاب ہو سکا جو بعد ازاں تاریخ کی مختلف کتابوں کا حوالہ بنا۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں کئی کتابیں سندھ کے بارے میں لکھی گئیں۔ جدید مورخین نے جہاں پرانی کتابوں سے اقتباس کیا وہاں ان کے بارے میں تنقیدی رویہ بھی اختیار کیا۔

سندھ میں عربوں کی حکومت کا دور محمد بن قاسم اور اس کی فوج کی آمد کے بعد شروع ہو اگر عربوں کی آمد اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے دور میں بحرین کے گورنر نے ایک مہم ہند روانہ کی جو ناکام ہوئی۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کو اس مہم کا پتا چلا تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے حکیم بن جبلہ کو ہند اور سندھ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا جس نے واپس آکر

یہ رپورٹ دی : ”وہاں کا پانی میلا، پھل کھٹے، زمین پتھریلی اور مٹی شوریدہ ہے اور باشندے بہادر ہیں۔ اگر تھوڑا لشکر جائے گا تو تباہ ہو گا اور زیادہ جائے گا تو بھوکا مر جائے گا۔“ حکیم بن جبلہ کے اس بیان کے بعد حضرت عثمانؓ نے ہند کو مہم روانہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ حضرت علیؓ کے دور میں بھی ایک مہم روانہ کی گئی جو ناکام ہوئی۔ امیر معاویہ کے دور میں بھی ایسی ناکام مہم کا تذکرہ ملتا ہے۔ بہرحال عرب مورخین کے مطابق امیر معاویہ کے دور میں مکران کچھ عرصہ اسلامی سلطنت کا حصہ رہا۔

بنو امیہ کے دور کا حجاج بن یوسف ایک ظالم اور جابر منتظم کے طور پر تاریخ میں مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حجاج کے دو سپہ سالار عبید اللہ اور بدیل سندھ کی سرحدی مہموں میں مارے گئے تھے جن کا حجاج کو بڑا دکھ تھا۔ اس کے علاوہ بحیرۂ عرب میں بحری قزاقوں نے عربوں کے بحری قافلوں کو لوٹ لیا تھا اور حجاج نے راجہ داہر سے اس کی باز پرس بھی کی تھی گو راجہ داہر کے پاس کسی قسم کی بحری طاقت ہونے کی تاریخ میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔

معاملات جو بھی تھے بہر حال حجاج بن یوسف سندھ کو فتح کرنا چاہتا تھا اور جب اس نے اپنے پروگرام سے خلیفہ ولید بن عبدالمالک کو آگاہ کیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سندھ بہت دور ہے اور اخراجات بہت زیادہ ہوں گے۔ حجاج اپنی بات پر بضد رہا اور یہ شرط پیش کی کہ جنگی مہم پر جو خرچ آئے گا اس سے دوگنی بلکہ سہ گنی رقم بیت المال میں جمع کروادی جائے گی۔ تب خلیفہ نے سندھ پر حملے کی اجازت دے دی۔

حجاج بن یوسف نے اپنے چچازاد اور داماد محمد بن قاسم کو عرب فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے سندھ پر یلغار کے لیے بھیجا۔ محمد بن قاسم سب سے پہلے مکران پہنچا اور یہاں سے مقامی بستیوں کو زیر کرتا ہوا وہ دیبل پہنچا جو اس زمانے میں مشہور اور بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں پر عرب فوج کی پہلی بڑی جنگ ہوئی جس میں انہوں نے وہ منجنیقیں بھی استعمال کیں جو وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ کئی مہینوں کے محاصرے اور جنگ کے نتیجے میں عرب فوج دیبل کے مقامی حکمران کی فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی۔ دیبل کی سندھی فوج کو گو کہ شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کے فوجی بہت بہادری سے لڑے۔

یہاں سے محمد بن قاسم کی فوج آگے بڑھ کر نیرون (آج کا حیدر آباد) پہنچی۔ یہاں کا مقامی حاکم بدھ مت کا پیروکار تھا۔ اس نے محمد بن قاسم سے سازباز کر لی اور عرب فوج کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب عرب فوج نے سیوستان (سہون) کا رخ کیا اور اس کو راستہ دکھانے والا نیرون کا حاکم بھدر کن اور اس کی فوج تھی۔ یہاں کا حاکم بج رائے تھا جو راجہ داہر کا چچازاد بھائی تھا۔ بج رائے اس جنگ سے جان بچا کر بھاگ گیا اور سہون پر محمد بن قاسم کا قبضہ ہو گیا۔

عرب فوج اب سیوی (سبی) کی طرف بڑھی۔ راستے میں بدھیا نامی مقام کے حاکم کاکا نے، جو بدھ تھا، نہ صرف محمد بن قاسم کی اطاعت کی بلکہ اس کی پوری مدد کی اور اس کی فوج کو غلہ اور گھاس وغیرہ بھی فراہم کیے۔ یہاں سے محمد بن قاسم سیوی پہنچا جہاں بج رائے پناہ گزین تھا۔ سیوی کا قلعہ بھی فتح ہوا اور بج رائے مارا گیا اور عوام نے عرب فوج کو خوش آمدید کہا۔

محمد بن قاسم آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر اسے حجاج کا خط ملا کہ واپس جا کر داہر کی راجدھانی کی طرف بڑھو۔ سو عرب فوج نے الور کی طرف پیش قدمی کی۔ راستے میں محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ بدھ مت کے ماننے والے اور نچلی ذات کے ہندو عوام بھی شامل ہو گئے۔ جب یہ فوج بیٹ کے علاقے میں پہنچی تو وہاں کا حاکم جو کو بن وسایو اور اس کے بیس ٹھاکر بھی اس کے ساتھ ہو لیے اور انہوں نے دریا پار کرنے کے لیے عرب فوج کو کشتیاں بھی فراہم کیں۔ جون 712ء کو راجہ داہر اور عرب افواج کے درمیان جنگ ہوئی جس میں راجہ داہر کو شکست ہوئی اور وہ بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

الور کی فتح کے بعد عرب افواج برہمن آباد کی طرف بڑھیں جو سندھ کا دوسرا دارالخلافہ تھا۔ یہاں پر راجہ داہر کا بیٹا جیسینہ جنگ کی تیاری کر رہا تھا جو بعد ازاں شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ محمد بن قاسم آخر کار ملتان پہنچا اور اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دو مہینوں تک ملتان کے شہریوں نے عرب فوج کے محاصرے کا مقابلہ کیا مگر عربوں نے ان کا پانی بند کر دیا جس کی وجہ سے شہریوں نے عرب فوج کی اطاعت قبول کر لی۔ محمد بن قاسم کی یہ جنگی مہم 715ء تک جاری رہی اور تمام سندھ، جو موجودہ سندھ سے کہیں بڑا تھا، عربوں کے قبضہ میں آگیا۔

عرب فوج اس شرط پر سندھ روانہ کی گئی تھی کہ وہ اس جنگی مہم کے اخراجات سے کہیں زیادہ سرکاری خزانے میں جمع کروائے گی۔ اس دوران اس فوج نے جہاں بھی فتح حاصل کی بے شمار مالِ غنیمت لوٹا اور شکست خوردہ فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کو قیدی بنایا۔ صرف ملتان شہر میں قریباً چھ ہزار مقامی فوجی

مارے گئے اور ان کے بیوی بچوں کو قیدی بنالیا گیا۔ لوٹ کا مال جمع ہوا اور تمام سپاہیوں میں تقسیم ہوا۔ ہر سپاہی کے حصہ میں سو سو درہم آئے اور ہر سوار کو چار سو درہم ملے۔ عورتیں یقیناً لونڈیاں بنالی گئی ہوں گی اور قبضے میں لیے گئے جانور اس کے علاوہ ہوں گے۔ صرف ایک مندر سے محمد بن قاسم کو 203 من سونا اور تیرہ ہزار دو سو من طلا حاصل ہوا۔ محمد بن قاسم کو سرکاری خزانے سے سندھ کی مہم کے لیے چھ کروڑ درہم دیے گئے تھے اور اس نے بارہ کروڑ درہم کی رقم واپس خزانے میں جمع کروائی۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں کو سندھ سے اس قدر زیادہ دولت حاصل ہوئی کہ عرب میں اس کی بہت دھوم مچی۔ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کا کٹا ہوا سر اور اس کی دو بیٹیوں کو بھی خلیفہ کی خدمت میں روانہ کیا۔

عربوں کی فتح سندھ کو اسلام کی فتح قرار دیا جاتا ہے جبکہ یہ جنگ خالص سیاسی نوعیت کی تھی اور اس میں معاشی مفادات کا بہت عمل دخل تھا۔ یہ مذہبی بنیادوں پر نہیں لڑی گئی تھی اور محمد بن قاسم نے مذہب کو جنگی مسئلہ ہرگز نہیں بنایا تھا۔ تمام وہ غیر مسلم جو راجہ داہر کی مخالفت میں اس کے ساتھ مل سکتے تھے اور فائدے دے سکتے تھے اس نے اپنے ساتھ ملائے اور انہیں مذہب تبدیل کرنے کے لیے نہیں کہا۔ ایسے واقعات کا بھی پتا چلا ہے کہ محمد بن قاسم نے مفتوح عوام کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی اجازت دی اور ایسا کرنے کے لیے اُسے حجاج نے کہا تھا۔

محمد بن قاسم کی وادیٔ سندھ میں جنگی مہمات جاری تھیں کہ 714ء میں حجاج بن یوسف کا انتقال ہو گیا۔ حجاج ایک انتہائی ظالم اور سفاک حکمران تھا

اوراس میں اقتدار کی خواہش اتنی زیادہ تھی کہ وہ سلیمان بن عبدالملک کو ولی عہد کے منصب سے ہٹا کر اس جگہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو لانا چاہتا تھا۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے سیاسی اختلافات نے اُس وقت اپنا رنگ دکھایا جب حجاج کے ایک برس بعد ہی خلیفہ بھی فوت ہو گیا اور سلمان بن عبدالملک نیا خلیفہ بنا۔ اس نے حجاج کے جرنیلوں کو معزول کر دیا اور یہی حال اس نے محمد بن قاسم کے ساتھ بھی کیا اور حجاج کی سفاکی کے انتقام نے اس نوجوان جرنیل کو موت کے انجام تک پہنچایا۔

محمد بن قاسم کے بعد سندھ کے مختلف علاقے پھر خود مختار ہو گئے۔ نئے خلیفہ سلمان بن عبدالملک نے حبیب بن مہلب کو سندھ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ نئے حاکم نے پھر راجہ داہر کے جانشینوں سے لڑ کر ارور پر قبضہ کیا۔ اگلے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے حبیب بن مہلب کو بد دیانتی کے جرم میں معزول کر کے قید میں ڈال دیا اور عمر بن مسلم کو سندھ کا نیا والی مقرر کیا۔ خلیفہ کی ایماء پر اس نے سندھ کے مقامی سرداروں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ مسلمان ہونے کے بعد ان کی حاکمیت قائم رکھی جائے گی اور انہیں وہی درجہ دیا جائے گا جو مسلمان حاکم کا ہوتا ہے۔ چنانچہ راجہ داہر کے بیٹوں سمیت بہت سے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا۔

بلاذری کے مطابق عمر بن عبدالعزیز کے بعد آنے والے خلفاء نے بد عہدی کی اور سندھ کے نو مسلم سرداروں پر جزیہ نافذ کر دیا۔ نئے اموی گورنر جنید بن عبدالرحمٰن نے راجہ داہر کے بیٹوں کے خلاف لشکر کشی کی اور اس

کے علاوہ گجرات اور مارواڑ تک جا کر لوٹ مار مچائی۔ اس نے اس قدر مال لوٹا کہ سب کا حصہ ادا کر دینے کے بعد بھی اس کے پاس چار کروڑ درہم بچ رہے۔ جنید نے اس جنگی مہم کے نتیجے میں خزانے میں آٹھ کروڑ درہم جمع کروائے۔ اس کے چلے جانے کے بعد پورے سندھ میں عربوں کے خلاف بغاوت کی آگ پھیل گئی۔ بلاذری کہتا ہے کہ "ہند کے اکثر علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔" جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان میں سے اکثر پھر منحرف ہو گئے۔ 750ء تک بنو امیہ کا دور رہا۔ اس دوران یہاں جو بھی حاکم مقرر کر کے بھیجا گیا وہ مقامی سرداروں سے برسرِ پیکار رہا۔

750ء میں عرب میں امویوں کا تختہ الٹنے کے بعد خلافت عباسیوں نے سنبھال لی۔ سندھ میں عباسی خلافت کی جانب سے موسیٰ بن کعب کو لشکر دے کر بھیجا گیا جس نے اموی گورنر کو مقابلے کے بعد مار دیا۔ کئی اور اموی افسر بھی مارے گئے جبکہ باقی نکال باہر کیے گئے۔ اس کے بعد نویں صدی عیسوی تک یہاں عرب خلافت سے مقرر ہو کر حاکم آتے رہے لیکن کوئی بھی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ سندھ میں عربوں کی حاکمیت 1023ء تک چلی۔

مقامی حکمران خاندان

1024ء میں سندھ میں غزنوی حکمران آئے۔ دراصل محمود غزنوی کے حملے تسلسل سے لاہور اور ملتان پر ہوتے رہے۔ ان حملوں میں وہ گجرات (کاٹھیاوار) تک فتوحات کرتا ہوا گیا اور وہاں سے واپسی پر سندھ سے گزرتے ہوئے اس نے کئی مقامی حکمرانوں پر بھی حملے کیے۔ تاریخ کی کتابوں میں ایسے کئی واقعات درج ہیں جن کے مطابق مقامی سندھی عوام نے غزنوی کے حملوں کی مدافعت کی یا پھر غزنوی فوج پر خفیہ یلغاریں کر کے اور چھاپے مار کر اسے نقصان پہنچایا اور اس کا مال لوٹا۔ بے شک ان حالات میں مقامی سندھیوں کو بھی بے شمار جانوں کی قربانی دینا پڑی مگر اس دور کی مدافعتی جنگوں میں مقامی سردار بڑھ چڑھ کر سامنے آئے۔ سچل سرمست نے اسی دور کے حالات کے بارے میں کہا ہے :

شاہ محمود دا مال لٹیو نیں سچل سچ سپاہیاں۔

(ترجمہ) سچل سچ کے سپاہیوں نے شاہ محمود کا مال لوٹا۔

1050ء میں سندھ میں سومرا خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ سومرا بادشاہوں کے بارے میں مورخین میں بہت سی متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ انہیں عرب کہتے ہیں اور کچھ یہودی۔ خود سومرا اپنے آپ کو عرب کہتے تھے۔ مگر یہ غیر ملکی حکمرانوں کا پھیلایا ہوا نسلی تفاخر کا رجحان ہے جو ہمارے لوگوں میں

چھوت کی بیماری کی طرح پھیلا ہوا ہے کیونکہ بیشتر تاریخ دانوں نے سومرا، سمہ اور کلہوڑا خاندانوں کو سندھی الاصل ہی کہا ہے۔ سبطِ حسن کے مطابق "سومرا، سمہ اور کلہوڑا خاندان کے بانیوں کے نام اور ان کی قبیلہ داری اور رسم و رواج ہی ان کے سندھی الاصل ہونے کی نا قابل تردید شہادت پیش کرتے ہیں۔"

جب عباسی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا تو مصر اور شمالی افریقہ میں اسماعیلیوں نے فاطمی سلطنت قائم کرلی۔ ان کے پیروکاروں کو قرامطی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ عباسیوں کے دور میں خفیہ تبلیغی سرگرمیاں کرتے تھے لہٰذا انہیں باطنی بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ سندھ تک پھیل گیا تھا۔ نویں صدی کے آخر تک سومرا قبائل، جو کہ اسماعیلیوں کی تبلیغ کے نتیجے میں مسلمان ہو گئے تھے، عباسی حکومت کا ڈھیلا ڈھالا کنٹرول ختم کر کے سندھ میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

سومرا خاندان نے ٹھٹھہ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یہ 1050ء سے لے کر 1350ء تک سندھ پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس خاندان کے تقریباً 20 حکمران آئے جن میں ابن سومار، بھونگر بادشاہ، دودو دلیر، ننگر رائے، عمر بادشاہ اور ہمیر بادشاہ مشہور حکمران ہوئے۔ سومرا خاندان کی حکمرانی کا دور سندھ میں خوشی اور خوشحالی کا دور تھا۔ اسی دور کے بارے میں شاہ لطیف بھٹائی نے کہا:

(ترجمہ)

- آنگن میں جب محبوب آئے تو اے سہیلیو ہمیں سکھ اور خوشی ملی
ایسے جان سے عزیز محبوب پر کیوں نہ ہیرے اور جواہر نچھاور کریں۔

اسی دوران سندھ میں محبت کی کئی لازوال داستانیں رقم ہوئیں جن میں مشہور یہ ہیں : سسی پنوں، عمر ماروی، رائے سورٹھ ڈیاچ اور مومل رانو۔ یہ وہ عشقیہ قصے ہیں جن کے بارے میں شاہ لطیف بھٹائیؒ نے بہت ساری میٹھی شاعری کی جو آج بھی سندھ میں مقبول ہے۔

سومرا خاندان کے دور میں سندھ میں کوئی بیرونی حملہ آور نہیں آیا اور سندھ آزاد رہا۔ صرف ایک دفعہ دودو اور چنیسر میں حکمرانی کا جھگڑا ہوا تو چنیسر دہلی کے بادشاہ علاؤ الدین خلجی کو لے آیا۔ علاؤ الدین کی فوج سے سندھیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بے شمار قتل وغارت ہوئی مگر سندھیوں نے ہار نہیں مانی۔ آخر تھک ہار کر علاؤ الدین خلجی واپس چلا گیا۔ اس دور کی بہت سی رزمیہ شاعری ملتی ہے جو آج بھی سندھ میں مقبول ہے۔ بھاگو بھان بھٹ اس وقت کا مشہور رزمیہ شاعر تھا جس نے چنیسر کی مذمت کی اور سندھیوں کی دلیری کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

حضرت لال شہباز قلندرؒ

سومرادور کے تیرھویں صدی عیسوی کے سندھ کو "ہندوستان کے تصوف کا گھر" مانا گیا ہے۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ سب سے اہم بزرگ تھے جو اس صدی میں سندھ تشریف لائے اور تب سے یہاں کی خاص پہچان رہے ہیں۔ آپ کا جنم مبارک 1176ء میں آذربائیجان کے شہر مرند (مروند) میں ہوا۔ اس آبائی شہر کی نسبت سے آپ کو شیخ عثمان مروندی بھی کہا جاتا ہے۔ آپ نے تقریباً ایک سو برس کی عمر پائی اور 1274ء میں فوت ہوئے۔

جب لال شہباز قلندرؒ سندھ تشریف لائے اور یہاں کے تاریخی شہر سہون پہنچے تو اس وقت یہ شہر 'شودھرم' کا اہم مرکز تھا۔ یہاں مسلمان بہت کم بستے تھے اور شہر کئی ذہنی اور معاشرتی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ شہباز قلندرؒ نے اتحادِ انسانی کے نقطۂ نگاہ سے وہاں محبت و خدمت کا رویہ اپنایا، احترام انسان اور عظمتِ انسانیت کا درس دیا اور کہا کہ دھرتی پر عدل وانصاف قائم ہو۔ ایشور یا اللہ کسی کی خدمت یا پوجا کا محتاج نہیں ہے، انسان ہی انسان کی سیوا اور خدمت کا محتاج ہے۔ یہی فرضِ انسانیت ہے اور یہی شانِ انسانیت کہ ہم انسان سب کے لیے جینا سیکھیں۔ تعلیم و عمل کے ان احکامات اور تربیت کا دونوں مذاہب کے پیروکاروں کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ ہندو آپ کو راجہ بھرتھری کا اوتار ماننے لگے اور

مسلمان ان کو اپنے دین کا پرچارک سمجھتے ہوئے ان کی پیروی کرنے لگے۔

آپ اپنی عمر گراں قدر کے آخری دور میں سندھ میں تشریف لائے تھے اور صرف چھ برس یہاں قیام کر سکے لیکن جب انہوں نے وفات پائی تو نہ صرف یہ کہ ان کے جسدِ خاکی کو ہندوؤں نے اپنے بڑے مندر میں دفنانے پر اصرار کیا بلکہ شو کے سب پجاری ان کے مسلکِ وحدانی کو مان کر ان کے ملنگ بن گئے۔ صدیاں گذر گئیں ہیں لیکن دونوں عقائد کے عوام کے مابین اس باہمی مروت و محبت کا عالم یہ ہے کہ حضرت لال شہباز قلندرؒ کے ملنگ کئی قدیم رسمیں برقرار رکھے ہوئے ہیں جو زمانہِ قدیم سے شو کے پجاریوں میں مروج تھیں۔ حضرت لال شہباز قلندرؒ کی درگاہ پر سالانہ عرس کے موقع پر سب مذاہب کے ماننے والوں کی صلح و آشتی کے باہمی برتاؤ کا جو سماں آج بھی باندھا جاتا ہے وہ قابل دیدنی ہوتا ہے۔

سمہ خاندان

سمہ (سمو) مقامی سندھی قبیلے کے سردار جام انڑ نے 1350ء میں سومروں کو شکست دے کر ٹھٹھہ کے تخت پر قبضہ کیا۔ یہیں سے سمہ خاندان کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ سمہ قبیلہ راجپوت تھا اور اس کا تعلق کچھ کے علاقے سے تھا۔ سندھ پر سمہ خاندان کی حکومت 1351ء سے 1521ء تک تقریباً 170 برس قائم رہی۔ اس دور میں سندھ کی سرحدیں سبی اور سہون سے لے کر کچھ اور مکران تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ٹھٹھہ کے تخت پر سمہ خاندان کے سولہ حکمران قابض رہے جو خود کو جام کہلواتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں :

1. جام انڑ۔
2. جام جونان۔
3. جام صدرالدین۔
4. جام تماچی۔
5. جام صلاح الدین۔
6. جام نظام الدین۔
7. جام علی شیر۔
8. جام کرن۔
9. جام فتح خان۔
10. جام تغلق۔
11. جام مبارک۔
12. جام سکندر۔
13. جام سنجر۔
14. جام نظام الدین (جام نندہ)۔
15. جام فیروز۔
16. جام صلاح الدین۔

ان تمام حکمرانوں میں جام نظام الدین یا جام نندہ کا دور سب سے طویل تھا۔ اس کے دور میں سمہ حکمرانی اپنے عروج پر پہنچی اور پھر تیزی سے زوال پذیر ہو گئی۔ جام تماچی بھی مشہور بادشاہ ہوا جس کی عشقیہ داستان "نوری جام تماچی" بہت مشہور ہوئی۔ اسی دور میں سوہنی میہار کی عشقیہ داستان بھی بہت مشہور ہوئی۔ یہ وہی داستان ہے جسے پنجاب میں سوہنی مہینوال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی نے ان دونوں داستانوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا:

(ترجمہ)

- جھونپڑیوں میں خبر پھیلی جام تماچی آیا۔
ملاحوں کے بچے جھیل کنارے چہک اٹھے۔
جام کی عمر دراز جس نے مچھیروں کو معتبر بنایا۔

مجموعی طور پر سمہ حکمرانی میں سندھ پر امن رہا اور لوگوں میں خوشحالی آئی۔ سندھ کے مقامی حکمرانوں کے دور میں بھی حاکم اور محکوم کا رشتہ موجود تھا مگر ایک فرق یہ تھا کہ مقامی پیداوار اور دولت سندھ سے باہر نہیں جاتی تھی بلکہ مقامی سطح پر ہی خرچ کی جاتی تھی اور اسی سے تعمیر و ترقی کے راستے کھلتے تھے۔ "مگر خالص سندھی حکومتوں کے عہد میں بھی سرکاری دربار کی فضا ایرانی تھی۔ دربار میں فارسی بولی جاتی تھی اور سرکاری دفتروں کی زبان فارسی تھی۔ خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ شعر فارسی میں کہے جاتے تھے۔ کتابیں فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ جو خاندان ایران، عراق، ترکستان اور افغانستان سے بھاگ کر یہاں آتے تھے ان کے ساتھ امتیازی سلوک

ہوتا تھا۔ اِن کو ملازمتیں اور زمینیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ سندھ میں پیروں اور سیدوں کی فراوانی اہلِ سندھ کی اسی فراخ دلی اور مہمان نوازی کی مرہونِ منت ہے۔" ("نویدِ فکر" از سبطِ حسن)

سمہ دور میں سندھ میں بیرونی حملہ آور بہت کم آئے اور وہ بھی مضافاتی علاقوں تک۔ سمہ دور کے آغاز میں دہلی کا سلطان محمد تغلق سندھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ ٹھٹھہ سے چودہ کوس باہر خیمہ زن ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ سموں سے لڑتا وہ بیمار ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد اس کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور امراء نے سلطان کے بھائی فیروز شاہ کو بادشاہ بنایا اور واپس دہلی چلے گئے۔ اس واقعے کے بیس برس بعد سلطان فیروز شاہ تغلق نے دہلی سے ٹھٹھہ پر چڑھائی کی لیکن اوچ شریف کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت جلال الدین بخاریؒ نے سمہ حکمران جام صدر الدین اور فیروز شاہ میں صلح کروادی۔ اس کے بعد مغل عہد تک کسی نے سندھ کی طرف رخ نہیں کیا۔

ارغون اور ترخان

قندھار کے ارغون حکمران مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ منگول سلطنت زوال پذیر ہو کر کئی چھوٹی حکمرانیوں میں تبدیل ہو گئی تھی اور خراساں پر سلطان حسین مرزا کی حکومت تھی۔ اس کے ایک امیر ذولنون ارغون نے قندھار پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ 1507ء میں ذوالنون ایک جنگ میں مارا گیا تو اس کا بیٹا شاہ بیگ ارغون قندھار کا حاکم بنا۔

اسی دوران ظہیرالدین بابر نے، جو غزنی اور کابل کی چھوٹی سی ریاست کا بادشاہ تھا، خود کو اس قدر مستحکم بنا لیا تھا کہ اب وہ اردگرد کے علاقوں میں فتوحات کی تیاری کر رہا تھا۔ قندھار براہِ راست اس کی زد میں تھا۔ امراء کے مشورے سے شاہ بیگ ارغون نے قندھار چھوڑ دیا اور نئی سلطنت کی تلاش میں بلوچستان کے علاقے شال (کوئٹہ) اور سبی میں آکر اپنی حکومت قائم کی۔ اس نے چند برس کوئٹہ اور سبی میں بسر کیے مگر پھر وہ سندھ کی طرف آگیا۔ 1521ء میں شاہ بیگ ارغون ٹھٹھہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے سندھ میں ارغون خاندان کی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ شاہ بیگ نے ٹھٹہ میں لوٹ مار کی اور وہاں کے باشندوں کو قتل کیا اور انہیں ذلیل و خوار کیا۔

شاہ بیگ جب 1526ء میں بکھر (سکھر) اور سہون پر قبضہ کرنے کے

بعد مر گیا تو ٹھٹھہ کے لوگوں نے اس کی موت کی خوشی منائی اور نقارے بجائے۔ ان دنوں جام فیروز وہیں تھا اور ٹھٹھہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کا خواہش مند تھا۔ شاہ بیگ کی موت کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسن بیگ تخت نشین ہو کر بکھر سے واپس ٹھٹھہ پہنچا تو جام فیروز اپنی فوج لے کر کچھ کی طرف چلا گیا۔ حسن بیگ نے اس کا پیچھا کیا اور ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں جام فیروز کی قیادت میں سندھی فوج بے جگری سے لڑی مگر اسے شکست ہوئی اور بے بہا قتل و غارت گری ہوئی۔ جام فیروز شکست کھا کر گجرات کی طرف چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔

شاہ حسن بیگ نے اسی برس ملتان پر حملہ کر کے سلطان محمود لنگاہ کو شکست دی اور ملتان پر لنگاہ خاندان کی سوسالہ حکومت ختم کر دی۔ پھر شاہ حسن نے ملتان کو دہلی کے بادشاہ بابر کے حوالے کر دیا۔ شاہ حسن بیگ نے سندھ پر تیس برس حکومت کی اور اس کا انتقال 1556ء میں ہوا۔ شاہ حسن بیگ کی کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا ٹھٹھہ کے تخت پر مرزا عیسیٰ خان ترخان نے قبضہ کر لیا جو حسن بیگ کا وزیر تھا۔ بکھر پر وہاں مقرر حاکم سلطان محمود نے خود مختار حکومت بنالی۔ اب سندھ دو حکومتوں میں تقسیم ہو گیا۔ سندھ کے ارغون اور ترخان حاکموں میں آپس میں لڑائیاں ہوتی رہیں اور وہ ایک دوسرے کے علاقوں کو برباد کرتے رہے۔ ان روز روز کی لڑائیوں کی وجہ سے سندھ کے سیاسی اور معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

مرزا عیسیٰ ترخان 1570ء میں فوت ہوا تو اس کی اولاد میں جنگ و جدل کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کا جانشین مرزا محمد باقی تھا جو 1584ء میں مر گیا اور اس کا بیٹا

مرزا جانی بیگ تخت نشین ہوا۔ بکھر کی حکومت سلطان محمود نے حاصل کر کے دہلی کے مغلوں سے تعلقات بنانے کے لیے اپنی بیٹی اکبر کے حرم میں بھجوا دی۔ جب سلطان محمود سخت بیمار ہوا تو اس نے بکھر کو مغلوں کے حوالے کر دیا جس کے بعد یہاں دہلی سے مغلوں کا گورنر مقرر ہو کر آگیا۔ ادھر ٹھٹھہ پر بھی اکبر کی مغل فوج نے حملہ کر کے مرزا جانی بیگ کو شکست دے دی اور ٹھٹھہ بھی مغل سلطنت کا حصہ بنالیا گیا مگر پھر جانی بیگ کو ہی حاکم بنا کر بھجوا دیا گیا۔

قندھار کے مغل ارغونوں اور ترخانوں نے سندھ میں مسلسل ابتری پھیلائے رکھی اور مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ جب بابر کے بیٹے ہمایوں سے شیر شاہ سوری نے تخت چھین لیا اور وہ سندھ کی طرف آیا تو شاہ حسن بیگ نے سندھ کا بیشتر علاقہ جلادیا اور برباد کر دیا تاکہ ہمایوں یہاں نہ رک سکے۔ ہمایوں تو چلا گیا مگر سندھ بری طرح سے برباد ہوا۔

مغل خاندان

بابر نے جب کابل کی حکومت قائم کی اور قندھار کو فتح کیا تو وہاں کا حاکم شاہ بیگ سندھ چلا آیا اور اس نے سندھ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد اس کے جانشین نے بابر کی خوشنودی حاصل کرنے کے بعد اُسے تحفے وغیرہ بھیجے۔ ٹھٹھہ میں خطبہ شاہ حسن کی جگہ بابر کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ارغون بابر کو بڑا بادشاہ مانتے تھے جبکہ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مغلوں کو سندھ سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ جب شاہ حسن نے ملتان فتح کیا تو وہ بھی اس نے بابر کے حوالے کر دیا۔

جب دہلی کے تخت پر ہمایوں بیٹھا تو شاہ حسن نے اس کے ساتھ بھی اچھے تعلقات برقرار رکھے۔ مگر جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو دہلی سے نکال دیا اور وہ سندھ کی طرف آیا تو شاہ حسن نے صرف اس لیے سندھ کو تباہ و برباد کر ڈالا کہ ہمایوں وہاں نہ ٹھہر سکے۔ شاہ حسن کے بعد سندھ کی ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: ایک ٹھٹھہ کی حکومت جو ترخانوں کے ماتحت تھی اور دوسری بھکر کی حکومت جو ارغونوں کے پاس تھی۔

1556ء میں دہلی کے تخت پر مغل بادشاہ اکبر بیٹھا تو مغل سلطنت عروج کی طرف گامزن تھی۔ اکبر کا دور توسیع پسندی کا دور ہے۔ اکبر قندھار

تک کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ سندھ اور بلوچستان سے گزرنے کا محفوظ راستہ حاصل کیا جائے لہذا اکبر سندھ کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ 1574ء میں جب اکبر نے اپنے ایک سپہ سالار محب علی کو بکھر فتح کرنے کے لیے بھیجا تو اس وقت وہاں سلطان محمود حاکم تھا۔ سلطان محمود نے اکبر کی خوشنودی کی خاطر اپنی بیٹی کو اس کے حرم میں بھجوا دیا مگر پھر بھی مغل توسیع پسندی غالب آئی اور مغل فوج نے سندھ پر چڑھائی کر دی۔ سلطان محمود کا اسی دوران انتقال ہو گیا اور بکھر فتح ہو گیا تو اکبر نے گیسو خان کو بکھر کا پہلا صوبیدار بنا کر بھیجا۔ انتظامی سطح پر بکھر کو صوبہِ ملتان کی ایک سرکار بنا دیا گیا جس کے بعد یہاں فوجدار حاکم بن کر آتا تھا جو ملتان کے صوبیدار کے ماتحت ہوتا تھا۔

1574ء سے لے کر 1679ء تک سندھ پر مغلوں کا قبضہ رہا اور بکھر میں 46 مغل فوجدار آئے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جنھوں نے ریاستی انتظامات کی جگہ ظلم، زیادتی اور لوٹ مار کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا۔ یہ لوگ زمینداروں اور کسانوں سے لگان نہ صرف مقررہ شرح سے زیادہ وصول کرتے تھے بلکہ اس کی وصولی میں انتہائی سختی بھی برتی جاتی تھی۔ مقامی زمیندار اور دیگر لوگ ان سے تنگ رہتے تھے اور کبھی کبھار بغاوتیں بھی کرتے رہتے تھے۔

بکھر میں مغل حکمرانی کے دور میں جہاں عوام بے بسی اور ظلم کی چکی میں پس رہے تھے وہاں سندھ کے علماء اور سادات کو جاگیریں اور زمینیں عطا کی جاتی رہیں اور یہ سلسلہ پورے مغل دور میں جاری رہا۔ صرف اکبر کے ایک فرمان پر سندھ کی پچاس ہزار ایکڑ زمین پیروں اور عالموں کو دی گئی۔ ٹھٹھہ کو بھی

مغل حکمران اپنی سلطنت کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے ٹھٹھہ کے حاکم جانی بیگ کو پیغام بھیجا کہ سندھ کے حکمران اب تک ہمارے نام کا خطبہ پڑھتے آئے ہیں اور سکے پر ہمارا نام لکھتے رہے ہیں لہٰذا تم بھی اس کی تعمیل کرو۔ پھر اکبر نے بھکر کے فوجدار صادق خان کو کہا کہ ٹھٹھہ فتح کر لو۔ صادق خان نے چڑھائی کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر اکبر نے خان خانان کو ٹھٹھہ کی فتح کے لیے روانہ کیا جس نے ٹھٹھہ فتح کیا اور بعد ازاں ٹھٹھہ کے گذشتہ حاکم جانی بیگ کے ساتھ صلح کر کے اسے اکبر کے دربار میں لے گیا۔ اکبر نے جانی بیگ کو پنج ہزاری کا منصب عطا کیا اور ساتھ ہی ٹھٹھہ کا صوبیدار بھی بنا دیا۔ اس طرح ٹھٹھہ کا پرانا حکمران خاندان اب مغل سلطنت کا باجگزار بن کر حکومت کرتا رہا۔ ٹھٹھہ کی فتح کے بعد مغلوں کا پورے سندھ پر قبضہ ہو گیا۔

ٹھٹھہ 1592ء میں فتح ہو گیا تو اس کے بعد سندھ پر 1739ء تک (قریباً 147 برس) مغلوں کی حکومت قائم رہی۔ ٹھٹھہ کو صوبے کا درجہ حاصل تھا مگر مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے کم اہم لوگوں کو یہاں صوبیدار بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ تاریخ دانوں کے مطابق یہاں چالیس سے زیادہ صوبیدار مقرر ہو کر آئے۔ شروع میں تو ترخان حکمرانوں کو ہی ٹھٹھہ جاگیر میں دیا گیا مگر بعد ازاں اسے باقاعدہ مغل انتظام میں شامل کر کے یہاں صوبیدار مقرر کیے جاتے رہے۔

مغلوں نے سندھ پر، سوائے اس کے کہ وہ ان کا زیر نگیں رہے، کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ نہ انہوں نے کبھی یہاں کوئی ترقیاتی کام کیا نہ نہریں کھدوائیں اور نہ ہی کبھی عوام کی سہولت کا سوچا۔ جو حاکم مقرر کیے جاتے ان سے کوئی پوچھ گچھ

نہ تھی لہذا وہ سندھ میں بے تحاشا ظلم کرتے۔ اکثر اوقات وہ خود تو دربار میں رہتے اور ان کے نائب انتظامات چلاتے جو مالیہ مقررہ شرح سے زیادہ وصول کرتے۔ مغل جاگیر دار بھی زیادہ تر غیر حاضر رہتے اور اپنی جاگیریں ٹھیکے پر دے جاتے۔ ٹھیکے دار من مانی وصولیاں کرتے اور لوگوں کو تنگ کرتے۔ مجموعی طور پر مغل دور میں سندھ انتظامی طور پر تین حصوں میں تقسیم تھا: (1) ٹھٹھہ، جس کا حاکم صوبیدار ہوتا تھا؛ (2) بکھر، جس کا انتظامی سربراہ فوجدار ہوتا تھا؛ اور (3) سہون، جس کا انتظام جاگیر دار کے سپرد ہوتا تھا۔

شاہ عنایت شہیدؒ

سندھ میں قدیم زمانے سے ہی زرعی پیداوار میں جاگیرداری نظام رائج تھا۔ عربوں نے سندھ میں اپنا ایک جاگیردار طبقہ تیار کیا تھا اور ان کے بعد کے زمانوں میں بھی یہی بالادست طبقہ مختلف ناموں سے چلتا رہا۔ مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہی جاگیردارنہ نظام پر تھی۔ مغلوں کے دور میں چار قسم کی جاگیریں ہوتی تھیں۔ خود بادشاہ سب سے بڑا جاگیردار ہوتا تھا اور جو جاگیر اس کے پاس ہوتی تھی اسے 'خالصہ' کہا جاتا تھا۔ خالصہ براہِ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتی تھی اور زمین کی بٹائی یا لگان وہ خود وصول کرتا تھا۔ پورے ہندوستان میں زرخیز زمینوں کا قریباً چوتھائی خالصہ پر مشتمل تھا۔ سندھ میں ایسی جاگیریں بہت کم تھیں۔

دوسری قسم کی جاگیروں کے مالکان کو جاگیردار ہی کہا جاتا تھا۔ مغلوں نے جاگیرداری اور منصب داری کو یکجا کر دیا تھا۔ وہ فوجی عہدے کے حساب سے منصب دار مقرر کرتے تھے جن کے پاس مقرر تعداد میں فوج ہوتی تھی اور انہیں پنج ہزاری، دس ہزاری وغیرہ کہا جاتا تھا۔ ان منصب داروں کو مقررہ فوج پالنے کے لیے اور ان کے اپنے اخراجات پورے کرنے کے واسطے جاگیریں دی جاتی تھیں۔ منصب داروں کے مرتبے کا تعین ان کی فوجی حیثیت سے ہوتا تھا اور اسی حساب سے انہیں جاگیریں دی جاتی تھیں۔ وہ بیک وقت فوجی بھی ہوتے

تھے اور جاگیر دار بھی۔ اگر کسی کی جاگیر منسوخ کر دی جاتی تھی تو وہ زمین ریاست کی ملکیت میں چلی جاتی تھی۔

یہ جاگیر دار عام طور پر خود جاگیروں میں نہیں جاتے تھے بلکہ ٹھیکے دار مقرر کر دیتے تھے۔ ٹھیکے داروں کو ایک طرف بہتر کاشت کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی تو دوسری طرف وہ کسانوں سے جبر اً لگان کی زیادہ شرح وصول کرتے تھے۔ یہ جاگیر دار ٹھیکے داروں سے پیشگی رقم وصول کر لیتے تھے جسے 'قبض' کہا جاتا تھا۔ نوبت یہاں تک بھی پہنچ گئی تھی کہ زمین ٹھیکے پر دینے کے بعد بھی اگر کوئی شخص انہیں زیادہ رقم دے دیتا تو وہ زمین اسے دے دیتے تھے۔ اجارہ داری کا یہ نظام دیہی عوام کے لیے آفت و مصیبت سے کم نہیں تھا۔

تیسری طرح کی جاگیریں مدد معاش یا معافی کی جاگیریں ہوتی تھیں۔ مدد معاش یا معافی کی جاگیر ملنے کی ایک ہی شرط تھی کہ جاگیر دار بادشاہ کا وفادار رہے۔ یہ جاگیریں علماء، فضلا اور سادات کو دی جاتی تھیں۔ ارغونوں اور ترخانوں نے سندھ میں ایسے پڑھے لکھے افراد کو مسلسل جاگیریں دے کر ایک طبقہ بنا دیا تھا۔ مغلوں نے بھی ملاؤں اور پیروں پر یہ عنایات جاری رکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سندھ میں مجموعی زرعی رقبے کا 25 سے 30 فیصد تک معافی اور مدد معاش کی جاگیروں پر مشتمل تھا۔ اورنگزیب کے عہد تک یہ جاگیریں موروثی نہیں ہوتی تھیں بعد ازاں یہ موروثی ہو گئیں۔ اس طرح سندھ میں سیدوں کی اولادیں جاگیر دار بن گئیں اور آج تک موجود ہیں۔

چوتھی قسم کی جاگیروں پر زمینداروں کا قبضہ ہوتا تھا۔ یہ زمینداریاں

قدیم زمانے سے ہی چلی آرہی تھیں اور موروثی تھیں۔ یہ زمیندار جاگیرداروں کے مقابلے میں بہت تھوڑی زمین کے مالک ہوتے تھے۔ ان میں سے کئی تو بہت کم ملکیت کے مالک ہوتے تھے۔ یہ زمیندار بٹائی پر زمین کاشت کرواتے تھے اور اکثر گاؤں میں ہی رہتے تھے۔ زمیندار کی ملکیت وراثت میں اس کی اولاد کو ملتی تھی۔ سندھ کے کسانوں کو جاگیرداروں کو لگان ادا کرنے کے بعد مختلف رسوم بھی ادا کرنا پڑتی تھیں جن پر ان کی بچی کھچی رقم خرچ ہو جاتی تھی۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں ان پر فاقے کی نوبت آجاتی تھی۔ جاگیرداروں، ان کے ٹھیکے داروں اور فاقہ کشی سے تنگ آکر کسان جنگلوں کی طرف چلے جاتے تھے اور ڈاکو بن جاتے تھے۔ بہت سے زمیندار اور کسان برادریاں ایسی بھی تھیں جو اس دور میں مسلسل بغاوت کرتی رہتی تھیں اور انہیں کچلنے کے لیے صوبیدار کو طاقت استعمال کرنی پڑتی تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں جابجا ایسی بغاوتوں کا ذکر ملتا ہے۔

مغلیہ سلطنت کا زوال اورنگزیب کی غلط حکمتِ عملیوں کی وجہ سے اس کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ وہ جنگ باز تھا اور دکن میں 25 سال تک جنگ کرتا رہا۔ وہ کٹر خیالات کا حامی تھا جس وجہ سے بہت سے امراء اور قبائل اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ 1707ء میں فوت ہوا تو اس کے بیٹوں میں تخت کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ وہ خود بھائیوں کو قتل کر کے بادشاہ بنا تھا اور اس کے بیٹوں نے بھی وہی وطیرہ اپنایا۔ معظم نامی شہزادے نے جنگ میں شہزادہ اعظم کو قتل کیا۔ پھر شہزادہ کام بخش بھی لڑتا ہوا مارا گیا اور شہزادہ معظم شاہ عالم کے نام سے تخت پر بیٹھا مگر چار برس بعد ہی مر گیا۔

اس کے بعد اس کے چاروں بیٹے آپس میں لڑنے لگے۔ جہاندار شاہ اپنے تینوں بھائیوں (عظیم الشان، جہان شاہ اور رفیع شاہ) کو قتل کر کے بادشاہ بنا۔ ایک برس بعد ہی عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ وہ انتہائی ظالم اور عیاش شخص تھا اور اس نے ان امراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن سے اسے خطرہ تھا، کچھ کی زبانیں کٹوا دیں اور اپنے بھائیوں کو اندھا کر کے قید میں ڈال دیا۔

یہ دور ہی صوفی شاہ عنایتؒ کا دور تھا۔ ان کا سن ولادت تو معلوم نہیں مگر یہ بات یقینی ہے کہ وہ سترھویں صدی میں اورنگزیب کے عہد میں ٹھٹھہ کے ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے جدِ امجد مخدوم صدھو لانگاہ تھے۔ ان کے والد کا نام مخدوم فضل اللہ تھا جو ایک درویش صفت انسان تھے۔ شاہ عنایتؒ نے حق کی تلاش میں کافی سیر و سیاحت کی۔ شاہ عبدالمالک ان سے دکن میں ملے اور وہ ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ پھر وہ دہلی آئے تو انہوں نے شاہ غلام محمد ناجی بزرگ سے علم حاصل کرنا شروع کیا۔ شاہ عنایتؒ کا اپنے مرشد شاہ غلام محمد پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہ ان کے ساتھ ہی ٹھٹھہ آ گئے۔

شاہ عنایتؒ نے ٹھٹھہ سے تین میل دور بستی جھوک میں قیام کیا اور تبلیغ شروع کی۔ وہ وحدت الوجود کے قائل صوفی تھے اور تمام انسانوں کو برابر سمجھتے تھے۔ وہ طبقاتی تقسیم کو قدرتی نہیں مانتے تھے بلکہ اس اونچ نیچ کو دنیادارانہ اغراض کی پیداوار سمجھتے تھے۔ وہ سب کو برابری اور مساوات کا درس دیتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے اپنے مریدوں، جنہیں فقیر کہا جاتا تھا، کے ساتھ

عملی طور پر برابری کا سلوک کیا۔ یہ سب لوگ اپنی زمینیں اکٹھی کر لیتے تھے اور ان پر مل کر کام کرتے تھے اور پیداوار کو ضرورت کے مطابق بانٹ کر اور مل کر کھاتے تھے۔ اجتماعی ملکیت اور اجتماعی کاشتکاری کا یہ تصور تاریخ میں اس سے پہلے بھی ملتا ہے مگر سندھ کے لیے یہ نہ صرف کہ نیا تجربہ بھی تھابلکہ ایک ایسا تجربہ تھا جو وقت سے بہت پہلے وقوع پذیر ہو گیا۔ بہر حال یہ انتہائی کامیاب رہا۔

غریب زمینداروں، کاشتکاروں اور کسانوں کے لیے یہ تجربہ نہ صرف معاشی طور پر فائدہ مند تھابلکہ انہیں برابری کا انسانی شرف بھی عطا کرتا تھا۔ بستی جھوک میں آباد فقیروں کو نہ بٹائی دینی پڑتی تھی، نہ بیگار کرنی پڑتی تھی اور نہ سرکاری اہلکاروں کو ادائیگیاں کرنا پڑتی تھیں۔ لہذا جھوک کے تجربے کا چرچا بہت تیزی سے دور دور کے علاقوں میں پھیل گیا۔ ارد گرد کے علاقوں کے کسان تیزی سے شاہ عنایتؒ کے مرید ہونے لگے اور وہ بھی اپنے زمینداروں سے مطالبہ کرنے لگے کہ ان کے ساتھ بھی شاہ عنایتؒ والے طریقے پر عمل کیا جائے۔

جہاں کسانوں اور ہاریوں میں ان کے خیالات کو خوشی سے قبول کیا گیا وہاں زمینداروں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اکٹھے ہو کر اس انقلابی سوچ اور عمل کا راستہ روکنا چاہتے تھے کیونکہ اگر وہ اس انقلابی لہر کو پھیلنے دیتے تو بہت جلد سندھ سے جاگیردارانہ نظام ختم ہو جاتا۔ علاقے کے کچھ جاگیردار اور زمیندار اکٹھے ہو کر ٹھٹھہ کے صوبیدار میر لطف علی خان کے پاس آئے اور فریاد کی کہ شاہ عنایتؒ کو اجتماعی کاشتکاری سے روکا جائے۔ شاہ عنایتؒ کی زمین مدد معاش کی جاگیر تھی لہٰذا صوبیدار نے اس میں مداخلت مناسب نہ سمجھی مگر زمینداروں کو یہ اجازت دے

دی کہ وہ جس طرح چاہیں اس معاملے سے نمٹ لیں۔

زمینداروں نے جھوک پر حملہ کر دیا مگر انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ اس لڑائی میں کچھ فقیر بھی مارے گئے اور ان کے وارثوں نے شاہی دربار میں استغاثہ دائر کیا جہاں سے ان کے حق میں فیصلہ ہوا اور قاتلوں کی زمینیں مقتولوں کے وارثوں کو مل گئیں۔ فقیروں کی اس قانونی جیت سے ان کے حوصلے بڑھ گئے اور علاقے کے کسانوں میں جوش و خروش اور بھی زیادہ ہو گیا۔

فرخ سیر نے میر لطف علی کو صوبیداری سے برطرف کر دیا اور نیا صوبیدار اعظم خان مقرر کیا۔ اب علاقے کے زمیندار اعظم خان کے ارد گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ اعظم خان کو پہلے ہی شاہ عنایتؒ سے ذاتی رنجش تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اعظم خان ان سے ملنے آیا تو فقیروں نے اسے ملنے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ وظیفے میں مصروف ہیں۔ جب شاہ عنایتؒ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے شکایت کی کہ صوفی کے دروازے پر دربان اچھے نہیں لگتے۔ شاہ عنایتؒ نے فوراً جواب دیا: ”تا کہ دنیا کا کتا اندر نہ آسکے۔“

اس کے بعد اعظم خان نے شاہ عنایتؒ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان سے واجبات کا مطالبہ کر دیا جبکہ وہ ان پر لاگو نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب یہ واجبات بادشاہ کی طرف سے معاف ہو چکے ہیں تو وہ کون ہوتا ہے مطالبہ کرنے والا۔ اعظم خان نے بادشاہ سے شکایت کی کہ شاہ عنایتؒ اور اس کے فقیر سلطنت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور آپ کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فرخ سیر نے تحقیق کیے بغیر حکم دیا کہ باغیوں کو بزورِ شمشیر اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

بادشاہ سے اجازت ملتے ہی نواب اعظم خان جھوک پر حملے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سندھ کے سبھی جاگیرداروں کو اپنی فوج سمیت مدد کے لیے بلایا۔ میاں یار محمد کلہوڑا کی فوج اعظم خان کی فوج سے بھی بڑی تھی جو اس کے ساتھ مل گئی اور دیگر جاگیردار بھی اپنی فوج لے آئے۔ یوں جھوک پر حملہ کرنے کے لیے ایک کثیر لشکر نے جھوک کا محاصرہ کر لیا۔ فقیروں نے شاہی فوج پر شب خون مارنے شروع کر دیے جس سے شاہی فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا اور کئی زمیندار بھی مارے گئے۔ محاصرے کو دو مہینے گزر گئے تو انہیں دنوں سیلاب آ گیا اور جھوک کے اردگرد میلوں تک پانی پھیل گیا۔ اسی دوران نواب اعظم کے پاس کچھ جاگیرداروں کی تازہ کمک بھی پہنچ گئی تو انہوں نے پھر جھوک پر حملہ کیا اور پھر ناکام رہے۔

دو مہینے اور گزر گئے مگر صوبیدار اعظم خان کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو شاہ عنایتؒ کو صلح کا پیغام بھیجا گیا۔ خدایار خان کلہوڑا کا بیٹا محمد خان اور فوج کے سالار شاہ عنایتؒ کے پاس گئے اور قرآن کو درمیان میں رکھ کر قسم کھائی کہ فقیروں کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ انہوں نے ان کی قسموں پر یقین کر کے جھوک کا دروازہ کھول دیا۔ شاہی فوج نے بستی پر قبضہ کر لیا۔ ان کو صلح نامے پر دستخط کرنے کی غرض سے لایا گیا اور قید کر دیا گیا۔ جھوک میں فقیروں کا قتل عام کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ غارت گری میں ہزاروں فقیر شہید ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق جب شاہ عنایتؒ کو اعظم خان کے دربار میں پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کے سوالات کے جوابات درج ذیل فارسی اشعار میں دیے :

(ترجمہ)

- عاشق ملامت کا بوجھ نہ اٹھائے تو کیا کرے
قضا کے تیز کی ڈھال کسی بہادر کے پاس نہیں۔
- وہ شخص جس کا دل عشق سے زندہ ہے کبھی نہیں مرتا
ہماری ابدیت کی مہر دفترِ کائنات پر لگی ہوئی ہے۔
- ہم مرید اپنا منہ کعبے کی طرف کیسے کریں
جبکہ ہمارے پیر کا منہ میخانے کی طرف ہے۔
- میں نے جس وقت عشق کے چشمے پر وضو کیا
اسی وقت ہستی کی ہر شے کو سات سلام کیا۔

7جنوری1718ء کو صوبیدار اعظم خان کے حکم پر شاہ عنایتؒ کا سر قلم کر دیا گیا اور ہزاروں فقیر قتل کر دیے گئے۔ جھوک کو برباد کر دیا گیا مگر پھر بھی اعظم خان پر خوف کا یہ عالم تھا کہ اس نے منادی کروائی کہ اگر کوئی شخص "اللہ" کا نعرہ بلند آواز میں لگائے تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس معرکے میں جاگیرداریت نہ صرف بچ گئی بلکہ جاگیرداروں کو اور بھی زمینیں انعام میں دی گئیں۔ سب سے زیادہ زمینیں یار محمد کلہوڑا کو انعام میں ملیں۔ یہ سارا دور سندھ میں تباہی اور لوگوں پر ظلم کا دور تھا۔ شاہ عنایت شہیدؒ کی تحریک غریب عوام کی تحریک تھی اور اس بات کا اظہار تھی کہ عوام ان ظالم جاگیرداروں اور حکومتی عہدیداروں کے ظلم سے کس قدر تنگ تھے۔ اس دور کے بارے میں شاہ لطیف بھٹائی نے کہا:

(ترجمہ)

اگر اپنے حال زار کا ذرہ برابر بھی اظہار کر پائیں
تو سب حیوان خاموشی سادھ لیں اور پہاڑ پھٹ جائیں
سب پھول بوٹے اور درخت جل جائیں
اور پھر کوئی پتا نہ پھوٹ پائے۔

کلہوڑا خاندان

کلہوڑے سندھ کے پرانے زمیندار خاندانوں میں سے ہیں۔ اس خاندان کے بزرگ آدم شاہ کا دور 1520ء سے 1600ء تھا۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور روحانی پیشوا تھے۔ اکبر کے دور میں جب عبدالرحیم خانِ خاناں سندھ فتح کرنے آیا تو اس نے فتح کے لیے آدم شاہ سے دعا کی درخواست کی۔ آدم شاہ اور ان کی اولاد روحانی راہنما ہونے کے علاوہ مسلسل طاقتور ہوتے ہوئے زمیندار تھے۔ انہوں نے زمین کی زرخیزی پر توجہ دی۔ ان کے نسب میں شاہ علی نے نہر گھاڑ بھی کھدوائی۔ کلہوڑا خاندان کی زمیندارانہ ملکیت ہر دور میں بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ انہوں نے اپنی فوج بنالی۔ یوں انہوں نے اپنی حیثیت کو بڑھتے رہنے کے قابل بنالیا۔ یہ خاندان آخر کار پورے سندھ کا حاکم بن گیا۔

مغلوں کے لیے سندھ کم اہمیت والے علاقوں میں سے تھا۔ یہ جغرافیائی طور پر مرکز سے دور تھا اور پیداوار کے حساب سے یہاں سے آمدنی بہت کم تھی۔ مغل بادشاہ یہاں پر جن لوگوں کو حکومتی عہدیدار یا منصبدار مقرر کرتے وہ کم اہمیت والے لوگ ہوتے تھے۔ امورِ مملکت میں بھی ان کو مہارت نہیں ہوتی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ غیر حاضر عہدیدار یا جاگیردار ہوتے تھے جو زمینوں کو اجارے یا ٹھیکے پر دے دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ

پورے سندھ کی حکومت ٹھیکے دار چلانے لگے۔ صوبیدار کی جگہ اس کے نائب کی صورت میں اجارہ دار کام کرنے لگے۔ دراصل فتح سندھ کے بعد مغل سلطنت تیزی سے زوال کی طرف بڑھی۔ اورنگزیب کی جنگی سیاست نے اس عمل کو کافی تیز کر دیا۔ مرکزی حکومت کی گرفت دور کے علاقوں پر کمزور ہوئی تو مقامی زمیندار خاندان مقامی سطح کی طاقت کے طور پر ابھرنے لگے۔

اورنگزیب نے 1701ء میں کلہوڑا خاندان کے سربراہ خدایار خان کو سندھ کے ایک حصے کی عملداری سونپ دی۔ اس سے پہلے خدایار خان طاقت حاصل کر کے سبی کا حاکم بن چکا تھا اور اس نے شکار پور پر بھی قبضہ کر تھا۔ 1719ء میں خدایار خان فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا نور محمد کلہوڑو حاکم بنا۔ ٹھٹھہ میں صوبیدار کا عہدہ خالی ہوا تو مغل بادشاہ نے نور محمد کلہوڑو کو صوبیدار مقرر کر دیا۔ یوں کلہوڑو خاندان پورے سندھ پر حاکم ہو گیا۔ اسی دوران 1739ء میں سندھ پر ایران کے نادر شاہ درانی نے حملہ کر دیا۔ نادر شاہ کا یہ حملہ مغل سلطنت پر آفت بن کر نازل ہوا۔ وہ قتل وغارت اور لوٹ مار کرتا ہوا پنجاب اور دہلی تک گیا۔ نور محمد کلہوڑو نے نادر شاہ سے بچنے کے لیے فرار کا راستہ اختیار کیا۔ بعد ازاں کلہوڑا حاکم نے نادر شاہ کو خراج ادا کرنا شروع کر دیا۔

1747ء میں نادر شاہ کے قتل ہونے کے بعد اس کے ایک سپہ سالار احمد شاہ ابدالی نے کابل کو دارالخلافہ بنا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نور محمد کلہوڑو نے اب کابل میں دربار کو خراج ادا کرنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں احمد شاہ نے بھی ہندوستان پر حملے کرنے کی روِش اختیار کر لی۔ 1754ء میں احمد شاہ نے سندھ پر

چڑھائی کی تو نور محمد کلہوڑو پھر فرار ہو گیا اور اسی دوران اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے تین بیٹوں (مراد یار خان، اتر خان اور غلام شاہ) کے درمیان تخت نشینی کی جنگ چار برس تک چلتی رہی۔ 1758ء میں غلام شاہ نے خود کو سندھ کا واحد حاکم تسلیم کروالیا۔ اس نے اپنا دارالخلافہ نیرون کوٹ کو بنایا جہاں اس نے ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس شہر کا نام حیدر آباد رکھا۔

1771ء میں غلام شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خان حاکم بنا۔ سرفراز خان کا زیادہ وقت بلوچ تالپوروں کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے گزرا۔ تالپوروں نے سرفراز خان کی جگہ غلام نبی کلہوڑو کو حاکم بنادیا مگر غلام نبی کی بھی تالپوروں کے ساتھ نہ بن سکی۔ غلام نبی کو تالپوروں نے شکست دے کر بھگادیا اور اس کے بعد عبدالنبی کلہوڑو کو حاکم بنایا مگر اس کے ساتھ بھی یہی ہوا اور وہ مفرور ہو گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ آخر کار 1781ء میں تالپور سندھ کے حاکم بن گئے۔

1701ء سے لے کر 1781ء تک کلہوڑا خاندان سندھ پر حکومت کرتا رہا۔ یہ خاندان مذہبی پیشوا جاگیر دار خاندان تھا جس نے طاقت حاصل کرنے کے بعد خود کو حضرت عباس علمدارؓ کی اولاد سے ظاہر کیا اور عباسی کہلوانے لگے۔ بیشتر محققین تاریخ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ خاندان سندھ کے مقامی لوگوں پر مشتمل تھا۔ چونکہ پورے ہندوستان پر ترک، ایرانی اور افغانی حملہ آور حکمرانی کرتے رہے اس لیے یہ ذہنیت استوار ہو چکی تھی کہ ان علاقوں سے آنے والے نسلی طور پر برتر ہوتے ہیں لہٰذا انہیں حاکمیت کا حق حاصل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کلہوڑوں نے خود کو حاکموں کی نسل سے ظاہر کیا۔

کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ کلھوڑوں نے بیرونی حملہ آوروں سے سندھ کا دفاع نہیں کیا۔ سندھ کے لیے کلھوڑوں کی حکومت اس لیے بہتر تھی کہ ان کے دور میں سندھ کی پیداوار اور دولت سندھ سے باہر نہیں جاتی تھی بلکہ صوبے میں ہی خرچ ہوتی تھی سوائے اس کے کہ نادر شاہ اور احمد شاہ جیسے حملہ آوروں نے لوٹ مار کی اور انہیں کلھوڑوں نے بھاری رقوم خراج میں ادا کیں۔

کلھوڑے سندھ کے واحد حکمران تھے جو خود کو فقیر کہتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے مزار اب تک آباد ہیں۔ اس خاندان کے قابلِ ذکر بزرگوں میں، جن کے مزار اب تک آباد ہیں، آدم شاہ (سکھر)، شاہل گھاڑ (واہ)، الیاس (لاڑکانہ)، میاں نور محمد (مورو)، اور غلام شاہ اور میاں سرفراز (حیدر آباد) شامل ہیں۔ ان کے مزاروں پر ابھی تک چراغ روشن ہوتے ہیں اور ہر برس عرس منایا جاتا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

شاہ عبداللطیفؒ کی ولادت حیدر آباد کے تعلقہ ہالا میں 1690ء میں ہوئی۔ آپ کے والد سید حبیب علاقے کی برگزیدہ ہستیوں میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے اباؤاجداد سادات کے اہم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے خاندانی بزرگ سید میر علی ہرات میں رہائش پذیر تھے کہ 1398ء میں امیر تیمور وہاں آیا اور ان سے ملا۔ وہ ان کے بیٹوں کو اپنے ساتھ مصاحبین میں شامل کر کے ہندوستان لے آیا۔ ان بھائیوں میں سے حیدر شاہ سندھ ہالا میں قیام پذیر ہو گئے اور ایک مقامی زمیندار کی صاجزادی سے شادی کرلی۔ اسی خاندان میں سے سید حبیب کے گھر شاہ عبداللطیفؒ پیدا ہوئے۔

شاہ لطیفؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب انہیں مدرسے بھیجا گیا تو انھوں نے الف سے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ ان کے بیشتر سوانح نگاروں، خاص طور پر شیخ ایاز جو خود سندھ کے عظیم شاعر ہوئے، کے خیال میں ان کو اپنے وقت کے علوم پر مکمل دسترس حاصل تھی اور اس کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا ہوتا ہے۔

شاہ لطیفؒ کی پیدائش کے بعد شاہ حبیب کوٹری میں آکر رہنے لگے۔ ان دنوں وہاں مرزا مغل بیگ کا خاندان آباد تھا جو سندھ کے ارغون حاکم خاندان

سے تعلق رکھتا تھا۔ مرزا مغل بیگ کو شاہ حبیب کی شخصیت نے متاثر کیا تو وہ اپنے خاندان سمیت ان کے مرید ہو گئے۔ جب بھی مرزا مغل کے خاندان میں کوئی بیمار ہوتا تو شاہ حبیب کو دعائے صحت کے لیے بلایا جاتا۔ ایک مرتبہ مرزا کی نوجوان بیٹی بیمار ہوئی تو شاہ حبیب کو بلایا گیا مگر ناسازی طبیعت کی وجہ سے انہوں نے اپنے نوجوان بیٹے شاہ لطیفؒ کو بھجوا دیا۔ پردے کے پابند مرزا مغل نے اپنے مرشد کے بیٹے کو بھی خواتین میں جانے کی اجازت دے دی۔ شاہ لطیفؒ نے جب مرزا کی بیٹی کو دیکھا تو آپ اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ مرزا مغل نے برا منایا اور شاہ حبیب کو بھی یہ بات اچھی نہیں لگی اور انہوں نے اپنے بیٹے سے باز پرس کی۔

شاہ لطیفؒ گھر چھوڑ کر چلے گئے اور اسی وجہ سے شاہ حبیب کو بھی کوٹری چھوڑنا پڑا۔ آپ تین برس تک عاشق آوارہ کی طرح ادھر اُدھر گھومتے پھرے۔ پھر آپ ٹھٹھہ آئے تو یہاں انہیں ایک بزرگ علامہ محمد معین ملے جن کی صحبت کا آپ پر بہت مثبت اثر ہوا اور آپ اپنے گھر واپس آگئے۔ اسی دوران دَل قوم کے افراد نے مرزا مغل کی حویلی پر حملہ کر دیا جس میں تمام مرد قتل کر دیے گئے اور صرف ایک بچہ اور خواتین بچ گئیں۔ اس خاندان میں یہ خیال تقویت پکڑ گیا کہ انہیں سادات کی بددعا لگ گئی ہے لہٰذا انہوں نے شاہ حبیب سے آکر معافی مانگی اور اپنی مذکورہ بیٹی کا رشتہ شاہ لطیفؒ سے کر دیا۔

شادی کے بعد شاہ لطیفؒ نے کوٹری شہر سے چار پانچ کوس باہر ایک غیر آباد جگہ میں اپنی بستی بسائی۔ یہ جگہ ایک ٹیلے (بھٹ) پر تھی لہٰذا اس

بستی کا نام بھٹ شاہ پڑ گیا۔ جب 1731ء میں شاہ حبیب کا انتقال ہوا تو خاندان کے باقی ماندہ افراد بھی بھٹ شاہ میں منتقل ہو گئے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شہرت بہت تیزی سے ارد گرد کے علاقوں تک پہنچ گئی۔ آپ کے پاس عقیدت مندوں کے علاوہ گائیک، موسیقار، سادھو، سنیاسی اور فقیر لوگ آنے لگے۔ شاہ عبداللطیفؒ خود بھی شاعر تھے اور موسیقی سے نہ صرف انہیں رغبت تھی بلکہ اس پر انہیں بے انتہا دسترس بھی حاصل تھی۔ آپ نے اپنی ساری عمر بھٹ شاہ میں گزاری۔ آپ تصوف کے قادری مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی وفات 1752ء میں ہوئی۔ 1754ء میں غلام شاہ کلہوڑو نے اپنے باپ نور محمد کلہوڑو کے کہنے پر آپ کا مزار تعمیر کروایا۔

شاہ عبداللطیفؒ کا نام سندھ کا سب سے بڑا نام ہے۔ ان کی شاعری کی کتاب کا نام "شاہ جو رسالو" ہے جو تیس سُروں پر مشتمل ہے۔ ہر سُر کا مطلب کوئی راگ یا راگنی ہے جس کے تحت انہوں نے شاعری کا ایک ایک باب تخلیق کیا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت، فلسفہ اور دیگر سیاسی و سماجی موضوعات ملتے ہیں جو سندھ کے مکمل حالاتِ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

تالپور خاندان

سندھ میں بلوچوں کی آمد ماضی میں تسلسل سے ہوتی رہی۔ بہت سے بلوچ قبائلی جتھے سندھ میں آکر آباد ہوتے رہے اور ان میں سے بہت سے خاندان زمیندار اور جاگیردار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ تالپور خاندان بھی بلوچ نسل سے تعلق رکھتا تھااور سندھ میں جاگیردار حیثیت سے خود کو مستحکم کرتا رہا تھا۔ سرفراز خاں کلہوڑو کے دور میں تالپور سیاسی قوت کے طور پر کلہوڑا دربار تک پہنچ گئے۔ کچھ عرصے بعد تالپور سیاسی طاقت حاصل کرنے کی کشمکش کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ سرفراز خان نے ایک تالپور سردار میر بہرام خاں کو قتل کروادیا۔

تالپوروں نے دوسرے بلوچ جاگیرداروں کے ساتھ مل کر سرفراز خان کو تخت سے ہٹادیااور غلام نبی کلہوڑو کو سندھ کا حاکم بنادیا۔ غلام نبی کی بھی تالپوروں سے زیادہ دیر دوستی نہ رہ سکی۔ تالپور سرداروں نے غلام نبی کے خلاف بھی طاقت استعمال کی اور جنگ میں غلام نبی کلہوڑو مارا گیا۔ تالپوروں نے اس کے بھائی عبدالنبی کو تخت پر بٹھادیا۔ 1781ء میں قندھار کے لشکر نے سندھ پر چڑھائی کی جس میں میر عبداللہ مارا گیامگر تالپوروں نے عبدالنبی کو ٹکنے نہ دیااور وہ دوبارہ سے بھاگ گیا۔اس کے بعد سندھ کے تخت پر عبداللہ خان کے بیٹے میر فتح علی تالپور کو بٹھایا گیا۔ میر فتح علی تالپور کو افغان بادشاہ تیمور شاہ نے حاکم سندھ تسلیم کرلیا۔

تالپور سرداروں نے سندھ کو آپس میں بانٹ کر حکومت کرنا شروع کی۔ تالپوروں کے دور کی تین چویاریاں مشہور ہیں۔ اوپر تلے تین ادوار میں چار بھائی سندھ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے حکومت کرتے رہے۔ تالپوروں کی حکومت دراصل جاگیرداروں کی کنفیڈریشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ تالپور میروں کے دور میں ہی انگریز سندھ میں داخل ہوئے اور آخر کار 1843ء میں سندھ کو انہوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ یوں تالپور خاندان کی حکومت ان کے دوست انگریز حاکموں کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔

کلہوڑوں کے آخری دور اور تالپوروں کے عہد میں سندھ میں عظیم شاعر سچل سرمست پیدا ہوئے۔ اس دور میں جو دوسرے مشہور درویش شاعر پیدا ہوئے ان کے نام درج ذیل ہیں: سامی، بیرل، نانک یوسف، غلام حیدر، ولی محمد لغاری، خلیفہ قاسم، مصری شاہ، امام نصیر پوری اور محمل فقیر لغاری۔

سندھ پر برطانوی راج

سندھ میں یورپی تجارتی مشن سولھویں صدی کے شروع میں آنے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے پرتگالی سندھ میں آئے اور ٹھٹھہ کی بندرگاہ سے تجارت شروع کی۔ انگریزی تاجر ہندوستان میں مغل بادشاہ جہانگیر کے دور میں آئے۔ انہوں نے ۰ ھ میں بھی اپنے تجارتی دفاتر کھولنے کی کوشش کی مگر پرتگالی ان کے خلاف مزاحمت کرتے رہے اور وہ سترھویں صدی میں سندھ میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ 1635ء میں ٹھٹھہ میں پہلی انگریزی تجارتی کوٹھی قائم ہوئی۔ 27 برس بعد 1662ء میں یہ تجارتی کوٹھی بند کردی گئی۔ پھر ایک لمبے عرصے کے بعد کلھوڑا دور میں (1758ء) دوسری انگریز تجارتی کوٹھی قائم ہوئی مگر جلد ہی وہ بھی بند کردی گئی۔

اٹھارویں صدی کے اختتام تک انگریز ہندوستان میں اپنا اثرورسوخ قائم کرچکے تھے اور بہت سے علاقوں پر کمپنی نے براہِ راست کنٹرول حاصل کرلیا تھا۔ اب کمپنی کا رخ شمالی ہندوستان کی طرف تھا۔ اس وقت سندھ میں تالپور حکمران تھے اور افغانستان کے بادشاہ کو خراج ادا کرتے تھے مگر انہیں اس سے خطرہ بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تالپور انگریزوں سے بہتر تعلقات بھی چاہتے تھے۔ انگریز بھی اپنی شمالی سرحدوں کو افغانستان سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اس

مقصد کے لیے انہوں نے سندھ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک ایرانی تاجر آغا ابوالحسن کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ 1799ء میں آغا ابوالحسن سندھ میں آیا اور اس نے میروں کو یقین دلایا کہ اگر وہ سندھ میں انگریزی تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دیں تو بدلے میں انگریز افغانستان کی طرف سے سندھ پر حملے میں میروں کا ساتھ دیں گے۔ میر فتح علی تالپور نے محتاط رہتے ہوئے انہیں صرف تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد اسی سال ناتھن کرو کی سربراہی میں انگریزوں نے ایک سیاسی مشن سندھ روانہ کیا۔ جس کے بعد ٹھٹھہ اور کراچی میں تجارتی کوٹھیوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اس وقت سندھ میں ہندو تاجر طبقے کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ کراچی اور ٹھٹھہ کے شہروں میں ہندو تاجروں کا غلبہ تھا۔ ان تاجروں کو انگریزوں کی آمد سے تجارتی سطح پر اپنے لیے خطرات محسوس ہوئے اور انہوں نے کرو کی مخالفت کی۔ سندھ کے میر افغانستان کے حکمران سے خوف زدہ تھے اور کرو کے سیاسی عزائم پر بھی انہیں شک تھا۔ اس لیے انہوں نے تھوڑے ہی عرصے بعد انگریز تجارتی کوٹھیوں کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا اور کرو واپس بمبئی چلا گیا۔

1808ء میں ہند کی برطانوی حکومت نے سندھ کے میروں سے عدم جارحیت کا ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق حیدر آباد اور بمبئی کے درمیان وکیلوں کا تبادلہ کیے جانے کا فیصلہ ہوا۔ 1820ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کے مطابق طے ہوا کہ ہند اور سندھ کی آبادی ایک دوسرے کے

علاقوں میں آجا سکے گی اور سندھ سے تمام یورپی باشندوں کو، علاوہ برطانوی باشندوں کے، نکال دیا جائے گا۔ اس سے پہلے برطانوی مرہٹوں کو شکست دے چکے تھے۔ 1832ء میں انگریزوں نے سندھ کے میروں کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا جس کی رو سے انگریزوں کو تجارت کے لیے دریائی اور زمینی راستے استعمال کرنے کی اجازت مل گئی۔

1836ء میں پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ نے شکارپور پر حملہ کر دیا اور 12 لاکھ روپے تاوان طلب کیا تو میروں نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ انگریزوں نے رنجیت سنگھ اور میروں میں ثالثی کروادی اور پنجاب کے حکمران کے ساتھ افغانستان کے خلاف اتحاد کر لیا کیونکہ اس کے بادشاہ دوست محمد نے روس کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ انگریزوں اور رنجیت سنگھ نے افغانستان کے شکست خوردہ حکمران شاہ شجاع سے معاہدہ کر لیا اور وہ اسے افغانستان کا تخت واپس دلانے میں کامیاب ہو گئے مگر وہاں پھر بغاوت ہو گئی اور انگریزوں کی فوج افغانستان سے واپس آتی ہوئی راستے میں ماری گئی۔ اسی دوران پنجاب کا رنجیت سنگھ اور افغانستان کا شاہ شجاع فوت ہو گئے۔

اس سے پہلے انگریزوں نے سندھ کے ذریعے اپنی فوج کی راہداری کو یقینی بنانے کے لیے 1839ء میں کراچی کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور معاہدے کے تحت پانچ ہزار انگریز فوج کے سندھ میں مستقل قیام کی اجازت حاصل کر لی گئی تھی اور تجارت پر ٹیکس سے چھوٹ بھی حاصل کر لی گئی تھی۔ خیرپور کے میروں سے ایک معاہدے میں سکھر کا قلعہ انگریزوں نے

اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور وہاں کے حکمران شیر محمد نے پچاس ہزار روپے سالانہ خراج ادا کرنا منظور کر لیا تھا۔

افغانستان میں پہلی جنگ میں انگریزوں نے شکست کی ذلت اٹھانے کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ اب دوسری افغان جنگ سے پہلے سندھ پر قبضہ ضروری ہے۔ برطانوی گورنر جنرل آکلینڈ کی برطرفی کے بعد لارڈ ایلن برو کو نیا گورنر جنرل بنایا گیا تھا جس نے اپنے ایک جرنیل چارلس نیپئر کو سندھ فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ نیپئر نے جنوری 1843ء میں خیر پور پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا پھر وہ حیدر آباد کی طرف بڑھا جہاں میانی کے مقام پر اس کا تصادم 17 فروری کو میروں کے بلوچ لشکر کے ساتھ ہوا۔ چارلس نیپئر ایک مرتبہ پھر کامیاب رہا اور 22 مارچ 1843ء کو میرپور کے حکمران شیر محمد کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کا پورے سندھ پر قبضہ ہو گیا۔

انگریزوں کے قبضے کے بعد سندھ کو صوبے کا درجہ دے دیا گیا جس میں کراچی، حیدر آباد اور شکار پور کے اضلاع شامل تھے۔ ٹیکسوں کی وصولی کے لیے انتظامات میروں کے مقرر کردہ اہلکاوں کے پاس ہی رہنے دیے گئے۔ میروں کو نقد پینشنیں دی گئیں اور انہیں جاگیریں رکھنے کی اجازت بھی دی گئی۔ سندھ کے تمام جاگیرداروں کو نیپئر کے دربار میں 'سلام' کرنے کے لیے بلایا گیا تاکہ وہ انگریز حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری وابستہ کرنے کا اعلان کریں۔ ایسا ہی ہوا اور تمام جاگیرداروں نے حاضر ہو کر سلام کیا اور وفاداری کا یقین دلایا۔ یوں سندھ کے قریباً دو ہزار جاگیرداروں کی جاگیروں کو بحال رکھا گیا۔ نیپئر اپنے

عہد ے سے اکتوبر 1840ء میں ریٹائر ہوا۔ اس نے سندھ پر ساڑھے چار برس حکومت کی اور سندھ نے صرف اسی دوران علیحدہ صوبے کے طور پر کام کیا۔ بعد ازاں سندھ کا صوبائی درجہ ختم کر دیا گیا اور اسے بمبئی پریزیڈنسی میں شامل کر دیا گیا اور اس کے انتظام کے لیے ایک کمشنر مقرر کیا گیا۔

1852ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فیصلہ کیا کہ سندھ میں نچلے درجہ کے کام کے لیے سندھی زبان کو اپنایا جائے اور کمشنر فریئر نے سندھی زبان کا رسم الخط بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی نے سندھی کا رسم الخط عربی رسم الخط نسخ کو بنیاد بنا کر تیار کیا کیونکہ عربی سمہ دور سے ہی سندھ کی سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ 1886ء میں سندھی زبان کو ان تمام مدرسوں میں لازمی قرار دے دیا گیا جن کو مُلّا چلاتے آرہے تھے۔ اس ضمن میں ان مدرسوں کو سرکاری گرانٹ بھی دی گئی مگر ملا عربی رسم الخط میں ذرا سی تبدیلی کو بھی اپنے عقیدے کے خلاف سمجھتے تھے جبکہ سندھی رسم الخط تیار کرنے کے لیے نسخ میں کئی تبدیلیاں کی گئیں تھیں۔

جب مدرسوں میں نئے رسم الخط کو رائج نہیں کیا گیا تو 1914ء میں تمام مدرسوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور یوں نیا سندھی رسم الخط رائج ہو گیا۔ اسی دوران اس رسم الخط میں مزید تبدیلیاں کر کے اسے قابلِ قبول بنایا گیا۔ برطانوی حکومت نے سندھی زبان میں کتب شائع کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کی اور سب سے پہلے "شاہ جو رسالو" اور سندھی زبان کی گرائمر کی دو کتابیں، جنہیں انگریزوں نے لکھا تھا، سرکاری خرچ پر چھپوائی گئیں۔ بعد ازاں بہت سی دیگر کتب

بھی سندھی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس ضمن میں مرزا قلیچ بیگ کا نام قابلِ ذکر ہے جنہوں نے 350 کتابیں سندھی زبان میں لکھیں، ترجمہ کیں اور مرتب کیں۔

1857ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کوٹری سے کراچی تک ریلوے لائن بچھانے کی منظوری دی مگر اسی سال میرٹھ میں جنگِ آزادی بھڑک کر ہندوستان بھر میں پھیل گئی جس کی وجہ سے یہ کام معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ 1861ء میں کوٹری سے کراچی تک ریلوے لائن کی دوبارہ منظوری دی گئی اور 1880ء میں نارتھ ویسٹرن ریلوے مکمل ہو گئی۔ اس ریلوے لائن نے دوسری افغان جنگ میں انگریزوں کو کامیاب کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

1866ء میں بمبئی کے ضابطۂ دیوانی کا سندھ پر بھی اطلاق شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے ہندو ساہوکار زرعی مقاصد کے لیے زمینداروں کو جو قرضے دیتے تھے وہ نقد یا جنس کی صورت میں وصول کرتے تھے مگر اس ضابطۂ دیوانی کے تحت انہیں مقروض زمینداروں کی زمینیں قرق کروانے کا حق حاصل ہو گیا۔ اس صورتِ حال نے سندھ کے حالات کو بدلنا شروع کیا اور سندھ کی زمینیں ساہوکاروں کو منتقل ہونا شروع ہو گئیں۔

اس سے پہلے سندھ میں ایک بھی ہندو ساہوکار زمیندار نہیں تھا جبکہ 1892ء میں 200 ایکڑ یا اس سے زیادہ رقبے کے مالک ہندو ساہوکاروں کی تعداد 1771 ہو گئی۔ 1896ء تک 59 فیصد مسلمان زمیندار ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہو چکے تھے اور 42 فیصد قابلِ کاشت رقبہ ہندو ساہوکاروں کی ملکیت میں چلا گیا تھا۔ سندھ کے ہاریوں کا حال بہت برا تھا۔ 1901ء میں انگریزوں نے نارا

کے تعلقہ کے چار دیہاتوں میں ہاریوں کے حالات کے بارے میں انکوائری کروائی جس سے یہ پتا چلا کہ 1774 ہاریوں میں سے 366 تو اپنے زمینداروں کے مقروض تھے جبکہ 1157 ہاریوں نے ساہوکاروں سے قرض لے رکھا تھا۔

1881ء میں سندھ میں 79 فیصد مسلمان، 12 فیصد ہندو، تقریباً پانچ فیصد سکھ اور تقریباً تین فیصد دوسرے مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ 1882ء میں ایجوکیشن کمشنر کی رپورٹ کے مطابق بمبئی یونیورسٹی سے صرف ایک مسلمان نے ایم اے اور دو نے بی اے کیا تھا۔ 1901ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق قریباً ساڑھے سات لاکھ ہندوؤں میں تعلیم کا تناسب 9.3 فیصد تھا جبکہ ساڑھے چوبیس لاکھ مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب صرف 0.1 فیصد تھا۔

سندھ کی تاریخ میں اب تک جاگیرداروں کا اہم کردار چلتا آرہا تھا۔ جاگیردار اشرافیہ کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جو زمیندار یا جاگیردار تھے جنہیں سندھ میں سردار یا وڈیرہ کہا جاتا تھا اور دوسرے پیر صاحبان تھے جو زرعی اشرافیہ میں جاگیردار ہونے کی حیثیت سے شامل تھے۔ ان میں روحانی رہبر ہونے کی اضافی خصوصیت بھی تھی۔ سندھ میں جتنے بھی حکمران آئے انہوں نے ان جاگیرداروں اور پیروں کے ذریعے ہی مقامی آبادی پر اپنا اثرورسوخ برقرار رکھا۔ جب بھی حکمرانوں کو کوئی سیاسی بحران درپیش ہوتا یا انہیں خود کو مضبوط کرنے کی ضرورت پڑتی تو وہ انہی پیروں اور جاگیرداروں کو مضبوط کرتے، انہیں مزید جاگیریں دیتے یا پھر نئے لوگوں کو جاگیردار بناتے۔

تالپوروں کے آخری دور میں خود ان کے اندرونی نفاق کی وجہ سے

بہت زیادہ جاگیریں تقسیم کی گئیں۔ انگریزوں سے پہلے یہ جاگیریں کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔ ملکیت کا حق صرف بادشاہ یا مقامی حکمران کے پاس ہوتا تھا۔ جاگیردار کے مرنے کے بعد جاگیریں واپس حکومت کے پاس چلی جاتی تھیں۔ یوں جاگیر صرف ذریعہِ آمدنی تھی ملکیت نہیں تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں ذاتی ملکیت کا نظام متعارف کروایا اور یہی نظام سندھ میں بھی جاری کیا گیا۔ سندھ فتح ہونے کے بعد انگریزوں نے پیروں اور جاگیرداروں کی بالادستی کو برقرار رکھا اور ان ہی کے ذریعے اپنا نظام چلانے کا تہیہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے زمینیں ان جاگیرداروں کی دوامی ملکیت میں دے دیں۔

ذاتی ملکیت کے اس نئے نظام نے فرسودہ جاگیرداری نظام کو پھر سے نئی زندگی دے دی۔ انگریزوں نے تمام جاگیرداروں اور پیروں کی جاگیریں برقرار رکھیں مگر صرف اس شرط پر کہ وہ حکومتِ برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا اظہار کریں۔ انہیں انگریز دربار میں حاضر ہو کر 'سلام پروانہ' حاصل کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ سلام پروانہ ہی جاگیروں کو ان کی ذاتی ملکیت میں تبدیل کرنے کے کام آیا۔ تمام جاگیرداروں نے حاضر ہو کر سلامی دی اور پروانہ حاصل کیا مگر پیروں کا روحانی تفاخر اس سلسلے میں ایک حد تک رکاوٹ بنا۔ کچھ پیر صاحبان نے اپنے نمائندے بھیجے جنھیں اسی وقت یا بعد ازاں قبول کر لیا گیا۔ جو نہیں حاضر ہوئے ان کی جاگیریں منسوخ کر دی گئیں مگر بعد ازاں ان کی درخواستوں پر بحال کر دی گئیں۔

انگریزوں نے بھی ہر سطح کے دربار سجا لیے گو کہ وہ گزشتہ حاکموں سے

مختلف دربار تھے۔ ضلعی سطح پر کلکٹر صاحب کا دربار لگتا تھا جس میں مقامی جاگیرداروں اور پیروں کو کرسی عطا کی جاتی تھی۔ یہ کرسی حاصل کرنے کے لیے پیر اور جاگیردار درخواستیں دیتے اور سفارش کا استعمال بھی کرتے۔ ان کرسیوں کے نمبر ہوتے تھے اور بہتر درجے یا نمبر کی کرسی حاصل کرنے کے لیے بھی تگ ودو کی جاتی۔ کچھ پیر صاحبان دربار میں نہیں جاتے تھے مگر ان کے نمائندے وہاں موجود ہوتے تھے یا پھر سرکار کی طرف سے انہیں غیر حاضری کی اجازت ہوتی تھی۔ کلکٹر کے درباری ہی کمشنر کے دربار تک پہنچتے تھے اور وہاں سے گورنر جنرل کے دربار تک رسائی پاتے تھے۔ انگریز سرکار نے آتے ہی جن لوگوں کو ملکیت کے حقوق عطا کیے ان میں دو سو ایکڑ سے زیادہ رقبے کے مالکوں کی کل تعداد 7620 تھی جبکہ بے زمین ہاریوں کی تعداد 20 لاکھ تھی۔

گذشتہ حکمرانوں کی طرف سے جاگیروں کے علاوہ کئی طرح کے اعزازات اور وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ انگریز سرکار نے ایک حد تک اس پالیسی کو جاری رکھا۔ گذشتہ حکمران وظائف کے عوض ان لوگوں سے 'دعا' کی طلب کرتے تھے جبکہ انگریزوں کو ان پیروں کی دعاؤں کی خاص ضرورت نہیں تھی لہٰذا انہوں نے اس کی عبارت تبدیل کر کے 'دعا' کو 'فرمانبرداری' کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کو دربار میں کرسی، طلائی اور نقرئی کتابت میں آفرین نامے، لنگیاں، منقش تلواریں، بندوقیں اور اسلحے کے لائسنس وغیرہ جیسی مراعات بھی ملنا شروع ہو گئیں۔ اس کے علاوہ کئی طرح کے خطابات بھی دیے جانے لگے جو اعزازات کی فہرست میں آتے تھے۔ تمام جاگیریں، وظائف اور

اعزازات کی بنیادی شرط انگریزوں سے وفاداری تھی اور وفاداری کا امتحان سڑکوں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی کے لیے مزدور مہیا کرنا اور مجرموں کو گرفتار کرانا ہوتا تھا۔

انگریزوں کو سندھ میں کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ شروع ہی میں میانی کے مقام پر تالپوروں کے بلوچ فوجیوں سے ایک معرکہ ہوا تھا جس میں انگریز باآسانی فتح یاب رہے تھے۔ پھر 1890ء کے اردگرد حروں کی بغاوت ہوئی۔ حر روہڑی کے نزدیک پیر پگاڑو کے مرید تھے۔ حروں کی بغاوت دراصل سماجی سطح کی شورش تھی جس میں حر غیر حر زمینداروں اور بنیوں وغیرہ کو لوٹ لیتے تھے یا پھر پیر پگاڑو کو نہ ماننے والوں کو قتل کر دیتے تھے۔ انگریزی حکومت انہیں مجرم سمجھ کر گرفتار کرنا چاہتی تھی مگر حروں کی برادری ان باغیوں کی عزت واحترام کرتی تھی جس کی وجہ سے وہ گرفتار نہیں ہوتے تھے۔ اگر کوئی پکڑا بھی جاتا تو اس کے خلاف گواہ نہیں ملتے تھے۔ ان حر باغیوں کی کاروائیاں بڑھتی گئیں جس سے پیر پگاڑو لوگوں میں مزید مضبوط ہو گئے اور طاقت کی علامت سمجھے جانے لگے۔ ان کی مالی حیثیت بھی مستحکم ہو گئی اور انہوں نے شاہانہ لباس پہننا اور تخت پر بیٹھنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف انگریز حکومت کی نظر میں پیر صاحب مشکوک تھے لہٰذا سرکار ان پر دباؤ بڑھاتی رہی کہ وہ اپنے مرید حروں کو امن وامان کی تلقین کریں۔ جب پیر صاحب کو یہ اندیشہ ہوا کہ انگریز ان کی سماجی و مالی حیثیت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں تو انہوں نے واضح طور پر حروں کو پرامن رہنے کی تلقین

بھی کی اور سرکار کے سامنے پرتشدد کاروائیاں کرنے والوں سے لاتعلقی کا اظہار بھی کیا۔ ان حالات کے باوجود حروں کی پر تشدد کاروائیاں جاری رہیں۔ زیادہ شورش 1890ء میں ہوئی جس میں پولیس سمیت کئی اہلکار قتل کر دیے گئے۔ اس دوران علاقے کے زمینداروں اور شاہوکاروں سے حر باغی بھتہ بھی وصول کرتے رہے۔ انگریز انتظامیہ نے پیر صاحب کو اپنے ساتھ ملا کر حروں کے خلاف کاروائیاں جاری رکھیں۔

حروں کو ان کے دیہاتوں سے نکال کر دوسرے دیہاتوں میں اس طرح رکھا گیا کہ وہ علاقے ان کے لیے ایک بڑی جیل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ وہ دن کے وقت اپنے کام کاج کر سکتے تھے مگر شام ہوتے ہی انہیں اپنے گھروں میں حاضر رہنا ہوتا تھا۔ ان کے گھروں کی تلاشیاں لی جاتی تھیں اور انگریز پولیس انہیں پر امن رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ حروں کے علاقوں میں مزید پولیس چوکیاں قائم کی گئیں۔ ان پر آنے والے اخراجات بھی حر زمینداروں سے وصول کیے گئے۔ آخر انگریزوں نے باغی حروں کے رہنما وریام کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور کچھ عرصے بعد اس کے بیٹے بچو نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

انگریزوں نے 1843ء میں سندھ فتح کرنے کے چار برس بعد اس کی صوبائی حیثیت ختم کر کے اسے بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ بنا دیا تھا اور اس کے لیے کمشنر مقرر کر دیا تھا۔ سندھ کے بمبئی سے الحاق کا زیادہ فائدہ ہندو تاجر طبقے کو ہوا۔ ان کی تجارت تیزی سے پھیلنے لگی۔ انہوں نے انگریز عملداری کے علاقوں میں اپنے تجارتی مراکز کھولے۔ کراچی کو کلکتہ کے بعد انگریز نے تجارتی

بندرگاہ کے طور پر ترقی دی تو کراچی میں بھی ہندو تاجر طبقے کا غلبہ ہو گیا۔ بمبئی کے ضابطۂ دیوانی کے اطلاق کی وجہ سے سندھی ہندو بنیوں کو زمیندار بننے کے مواقع ملے اور سندھ کی بیشتر زمین ان کے قبضے میں چلی گئی۔ ہندو تاجروں نے سندھ کے کئی شہروں کو ترقی دی۔ حیدر آباد، شکارپور، لاڑکانہ، میرپور خاص اور نواب شاہ سندھ کے جدید شہر بن کر ابھرے۔ انہوں نے تعلیمی ادارے بھی قائم کیے اور سندھ کے ہندو تاجر باقی آبادی کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ ہو گئے۔ انہوں نے رفاعِ عامہ کے کام بھی کیے جیسے ہسپتال کھولے گئے اور کنوئیں اور سرائیں بنائی گئیں۔

سندھ میں ہندو اقلیت میں تھے جبکہ مسلمان اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی کم ترقی یافتہ اور کم تعلیم یافتہ تھے۔ بہت تھوڑے زمینداروں کے بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہندو اقلیت ہونے کے باوجود انتظامی عہدوں پر قابض تھے، سیاسی سطح پر بااثر تھے اور معاشی سطح پر مضبوط تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس تاجر طبقے میں ایک ابتدائی نوعیت کی قوم پرستی ظاہر ہوئی۔ انہوں نے سندھی زبان کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سندھی زبان میں ادبی کتب لکھی اور چھاپی گئیں۔ سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کا ایک سہ ماہی جرنل شائع کیا گیا۔

اس دوران سندھ کی تاریخ کی تشکیل کافی اہم بات تھی۔ ہندو تاجر طبقے کے لیے زبان و ثقافت کا اشتراک ڈھونڈنا اس لیے ضروری تھا کہ اس طرح سندھی معاشرے میں مختلف مذاہب رکھتے ہوئے بھی لوگوں میں تفریق کے احساس کو کم

کیا جا سکتا تھا۔ یہ تاجر طبقہ سندھ میں قومی یکجہتی تو چاہتا تھا مگر سندھ کو علیحدہ صوبائی حیثیت دیے جانے کے حق میں نہیں تھا۔ انہیں اس بات کا خطرہ تھا کہ مسلمانوں کی عددی اکثریت کی وجہ سے مسلمان جاگیردار سیاسی سطح پر غالب آسکتے ہیں اور بعد ازاں ایسا ہی ہوا۔ سندھ کی صوبائی حیثیت پر اختلاف اصل میں سندھی جاگیردار اور سندھی تاجروں کے درمیان تضاد کی نشاندہی کرتا تھا۔

ابتدا میں تو سندھ کے جاگیرداروں کو احساس نہیں ہوا کہ ان کی حیثیت مسلسل کم ہوتی جارہی ہے مگر آہستہ آہستہ یہ احساس شدت پکڑتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمان جاگیردار سیاسی عناصر میں مسلم قومی تصور جڑ پکڑتا چلا گیا۔ اسی دوران ریشمی رومال تحریک شروع ہوئی تو سندھ کے علماء نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ریشمی رومال پر پیغامات لکھ کر بھیجے۔ یہ پیغامات دیوبند کے علاوہ سندھ میں بھی پہنچے جو آخر کار پکڑے گئے تو حکومت نے سندھ کے کئی علماء کو گرفتار کر کے ان کو قید بامشقت کی سزائیں دیں۔ اسی طرح ہجرت تحریک سندھ میں جان محمد جونیجو نے شروع کی جو لاڑکانہ میں وکالت کرتے تھے۔ اس تحریک میں بھی بہت سے علماء کرام کو سزائیں دی گئیں۔

حروں کی دوسری اور بڑی بغاوت 1941ء میں پھوٹی۔ 1892ء کی بغاوت انگریزوں نے کچھ عرصے میں کچل دی تھی مگر انہوں نے حروں کے خلاف کاروائیاں جاری رکھیں تھیں۔ پولیس اور مال کے محکموں نے حروں پر بے پناہ ظلم و تشدد جاری رکھا۔ جو بھی اس ظلم و تشدد کے نتیجے میں ڈاکہ زنی اور

قتل کی وارداتوں کا ارتکاب کرتے رہے۔ چونکہ پولیس ان حروں کو پر امن طریقے سے کاشت کاری نہیں کرنے دیتی تھی لہٰذا غیر قانونی ذرائع کی طرف ان کی رغبت قدرتی تھی۔ اس بغاوت سے پہلے حروں کے رہنما پیر پگاڑو کو انگریز سرکار نے آٹھ برس قید کی سزا دے دی تھی۔ پیر صاحب کو تین برس ہندوستان کی مختلف جیلوں میں گزارنے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

جیل میں ان کی ملاقات بہت سے سیاسی لوگوں سے ہوئی جن میں پنجاب اور بنگال کے تشدد پسند انقلابی بھی شامل تھے۔ پیر صاحب نے اپنے گاؤں واپس آکر اپنے مریدوں کو کھدر پہننے اور گائے کا گوشت نہ کھانے کی تلقین کی۔ سندھ میں ہاتھ کی کھڈی کا کھدر پہننے کی تحریک چلائی گئی۔ مئی 1942ء میں حروں کی بغاوت کھل کر اس وقت منظر عام پر آئی جب انہوں نے ٹنڈو آدم کے نزدیک ٹرین کو پٹڑی سے اتار دیا۔ اس حادثے میں 22 افراد ہلاک ہو گئے۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق حروں نے 1942ء کے پہلے تین مہینوں میں 25 مقامات پر ریلوے اور تار کے نظام کو نقصان پہنچایا اور 45 افراد کو قتل کیا جن میں زیادہ تعداد پولیس ملازمین کی تھی۔

یکم جون 1942ء کو سندھ میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جو انتہائی سخت تھا۔ کسی شخص کو ایک چاقو تک اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ سرسری سماعت کی فوجی عدالتیں قائم کی گئیں جنہوں نے دھڑا دھڑ حروں کو سزائیں سنائیں۔ یہ مارشل لاء سندھ میں قریباً ایک برس جاری رہا۔ اس دوران کئی علاقوں میں کرفیو بھی نافذ کیا جاتا رہا۔ جس فوج نے حروں کو کچلنے کی کوشش

میں ان سے جنگ کی ان کی تعداد تیس ہزار تھی۔ اس کے علاوہ حروں کے خلاف ہوائی فوج نے بمباری بھی کی۔ ایک اندازے کے مطابق قریباً تیس ہزار حر باغی قتل کیے گئے اور ہزاروں کو قید کر لیا گیا۔ فوج نے پیر پگاڑو صبغت اللہ کے گاؤں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش بھی کی۔ مارشل لاء نے 69 حروں کو پھانسی پر چڑھایا اور پیر صاحب پگاڑو کو بھی 1942ء میں بغاوت کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔

سندھ کو صوبائی حیثیت دلوانے کے لیے سندھ کی جاگیر دار اشرافیہ آہستہ آہستہ مائل ہو رہی تھی۔ شروع میں یہ تحریک درمیانے طبقے کے پڑھے لکھے مسلمانوں تک محدود تھی۔ کراچی میں ایک وکیل حسن علی آفندی نے محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کی سندھ شاخ قائم کی جو سندھ کے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے کام کرنے لگی۔ یہ ایسوسی ایشن سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم اور ترقی کی جانب راغب کرنے لگی۔ آگے چل کر اس نے سندھ کو علیحدہ صوبے کا درجہ دینے کی آواز بھی اٹھانی شروع کی۔ اسی دوران سندھ کے مسلمانوں میں درمیانے طبقے کے علماء نے مسلم قوم پرستی کے نام پر بہت کام کیا جس میں خلافت کی تحریک نمایاں تھی۔ خلافت کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور بہت سے لوگ اپنے گھربار چھوڑ کر افغانستان چلے گئے اور کئی گرفتار بھی ہوئے۔

مسلم لیگ نے پہلی دفعہ 1925ء میں سندھ کو علیحٰدہ صوبے کا درجہ دینے کی حمایت کی۔ یہ حمایت مسلم لیگ کے علی گڑھ میں ہونے والے سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک قرارداد کے ذریعے ظاہر کی گئی۔ اس قرارداد میں کہا

گیا تھا کہ سندھ کی بمبئی کے ساتھ شمولیت کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ سندھی عوام کے مفاد کے خلاف ہے اس لیے مسلم لیگ کی رائے میں اسے علیحدہ صوبہ بنا دینا چاہیے۔ اس کے بعد سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ مسلمانوں کی کل ہند سیاست کا حصہ بن گیا۔ 1928ء میں کانگرس نے سندھ کی صوبائی حیثیت کی مشروط حمایت کر دی۔ اس نے شرائط سندھ کے ہندو تاجروں کے تحفظ کے پیشِ نظر رکھی تھیں۔

سندھ کے جاگیر داروں میں بھی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ زور پکڑ تا جا رہا تھا مگر پھر بھی ایک طرح کا عنصر موجود تھا جو اس کی حمایت نہیں کرتا تھا۔ 1928ء میں بمبئی کی صوبائی اسمبلی نے سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے سر شاہنواز بھٹو کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی حمایت نہیں کی۔ اس کمیٹی کے صرف دو ارکان سید میراں محمد شاہ اور غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنے اختلافی نوٹ میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کیا تھا حالانکہ بھٹو کمیٹی کے سامنے سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے وفد نے سندھ کی علیحدگی کے بارے میں کیس پیش کیا تھا۔

ایوب کھوڑو نے اس سلسلے میں کافی جدوجہد کی۔ اس نے ایک پمفلٹ بھی لکھا اور سیٹھ عبداللہ ہارون اور جی ایم سید کے ہمراہ قائدِ اعظم سے ملاقات کر کے سندھ کی علیحدگی کا کیس پیش کیا۔ اسی سال دہلی میں سر آغا خان کی صدارت میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس نے مسلمانوں کی طرف

سے چودہ نکاتی مطالبات پیش کیے، جن میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مسئلہ سرِ فہرست تھا۔ 1929ء میں ان چودہ نکات کو مسلم لیگ نے قبول کر لیا جو بعد ازاں جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے۔

نومبر 1930ء میں سائمن کمیشن کی رپورٹ پر گول میز کانفرنس منعقد کی گئی۔ لندن میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں سندھ کے مسئلے پر غور کرنے والی کمیٹی کے سامنے سر غلام حسین ہدایت اللہ اور قائدِ اعظم نے سندھ کی علیحدگی کے حق میں پر زور دلائل دیے۔ سر شاہنواز بھٹو بھی علیحدگی کے حق میں ہو چکے تھے اور انہوں نے بھی علیحدگی کی حمایت کی۔ سب کمیٹی نے 16 جنوری 1931ء کو کثرتِ رائے سے علیحدگی کی تجویز کو منظور کر لیا۔ اگست 1932ء میں حکومتِ برطانیہ نے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ صوبہ تسلیم کر لیا مگر شرط رکھی کہ سندھ کی 71 فیصد مسلم آبادی کو صوبائی اسمبلی میں 60 فیصد نشستیں ملیں گی جبکہ ہندوؤں کی 27 فیصد آبادی کو 40 فیصد نشستیں ملیں گی۔ گول میز کانفرنس کی سفارشات کے مطابق ہندوستان کے آئینی بل کی برطانوی پارلیمنٹ نے اگست 1935ء میں منظوری دے دی جس کے تحت سندھ کو علیحدہ صوبائی حیثیت حاصل ہو گئی۔

1935ء کے آئینی بل کے بعد ہندوستان میں انتخابات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سندھ میں سر غلام حسین، سر شاہنواز بھٹو اور سیٹھ عبداللہ ہارون نے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی طرز پر غیر فرقہ وارانہ سطح کی سندھ یونائیٹڈ پارٹی تشکیل دی۔ سر غلام حسین کا عہدوں پر اختلاف ہو گیا تو اس نے ایوب کھوڑو اور

بندے علی تالپور کے ساتھ مل کر سندھ مسلم پارٹی بنالی۔ سندھ کے مسلم ارکان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے قائدِ اعظم سے بھی کہا کہ وہ سندھ کے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ 1937ء میں انتخابات ہوئے تو سندھ اسمبلی میں پارٹی پوزیشن یہ تھی :

سندھ یونائیٹڈ پارٹی	=	18
سندھ ہندو سبھا	=	11
انڈی پینڈنٹ مسلم	=	09
کانگریس	=	08
سندھ مسلم پارٹی	=	04
سندھ آزاد پارٹی	=	03
انڈی پینڈینٹ ہندو	=	02
لیبر انڈیپنڈینٹ	=	01
آزاد	=	04
کل ممبرانِ اسمبلی	=	60

سر غلام حسین ہدایت اللہ کی سندھ مسلم پارٹی نے اگرچہ چار نشستیں حاصل کیں تھیں مگر انہوں نے ہندو ارا کینِ اسمبلی کے ساتھ مل کر حکومت قائم کر لی۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی اگرچہ سب سے بڑی پارٹی تھی مگر وہ سیکولر ہونے کے باوجود صرف مسلم اراکین پر مشتمل تھی اور ایک بھی ہندو رکن ان کی طرف سے اسمبلی میں نہیں آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس پارٹی میں جی ایم سید اور

ہاشم گزدر جیسے درمیانے طبقے کے افراد شامل تھے جن کا رجحان ترقی پسندی کی طرف تھا۔ دوسری طرف غلام حسین ہدایت اللہ اور اس کے ساتھی پنجاب کے سر سکندر حیات جیسے لوگ تھے جو انگریزوں کے لیے زیادہ قابلِ قبول تھے اور پھر یونائیٹڈ پارٹی میں میروں کا گروپ بھی ان کے ساتھ مل گیا تھا۔

1938ء میں ابھی صوبائی اسمبلی کو منتخب ہو کر کام کرتے ہوئے قریباً ایک برس ہی ہوا تھا کہ کانگریس اور انڈی پینڈینٹ ہندو پارٹی نے اتحاد کر کے سر غلام حسین کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا اور خان بہادر اللہ بخش کی وزارت بنوا دی گئی۔ اسی دوران جی ایم سید اور دوسرے مسلم لیڈروں نے سندھ میں مسلم لیگ قائم کرنے کے بارے میں سوچا۔ نو اکتوبر 1938ء کو کراچی میں مسلم لیگ کی پہلی صوبائی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں قائدِ اعظم کے علاوہ مولوی فضل الحق، سر سکندر حیات اور دوسرے مسلمان لیڈر بھی شریک ہوئے۔ سر عبداللہ ہارون کو سندھ مسلم لیگ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سندھ صوبائی اسمبلی کے اراکین میں مسلم لیگ کا اثر و نفوذ بڑھنے لگا۔

اسی اثناء میں سکھر میں ہندو مسلم کشیدگی پھیل گئی اور ہندو مہاسبھا کی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ اس سے پہلے مسجد منزل گاہ کی واگزاری کے لیے مسلم لیگ کے کارکنوں نے اس میں دھرنا مار لیا جو 48 دن جاری رہا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ مسجد منزل گاہ کو ہنومان مندر سے علیحدہ کر کے مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ ہندو مہاسبھا کی کانفرنس کے بعد حکومت نے مسلمانوں کی بات نہ مانتے ہوئے مسجد کو تالا لگا دیا اور مسلم لیگی

لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ اس کاروائی کے نتیجے میں ہندو مسلم فساد ہو گیا اور پولیس کو گولی چلانا پڑی۔ اس فساد میں 20 افراد ہلاک اور 23 زخمی ہو گئے۔

ہندو ممبرانِ اسمبلی نے اللہ بخش سے ناراض ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور جی ایم سید کی کوشش سے ہندوؤں نے مسلم لیگ سے اتحاد کر لیا جس کے نتیجے میں اللہ بخش مستعفی ہو گئے۔ جی ایم سید نے مسلم لیگ سے علیحدہ ایک سندھ نیشنلسٹ پارٹی بنا کر کچھ مسلم اراکین کی حمایت حاصل کر لی اور کانگریس کے ساتھ اتحاد کر کے میر بندے علی تالپور کی قیادت میں حکومت تشکیل دی اور خود بھی وزیر بن گئے۔ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ وزارت ناکام اور غیر مقبول ہونے لگی تو جی ایم سید نے پھر خان بہادر اللہ بخش کی مدد کر کے اس کی وزارت بنوادی۔

اللہ بخش کی انگریز سرکار سے دوستی زیادہ دیر نہیں چل سکی تو صوبائی گورنر نے اس سے استعفیٰ طلب کر لیا اور سر غلام حسین کو وزارت تشکیل دینے کے لیے کہا حالانکہ اس کے ساتھ اسمبلی کا ایک بھی ممبر نہیں تھا۔ اس وقت اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی مسلم لیگ تھی جس کا قائد محمد ایوب کھوڑو تھا۔ قائدِ اعظم نے اس وزارت کی مخالفت کی مگر پھر بھی ہاشم گزدر اور ایوب کھوڑو سر غلام حسین کی وزارت میں شامل ہو گئے۔ اس طرح نئے صوبے سندھ کے پہلے پانچ برسوں میں پانچ وزارتیں تبدیل ہوئیں۔

اس دوران سندھ میں مسلم قوم پرستی کی لہر تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔ سندھ مسلم لیگ میں لوگ شامل ہونے لگے خاص طور پر سندھ کی وہ جاگیردار

اشرافیہ جو سیاست میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ 1943ء میں وزیر اعلیٰ سر غلام حسین مسلم لیگ میں شامل ہو گیا اور ساتھ ہی اسمبلی کے دوسرے مسلم ممبران بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے حتیٰ کہ سندھ اسمبلی میں 36 مسلم ارکان اسمبلی میں سے 29 مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ چونکہ کانگریس کی 'ہندوستان چھوڑو تحریک' میں کانگریسی ممبران جیل جا چکے تھے لہٰذا مسلم لیگ کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو گئی۔ ایک برس کے اندر اندر، یعنی 1944ء میں، مسلم لیگ سندھ میں شامل افراد کی تعداد تین لاکھ ہو گئی۔ اسی دوران سندھ مسلم لیگ کا صدر جی ایم سید کو بنا دیا گیا یوں جماعت پر درمیانے طبقے کی قیادت اثرانداز ہونے لگی۔

اس قیادت کے سندھ کی حکومتی قیادت سے اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے کیونکہ یہ لوگ مسلم لیگ میں شامل تو ہو گئے تھے مگر یہ نمائندگی جاگیردار طبقے کی ہی کر رہے تھے۔ یہ اختلافات کافی عرصے تک چلتے رہے جس کی وجہ سے حکومت میں ردوبدل بھی آتا رہا۔ آخر کار جی ایم سید کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ جی ایم سید 1938ء سے 1944ء تک مسلم لیگ میں رہے پھر انہوں نے اپنا علیحدہ گروپ بنا لیا۔ 1946ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے جس میں پارٹی پوزیشن یہ رہی :

مسلم لیگ	=	28
کانگریس	=	21
جی ایم سید گروپ	=	04

اللہ بخش گروپ	=	03
یوروپین	=	03
لیبر	=	01
کل ممبرانِ اسمبلی	=	**60**

انتخابات کے بعد مسلم لیگ کی طرف سے سر غلام حسین ہدایت اللہ نے کابینہ تشکیل دی مگر اس کی وزارت زیادہ عرصے تک نہیں چل سکی کیونکہ ممبران کی وفاداریاں بدلتی رہیں جس کے نتیجے میں گورنر نے اسمبلی کو توڑ دیا۔ دو دسمبر 1946ء کو دوبارہ سے انتخابات کروائے گئے جب کے نتیجے میں مسلم لیگ کی اسمبلی میں 35 نشستیں ہوگئیں جو ایک واضح اکثریت تھی۔ اپوزیشن میں بڑی پارٹی کانگریس تھی جس کے پاس 19 ارکان تھے۔ اس اسمبلی نے نئے بننے والے ملک پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں فیصلہ کیا اور یوں یہ طے کیا گیا کہ سندھ نئے بننے والے ملک پاکستان کا حصہ ہوگا۔

انگریزوں نے سندھ پر سو برس سے بھی زیادہ حکومت کی۔ مجموعی طور پر ان کا دور پرسکون رہا سوائے حروں کی بغاوت کے اور اس بغاوت میں بھی سندھ کے جاگیرداروں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ سندھ کے جاگیردار ان کے سب سے طاقتور سیاسی حلیف رہے۔ انہوں نے ہر طرح سے انگریز کی فرمانبرداری اور اطاعت کی روش کو اپنائے رکھا۔ انگریزوں نے بھی ان کی وفاداری کے عوض انہیں عہدے، املاک، خطابات اور اعزازات سے مسلسل نوازا۔ سندھ کی آبادی ان چھ سات ہزار جاگیرداروں اور وڈیروں کے زیرِ اثر

انتہائی مفلوک الحالی اور پسماندگی کی قہر آلود زندگی بسر کرتی رہی۔ انگریزوں نے سندھ کے غریب عوام کو جاگیرداروں اور پیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور خود ان کے آقاؤں کے آقا بن کر حکومت کرتے رہے۔

سندھ میں تاجر طبقہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ انگریزوں نے ان کو قانونی تحفظ مہیا کر کے ایک مضبوط طبقہ بنا دیا جو تجارت بھی کرتا تھا اور زمینوں کا مالک بھی بن گیا تھا۔ ساہوکار زمینداروں کو چھوڑ کر عمومی طور پر ہندو سندھ میں درمیانے طبقے کے لوگ تھے جنہوں نے اس دور میں سرکاری ملازمتوں میں سب سے زیادہ حصہ حاصل کیا اور دیگر وہ تمام معاشی کام جو درمیانہ طبقہ کر سکتا تھا انہوں نے کیے۔

انگریزوں کے لیے سندھ کا ہندو تاجر طبقہ انتہائی قریبی دوست بن کر ابھرا۔ انگریزوں کی وجہ سے اس طبقے نے بہت تیزی سے معاشی ترقی حاصل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے سندھ کے معاشی منظر پر چھا گیا۔ انگریزوں نے ہندوؤں کی آبادی سے بڑھ کر ان کو سیاسی حیثیت دی حتیٰ کہ جب سندھ کو صوبے کا درجہ دیا گیا تو 27 فیصد ہندوؤں کو اسمبلی میں 40 فیصد نشستیں دی گئیں۔

سندھ میں انگریزوں کے دور میں سیاسی رجحانات تبدیل ہوتے چلے گئے۔ شروع میں سیکولر سیاست چلتی رہی مگر جوں جوں مسلم لیگ کا دو قومی نظریہ پھیلتا چلا گیا اور ہندو کانگریس میں اکٹھے ہونے لگے تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں واضح تفریق نظر آنے لگی۔ انگریزوں کے وفادار جاگیردار دیکھتے ہی دیکھتے مسلم لیگ سے وفا کی قسمیں کھانے لگے۔ اسی مسلم اشرافیہ نے قیامِ پاکستان کے بعد نئے ملک

میں سندھ کی بھاگ ڈور سنبھالی۔ ہندو اشرافیہ ہندوستان منتقل ہونا شروع ہوئی تو سندھ کے قائدین نے ان کو روکنے کی کوشش کی مگر منافرت کی خلیج اس قدر وسیع ہو چکی تھی کہ ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

انگریزوں کے دور میں سندھ میں ترقی کے نئے راستے کھلے۔ نئی زمینیں آباد کی گئیں۔ ریلوے، سڑکوں اور تار کا مواصلاتی نظام بنایا گیا۔ تعلیم کے نئے ادارے کھولے گئے اور ہسپتال قائم کیے گئے۔ کراچی کی بندرگاہ کو ترقی دی گئی اور کراچی نئے بننے والے پاکستان کا سب سے بڑا شہر بنا۔

پاکستان اور سندھ

قیامِ پاکستان سے قبل ہی سندھ کی صوبائی اسمبلی جو دسمبر 1946ء میں منتخب ہو کر آئی تھی نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ سندھ پاکستان کا صوبہ بنا اور مرکزی دارالحکومت کراچی طے پایا۔ 25 جولائی 1947ء کو سندھ کے وزیرِ اعظم غلام حسین ہدایت اللہ کو گورنر مقرر کر دیا گیا اور ان کی جگہ سندھ کے وزیرِ اعظم ایوب کھوڑو بن گئے (اس وقت صوبوں کے وزیرِ اعلیٰ کو وزیرِ اعظم کہا جاتا تھا)۔ سندھ کو صوبائی حیثیت حاصل ہونے کے دس سالہ مدت میں یہ بارہویں وزارت تھی۔

قیامِ پاکستان کے وقت پنجاب میں جو خون خرابہ ہوا تھا اس کا سندھ میں کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ ستمبر 1947ء میں کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی جو سندھی تھا اس نے سندھ کا دورہ کیا اور ہندو اشرافیہ کو سندھ چھوڑ کر ہندوستان چلے جانے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں سندھ سے ہندوؤں کی نقل مکانی شروع ہو گئی۔ ایوب کھوڑو اور سندھ مسلم لیگ نے ہندوؤں کو روکنے کی مسلسل کوششیں کیں۔ ان کوششوں میں قائدِ اعظم کی رضامندی بھی شامل تھی۔

ان تمام کوششوں کے باوجود ہندوؤں کا انخلا نہ صرف جاری رہا بلکہ تیز تر ہوتا چلا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ نیا بننے والا ملک پاکستان مسلمانوں کا ملک تھا اور ہندو اقلیت ہونے کی وجہ سے غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ دوسری بڑی

وجہ یہ تھی کہ ہندوستان سے مسلمان مہاجرین سندھ آنا شروع ہو گئے تھے اور ان کی آمد نے صوبہ میں کشیدگی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ اکتوبر اور نومبر 1947ء میں دہلی سے مرکزی حکومت کے قریباً پچیس ہزار مسلم ملازمین کراچی پہنچ گئے جن کے پاس رہنے کے لیے کوئی گھر نہیں تھا۔ نقل مکانی کر جانے والے ہندوؤں کے گھروں پر قبضہ کرنے کی مہم یہیں سے شروع ہوئی۔

پاکستان بنتے ہی سندھ میں سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی آمد بن گیا۔ سندھ کے سیاسی قائدین خاص طور پر جی ایم سیّد اور دوسرے حضرات پہلے ہی یہ محسوس کر رہے تھے کہ پاکستان بننے سے ملک پر پنجاب کا غلبہ ہو جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ کی حکومت نہ صرف ہندوؤں کے انخلاء کے خلاف تھی بلکہ وہ مہاجرین کی سندھ میں آمد کی مزاحمت بھی کر رہی تھی۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی مشرقی پنجاب سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مہاجرین سندھ پہنچ گئے۔ مرکزی حکومت نے مہاجرین کی بحالی کے لیے وزارتِ بحالیات قائم کر دی تھی۔

سندھ کی حکومت اور دیگر قائدین کو مرکزی حکومت کے حد سے زیادہ اختیارات سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ اگر اردو بولنے والے اور پنجابی مہاجرین کے سیلاب کو نہ روکا گیا تو سندھ میں سندھی نہ صرف اقلیت بن جائیں گے بلکہ ان کے تہذیبی ورثہ کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا 20 اکتوبر 1947ء کو سندھ مسلم لیگ نے صوبائی خود مختاری کے حق میں قرارداد پاس کی۔ اس کے علاوہ سندھ اسمبلی نے بھی قرارداد کے ذریعے سندھ کے مقامی باشندوں کو تحفظ فراہم کرنے کی اپیل کی۔

ان قراردادوں کے پیشِ نظر حکومتِ پاکستان نے دسمبر 1947ء میں لاہور میں ایک بین الصوبائی مہاجر کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ صوبہِ سندھ میں پانچ لاکھ، صوبہ سرحد میں ایک لاکھ، اور بہاولپور اور خیرپور کی ریاستوں اور صوبہ بلوچستان میں پچاس پچاس ہزار مہاجرین کو آباد کیا جائے گا جبکہ بقیہ مہاجرین پنجاب میں آباد کیے جائیں گے۔ اس وقت تک ہندوستان سے پچاس لاکھ کے قریب مہاجرین پنجاب پہنچ چکے تھے۔

سندھ کے وزیرِ اعظم ایوب کھوڑو نے کانفرنس سے واپس آکر پھر مرکزی حکومت کو یہ کہا کہ وہ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ مہاجرین قبول نہیں کریں گے۔ اسی دوران یوپی اور دیگر علاقوں سے اردو بولنے والے مہاجرین کی آمد تیزی سے کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں شروع ہوئی۔ چوہدری خلیق الزمان نے پہلے اور لیاقت علی خان نے بعد ازاں ان مہاجرین کی آمد کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ہندوؤں کی متروکہ املاک کو ان مہاجرین میں بانٹنا بھی شروع کر دیا۔

مارچ 1948ء میں ایوب کھوڑو نے اپنی تقریر میں شکایت کی کہ حکومت نے صوبوں کو مہاجرین کی آبادکاری کے لیے صرف ڈیڑھ کروڑ روپے دیے ہیں جبکہ سندھ میں اب تک دس لاکھ مہاجرین پہنچ چکے ہیں۔ مہاجرین کے مسئلے پر سندھ کی صوبائی حکومت کے مرکزی حکومت کے ساتھ اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ایوب کھوڑو سندھ کے مفادات کے تحفظ میں پیش پیش تھے جبکہ دیگر سیاسی عناصر میں جی ایم سید اور سندھ کی طلبا تنظیمیں احتجاج جاری رکھے ہوئیں تھیں۔ یہ وہ تضادات تھے جن کی بنیاد پر ایوب کھوڑو

کو حکومت سے باہر کر دیا گیا اور ان کے خلاف کرپشن کے کیس بنا دیے گئے اور سندھ میں پیر الٰہی بخش کی حکومت بنا دی گئی۔

دوسرا بڑا مسئلہ جو سندھ کو درپیش ہوا وہ کراچی کی سندھ سے علیحدگی کا تھا۔ جون 1947ء میں جب برِ صغیر کی تقسیم کا منصوبہ طے پا گیا تو قائدِ اعظم نے تب ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا جائے گا۔ یہی ہوا اور پاکستان کے مرکزی دفاتر کراچی منتقل کر دیے گئے۔ سندھ مسلم لیگ اور ان کی صوبائی حکومت کا خیال تھا کہ کراچی عارضی طور پر دارالخلافہ چنا گیا ہے جسے بعد ازاں تبدیل کر دیا جائے گا۔ کراچی کے دارالحکومت بننے کے بعد اس شہر کے انتظامی معاملات چلانے میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے اربابِ اختیار میں کشیدگی پیدا ہونے لگی تھی۔ اب یہ تجویز منظرِ عام پر آنے لگی کہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے وفاقِ پاکستان کے ماتحت کر دیا جائے گا۔

سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف قرارداد پاس کی۔ سیاسی قیادت بھی اس معاملے میں خاصی متفکر ہوئی جس کے نتیجے میں سندھ مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی تجویز پر سخت احتجاج کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی سندھ اسمبلی میں بھی ایسی ہی قرارداد منظور کی گئی۔ ان سب باتوں کے باوجود پاکستان کے وزیرِ داخلہ نے مئی 1948ء میں اسمبلی میں قرارداد پیش کی کہ کراچی کو پاکستان کا مستقل دارالحکومت بنایا جائے اور اس کا انتظام مرکزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ قرارداد کے خلاف سندھ کے ہاشم گزدر اور ایوب کھوڑو نے سخت احتجاجی تقاریر

کیں جبکہ لیاقت علی خان اور فیروز خان نون نے سندھی موقف کو صوبائی عصبیت کہہ کر رد کر دیا۔

اسمبلی نے قرارداد منظور کرلی اور کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ 23 جولائی 1948ء کو گورنر جنرل نے اس ضمن میں ایک آرڈیننس جاری کر دیا۔ کراچی کو مستقل دارالحکومت بنادیا گیا اور اس کا رقبہ 566.8 مربع میل طے کیا گیا۔ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کے نتیجے میں ایک طرف تو سندھ کے معاشی مفادات پر کاری ضرب پڑی اور دوسری طرف سندھ میں مہاجرین کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

سندھ میں ترقی پسند سیاسی تحریک نے بیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے عشرے میں اپنا اظہار شروع کر دیا تھا۔ کراچی میں مزدور اور ٹریڈ یونین تحریک شروع ہو گئی تھی۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں اس ٹریڈ یونین تحریک میں سے ہی سندھ کی ہاری تحریک نے جنم لیا۔ حیدر بخش جتوئی اور عبدالمجید سندھی نے ان ٹریڈ یونین لیڈروں کے ساتھ مل کر ہاری کانفرنس میر پور میں منعقد کی جس کے نتیجے میں سندھ ہاری کمیٹی وجود میں آئی۔ حیدر بخش جتوئی سندھ کے ہاری لیڈر بن کر ابھرے جنہیں بعد ازاں بابائے سندھ کہا گیا۔

جیئے سندھ کا نعرہ بھی حیدر بخش جتوئی کی تخلیق تھا جسے بعد ازاں قوم پرستوں نے اپنا لیا۔ سندھ ہاری کمیٹی کو کانگریس کی حمایت حاصل تھی اور کانگریس نے جاگیرداری کے خاتمے کو اپنے منشور کا حصہ بنا لیا تھا۔ 1936ء میں سندھ کے بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد ہاری تحریک میں مزید شدت

آگئی اور سیاسی پارٹیوں کی توجہ ان کی جانب مبذول ہونے لگی۔ حتیٰ کہ 1943ء میں مسلم لیگ نے کراچی اجلاس میں یہ طے کیا کہ سندھ میں زرعی اصلاحات کی جائیں گی۔ اصل بات یہ تھی کہ اس وقت تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ برِ صغیر کو دو قومی نظریہ کے تحت تقسیم کر دیا جائے گا۔ اب مسلم لیگ کو یہ خطرہ درپیش تھا کہ کہیں سندھ کے ہاری مسلم لیگ کے جاگیرداروں کے مقابلے میں کانگریس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔

حکومتِ سندھ نے زرعی اصلاحات اور ہاریوں کے حالاتِ زندگی بہتر بنانے کے لیے ایک قانونی کمیٹی تشکیل دی جس کے سولہ ارکان تھے۔ ان میں چودہ اراکین سرکار کے ملازم تھے اور دو سندھ اسمبلی کے رکن تھے۔ اس کمیٹی نے 1945ء میں اپنی سفارشات پیش کیں جن پر کبھی عمل نہیں ہوا مگر یہ ضرور ہوا کہ سندھ میں ہاری تحریک روز بروز ترقی کرتی گئی اور جگہ جگہ ہاری کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔ 1946ء میں جب پاکستان کے سوال پر عام انتخابات ہونے والے تھے تو مسلم لیگ کو پھر ہاریوں کی فکر نے آن گھیرا۔ قائدِ اعظم کی خصوصی ہدایت پر حکومتِ سندھ نے ہاری انکوائری کمیٹی تشکیل دی جس کا چیئرمین انگریز زمیندار اور حکومتِ سندھ کے مشیر سردار راجر ٹامس کو بنایا گیا۔ اس چار رکنی کمیٹی کے باقی تین ارکان بیوروکریٹز تھے اور ان میں نور الدین صدیقی اور آغا شاہی کے علاوہ نواب شاہ کے کلیکٹر محمد مسعود بھی شامل تھے۔

پاکستان کے قیام کے بعد فروری 1948ء میں اس کمیٹی کی رپورٹ سامنے آئی تو اس وقت سندھ میں ایوب کھوڑو کی حکومت تھی۔ اس کمیٹی کی

رپورٹ مختصر طور پر کچھ یوں تھی کہ اگر سندھ کے ہاری کو کوئی تکلیف ہے تو اس کا ذمے دار وہ خود ہے، کیونکہ وہ ناشکرا ہے اور زمیندار کے احسانات کو نہیں مانتا۔ البتہ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ حکوت بٹائی کو باقاعدہ بنانے اور ہاریوں کو حقوق دینے کے لیے مزارعوں کے حقوق کا قانون منظور کرے۔ کمیٹی نے ہاریوں کو کاشت کے مستقل حقوق دینے پر اعتراض کیا۔

اس رپورٹ کا سب سے دلچسپ حصہ ایک ممبر کلیکٹر محمد مسعود کا اختلافی نوٹ تھا جسے 'عوام کے مفاد' میں شائع نہیں کیا گیا۔ مگر ایوب کھوڑو نے خفیہ اختلافی نوٹ کچھ علماء کو فراہم کیا۔ مولانا عبدالحامد بدایونی کی سرکردگی میں سولہ علماء نے کلیکٹر مسعود کے اختلافی نوٹ کو غیر اسلامی اور محمد مسعود کو کمیونسٹ قرار دے دیا۔ کلیکٹر مسعود نے ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیا جس سے حکومتِ سندھ پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔

کلیکٹر مسعود کا اختلافی نوٹ کافی مختصر تھا مگر اس میں سندھ کے ہاریوں کی پسماندگی، غربت اور بے بسی کے حالات درج کیے گئے تھے اور جاگیرداروں کے ظالمانہ سلوک اور معاشرتی استحصال کے ہتھکنڈوں اور غیر انسانی رویوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ نوٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ جاگیردارانہ نظام کو فوری طور پر ختم کر دینا چاہیے ؛ زمین کی زیادہ سے زیادہ حدِ ملکیت بیس ایکڑ مقرر کی جانی چاہیے ؛ اور غیر حاضر زمینداروں کی ملکیت ختم کر دینی چاہیے۔

جب سندھ ہاری انکوائری رپورٹ شائع ہوئی تو پورے سندھ میں اس بات پر احتجاج کیا گیا کہ اختلافی نوٹ چھاپا جائے مگر حکومت نے امنِ عامہ کا بہانہ بنا

کر اسے نہ چھاپا۔ جب کلکٹر مسعود نے ہر جانے کا دعویٰ دائر کر دیا تو لیاقت علی نے اسے دعویٰ واپس لینے اور سندھ کی حکومت کو اختلافی نوٹ شائع کرنے کے لیے کہا۔ اختلافی نوٹ شائع ہوا تو سندھ ہاری کمیٹی نے اپنی تحریک کو مزید تیز کر دیا۔

جگہ جگہ ہاری کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں اور یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ سندھ سے جاگیرداری نظام کو ختم کیا جائے۔ سندھ اسمبلی میں ہاریوں کی بے دخلی کو روکنے کے لیے قانون سازی بھی کی گئی مگر وہ عملاً بے اثر رہی۔ دوسری طرف سندھ کے زمینداروں نے مل کر اپنے مفادات کے لیے انجمن بنالی اور یوں سندھ کے زمیندار بھی اکٹھے ہونے لگے۔

پاکستان کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ پیریٹی کے اصول پر ون یونٹ کی تجویز منظر عام پر آئی۔ اس تجویز کے تحت مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنانا تھا۔ اس طریقے سے مشرقی پاکستان کی اکثریتی آبادی کے مقابل برابری حاصل کی جاسکتی تھی۔ یہ تجویز پاکستان کی ان ابھرتی ہوئی سیاسی قوتوں کے حق میں تھی جو مرکز پر اختیارات برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔ ان میں اردو اور پنجابی بولنے والی فوجی اور سول بیوروکریسی اور بالائی طبقے شامل تھے۔

یہ تجویز 1954ء میں مرکزی کابینہ میں پیش کی گئی۔ 11 دسمبر 1954ء کو سندھ اسمبلی نے بھاری اکثریت سے ون یونٹ کے حق میں قرارداد منظور کی۔ اسمبلی کے 102 ممبران میں سے 98 ممبران نے حق میں اور صرف چار ممبران نے مخالفت میں ووٹ دیا۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے

ستمبر 1955ء میں ون یونٹ کی تجویز کو منظور کر لیا۔ ون یونٹ کی حمایت نہ صرف سندھ بلکہ بلوچستان، سرحد، پنجاب اور مشرقی پاکستان کے برسرِ اقتدار لوگوں نے بھی کی۔

مگر ون یونٹ نے عوامی سطح پر احساس محرومی پیدا کر دیا۔ سندھ، بلوچستان، سرحد اور مشرقی پاکستان میں یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ ان کے قومی حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے، تمام اختیار مرکز کو دے دیے گئے ہیں اور صوبوں میں بسنے والی قوتوں کو نہ صرف بے اختیار بنا دیا گیا ہے بلکہ ان کی قومی حیثیت کی نفی کی گئی ہے۔ ون یونٹ کے خلاف نہ صرف سندھ بلکہ پورے پاکستان میں کئی سطح پر احتجاجات کیے گئے اور یہیں سے پاکستان میں قومی سیاست کی تحریک کا آغاز بھی ہوا۔ پاکستان میں موجود پانچوں قوموں کی نمائندہ سیاسی پارٹیوں نے ون یونٹ کے خلاف اور قومی حقوق کے حصول کے لیے تحریک شروع کر دی۔ حتیٰ کہ پنجاب کا ترقی پسند دھڑا بھی اس مرکزیت کے خلاف تھا۔

1956ء میں پنجاب کے ترقی پسند لیڈر میاں افتخار الدین نے تمام قوموں کے ترقی پسند دھڑوں اور جماعتوں کا اجلاس بلایا۔ اس اجلاس میں ان کی آزاد پاکستان پارٹی، جی ایم سید کی عوامی تحریک، شہزادہ کریم کی استمان گل اور عبدالصمد اچکزئی کی ورور پشتون شامل تھیں۔ بعد ازاں عوامی لیگ سے الگ ہونے والے مولانا بھاشانی بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے مل کر نیشنل عوامی پارٹی تشکیل دی۔ اس پارٹی کے منشور میں ون یونٹ کو ختم کرنا اور

پاکستان میں بسنے والی تمام قوموں کو ان کے حقوق دلوانا شامل تھا۔ اس پارٹی نے پاکستان کی ترقی پسند سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔

آنے والے وقتوں میں سندھ میں دو متحارب سیاسی رجحانات تیزی سے پھیلے۔ ایک سندھی قوم پرستانہ سیاست اور دوسرا اُردو مہاجر سیاست کا تشدد پسند رجحان۔ سندھ میں مہاجرین کی آمد بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ اردو بولنے والے مہاجرین کراچی، حیدر آباد اور سندھ کے دیگر شہروں میں بہت بڑی تعداد میں آگئے تھے۔ چونکہ پاکستان کی مرکزی حکومت میں ان مہاجرین کا اثر بہت زیادہ تھا لہٰذا سندھ کی شہری جائیدادوں پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ تجارت اور نوکریوں پر بھی یہ لوگ چھا گئے تھے۔

دوسری طرف مشرقی پنجاب سے آنے والے کاشتکار تیزی سے سندھ کی زمینوں کے مالک بنتے چلے گئے۔ مجموعی طور پر سندھ میں سندھی آبادی کے بعد دوسرے نمبر پر اردو بولنے والے مہاجرین اور پھر پنجابی آباد کار سندھ کی آبادی کا حصہ بن گئے۔ سندھ کے عوام میں آہستہ آہستہ ان مہاجرین کے بارے میں یہ احساس پیدا ہوتا چلا گیا کہ انہوں نے سندھی عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ سندھ سے ہندو ساہوکاروں کے اخراج کے بعد ہاریوں کو زمینیں واپس ملنے کی توقع تھی مگر یہ زمینیں سندھی ہاریوں کی جگہ پنجابی آباد کاروں کو ملنا شروع ہو گئیں۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد سندھ کی زمینیں فوجی افسروں اور اہلکاروں میں بہت بڑی سطح پر تقسیم کی گئیں۔

پنجاب آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہونے کی وجہ سے

(مشرقی پاکستان کو چھوڑ کر) فوج، پولیس اور انتظامیہ پر چھاتا چلا گیا اور ون یونٹ بھی اسی کے مفادات کا علمبردار تھا۔ اس صورتِ حال نے سندھ میں قومی سیاست کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ جی ایم سید نے پاکستان بنتے ہی سندھی قوم پرست سیاست کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان دراصل پنجابی اور مہاجر سامراج کے زیرِ تسلط ہے اور سندھیوں کو اپنے حقوق ملنے کی کوئی توقع نہیں۔ ان کو یقین تھا کہ مضبوط مرکز کا مطلب سندھ پر تسلط قائم کرنا اور سندھیوں کی شناخت کو ختم کرنا ہے۔ اسی لیے انہوں نے 1960ء کی دہائی میں جئے سندھ تحریک کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک کوئی ایک جماعت نہیں تھی بلکہ کئی ثقافتی دھڑوں پر مشتمل تھی جیسے بزمِ صوفیائے سندھ، سندھی ادبی سنگت، سندھ سٹوڈنٹس کلچرل آرگنائزیشن اور سندھ آزاد سٹوڈنٹس آرگنائزیشن۔ جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن بعد ازاں 1966ء میں قائم کی گئی۔

جی ایم سید سیاستدان سے زیادہ سیاسی دانشور تھے جنہوں نے کم و بیش 50 کتابیں لکھیں۔ ان کی جئے سندھ تحریک نے سندھ میں سیاسی ابھار پیدا کرنے سے زیادہ ادبی اور ثقافتی ابھار پیدا کیا جس نے سندھ کے لوگوں کے خیالات پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ جی ایم سید کا خیال تھا کہ طبقاتی سیاست سندھ کی قومی تحریک میں دراڑ ڈالنے والی بات ہے اور سندھ کے زمینداروں اور ہاریوں کو آپس میں لڑوانے کی بجائے انہیں ایک قومی تحریک میں اکٹھا کرنا چاہیے۔

ساٹھ کی دہائی کے آخر میں ذوالفقار علی بھٹو کی تحریک اور پیپلز پارٹی نہ صرف سندھ بلکہ پنجاب کے سیاسی افق پر بھی چھا گئی۔ ایوب خان جاتے جاتے ملک کو یحییٰ خان کے مارشل لاء کے حوالے کر گئے جس نے نادانستہ طور پر دو

اچھے کام کر دیے۔ ایک تو ون یونٹ ختم کر دیا جس سے دوسرے صوبوں کے علاوہ سندھ کی صوبائی حیثیت بھی بحال ہو گئی۔ دوسرا عام انتخابات کا انعقاد کروا دیا جن میں پاکستان کے مغربی حصے سے بھٹو کی پیپلز پارٹی اور مشرقی حصے سے مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کر کے سامنے آئیں۔ مشرقی پاکستان فوجی ایکشن کے نتیجے میں عملی طور پر علیحدہ ہو گیا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ باقی ماندہ پاکستان کی حکومت بھٹو اور اس کی پیپلز پارٹی کو مل گئی۔

پیپلز پارٹی ایک مرکز پسند پارٹی ہے جس کی قیادت سندھ کے جاگیر دار اور پنجاب کے زمینداروں اور درمیانے طبقے کے ہاتھ میں تھی۔ سندھ میں اس کا کردار پنجاب یا مرکز سے کافی مختلف رہا۔ ایک طرف تو اس نے قومی حقوق کی بات کرنی شروع کی اور دوسری طرف طبقاتی نعرے دیے۔ یوں پیپلز پارٹی نے سندھ کے جاگیرداروں اور عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی اور جی ایم سید اور قومی تحریک کو بری طرح شکست سے دوچار کر دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب جی ایم سید نے صوبائی خود مختاری سے بڑھ کر 'سندھو دیش' کا نعرہ دیا۔

1977ء میں فوجی آمر ضیاء الحق نے پیپلز پارٹی کی منتخب حکومت کو ہٹا کر مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ضیاء الحق خود کٹر مذہبی سوچ کے مالک تھے اور بھٹو کے لبرل ازم کے ردِ عمل کی پیداوار تھے۔ تمام مذہبی اور رجعت پسند قوتیں ضیاء الحق کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ جی ایم سید نے بھی ضیاء کے مارشل لاء کا ساتھ دیا مگر ان کی اپنی منطق تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ سندھو دیش بنانے کے لیے

پاکستان کا ٹوٹنا ضروری ہے اور پاکستان توڑنے کا کام ضیاء الحق سب سے بہتر کر رہا ہے لہٰذا اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ سندھو دیش بنانے کے لیے انہیں کوئی عملی تحریک چلانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مرکزی حکومت کے تضادات خود یہ موقع فراہم کر دیں گے۔

اردو بولنے والے مہاجرین کی صورتِ حال سندھیوں سے بالکل الٹ تھی۔ مہاجرین زیادہ تر ہندوستان کے مسلم اقلیت والے علاقوں سے آئے تھے جیسے یوپی اور مدھیہ پردیش وغیرہ۔ قیامِ پاکستان سے پہلے مسلم لیگ بھی انہیں علاقوں میں مسلمانوں کی پارٹی کے طور پر مقبولِ عام ہوئی تھی اور اس کی بیشتر قیادت بھی انہیں علاقوں کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ پاکستان بننے کے بعد ان علاقوں کے مسلمان ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔

شروع سے ہی حکومتی اور انتظامی عہدوں پر ان کا غلبہ ہو گیا۔ کراچی کے دارالحکومت بننے سے انہیں اور بھی تقویت ملی۔ چوہدری خلیق الزمان اور لیاقت علی خان کی قیادت نے انہیں صنعت اور تجارت میں بہت سی مراعات دلوائیں جن کے نتیجے میں مہاجرین میں سے سرمایہ دار طبقہ ابھر کر سامنے آیا۔ نوکریوں کے حصول اور الاٹمنٹوں نے بھی مہاجرین میں ایک مضبوط درمیانہ طبقہ پیدا کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ مہاجرین پاکستان کو ایک قومی ریاست کے طور پر لیتے تھے اور وہ نظریہ پاکستان اور مضبوط مرکز کے حامی تھے۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ نئے ملک پاکستان میں ایک نہیں پانچ قومیں آباد ہیں اور وہ آخر کار اپنے حقوق کی طلبگار ہوں گی۔

مہاجرین کو پہلا دھچکا ایوب خان کے دور میں اس وقت لگا جب دارالحکومت کو کراچی سے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔ ابھی تک مہاجرین اور پنجابی مل کر پاکستان کے بڑے بنے ہوئے تھے مگر جلد ہی پنجابیوں نے ترقی کی دوڑ میں مہاجروں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ مہاجروں نے ایوب خان کے مقابل محترمہ فاطمہ جناح سے امیدیں وابستہ کر لیں مگر انہیں شکست سے دوچار کر دیا گیا۔ ایوب خان کے فاتحانہ گھمنڈ نے کراچی میں پہلی بار مہاجر پٹھان فساد برپا کروایا۔ سندھ میں جی ایم سید نے سندھ متحدہ محاذ قائم کیا تو مہاجروں کے رہنما نواب مظفر حسین نے ان کے مقابل 'مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ' قائم کر لیا۔ اس محاذ کی بنیادی دستاویز میں کہا گیا کہ یہ محاذ ''تیزی سے سر اٹھاتی ہوئی جئے سندھ تحریک اور جی ایم سید کے فلسفۂ قومیت کی بنیاد پر روز افزوں بڑھتے ہوئے علاقائی اور لسانی تعصب کا قدرتی ردِ عمل ہے۔''

جی ایم سید نے نواب مظفر اور مہاجر قیادت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ خود کو سندھی تسلیم کر لیں مگر مہاجرین خود کو پاکستانی تصور کرتے تھے اور وہ کسی طور پر بھی سندھی بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد سندھی قوم پرستی کی لہر کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔ بھٹو نے نواب مظفر کو سندھ کی گورنری پیش کی مگر انہوں نے قبول نہیں کی۔ نواب مظفر حسین کی وفات کے بعد مہاجر قیادت میں ایک خلاء پیدا ہو گیا۔

سندھ کے مہاجرین نے ہمیشہ دائیں بازو کی رجعت پسند پارٹیوں اور نظریات کا ساتھ دیا۔ جماعتِ اسلامی کو مہاجرین کی مکمل حمایت حاصل رہی۔

جمعیتِ العلمائے پاکستان بھی ان میں کافی مقبول جماعت تھی۔ 1970ء کے انتخابات میں مہاجرین نے انہیں جماعتوں کو ووٹ دیے اور کراچی سے کامیاب کروایا۔ انہوں نے بھٹو، مجیب الرحمٰن اور دیگر قوم پرست رہنماؤں اور جماعتوں کی سخت مخالفت جاری رکھی۔ 1977ء میں مہاجرین نے دائیں بازو کی پارٹیوں کے اتحاد کی حمایت کی اور بھٹو کی مخالفت کی۔ جب ضیاء الحق نے منتخب حکومت کو ختم کر کے مارشل لاء لگادیا تو مہاجرین نے اس بدترین آمریت کا بھرپور ساتھ دیا۔

ضیاء الحق کے مارشل لاء کا دور ہی وہ وقت ہے جب کراچی یونیورسٹی میں مہاجر طلباء کی تنظیم آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (اے پی ایم ایس او) بنی اور کچھ ہی عرصے میں اس کا تنظیمی پھیلاؤ، منشور اور نظریات بڑھ کر مہاجر قومی موومنٹ یعنی ایم کیو ایم بن گئے۔ اے پی ایم ایس او 1978ء میں تشکیل پائی تھی اور اس کے صدر الطاف حسین تھے اور جنرل سیکرٹری عظیم احمد طارق تھے۔ اسی قیادت نے 1984ء میں اسی منشور کے ساتھ ایم کیو ایم تشکیل دی۔ یہ بات تو بحث طلب ہے کہ ایم کیو ایم ضیاء الحق کے مارشل لاء کی پیداوار تھی یا نہیں مگر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ضیاء اور اس کی حکومت نے ہر اس دھڑے کے سر پر دستِ شفقت رکھا جو بھٹو اور پیپلز پارٹی کا مخالف ہو سکتا تھا۔

ایم کیو ایم درمیانے طبقے کی جماعت کے طور پر ابھری اور ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ مہاجرین کو اس بات کا احساس شدید ہو تا جارہا تھا کہ انہیں جس قدر پاکستان سے توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں بلکہ ان کو

نوکریوں اور امورِ مملکت سے ایک حد تک محروم رکھا جارہا ہے۔ انہوں نے دائیں بازو کی جماعتوں کا ساتھ دیا مگر انہوں نے بھی ان کے لیے کچھ خاص نہیں کیا۔ مثال کے طور پر جماعتِ اسلامی نے مہاجرین کی رائے اور طاقت کو استعمال تو کیا مگر وہ پنجابی غلبے کا شکار رہی اور اس نے مہاجرین کے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کیا۔

بھٹو حکومت نے سندھیوں کے مقابلے میں مہاجرین کو ہر سطح پر نظر انداز کیا۔ کوٹہ سسٹم نے بھی مہاجرین کے وسائل کو محدود کرنے کا کام کیا۔ مہاجرین کی نوجوان نسل کو مایوسی نے غصے اور تشدد کی سیاست کی طرف دھکیل دیا۔ ایم کیو ایم کی نوجوان قیادت نے مہاجروں کو ایک قومیت کا نظریہ دیا جیسے پاکستان میں دوسری قومیں تھیں خاص طور پر سندھی۔ الطاف حسین کے الفاظ میں ''مہاجر وہ ہیں جو مسلم اقلیتی علاقوں سے پاکستان میں آئے ہیں۔ یعنی جو نہ پنجابی ہیں نہ سندھی اور نہ ہی پشتون یا بلوچ۔'' انہوں نے لسانی اشتراک کو قومی بنیاد بنایا بالکل سندھیوں کی طرح۔

اس نئی نظریاتی اساس کے ساتھ مہاجرین مذہبی پارٹیوں کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے سو انہیں کے ساتھ ان کا پہلا پھڈا ہوا۔ کراچی یونیورسٹی میں اسلامی جمعیتِ طلباء نے اے پی ایم ایس او کی پر تشدد مزاحمت کی۔ پھر مارشل لاء کے تحت غیر جماعتی انتخابات میں بلدیاتی سطح پر اور پھر صوبائی سطح پر ایم کیو ایم نے انہیں جماعتوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔ مہاجروں کے اتحاد اور کامیابی نے ایم کیو ایم کی سیاست کو تصادم اور تشدد کی طرف مائل کر دیا۔ سندھ

کی دیہی اور شہری علاقوں کی سیاست علیحدہ علیحدہ ہو گئی۔ کراچی کے پنجابیوں اور پٹھانوں نے مہاجروں کے مقابل 'پنجابی پٹھان' اتحاد قائم کر لیا اور مہاجرین کے پٹھانوں اور پنجابیوں کے ساتھ فساد ہونے لگے۔

ضیاءالحق کی وفات کے بعد 1988ء کے انتخابات میں ایم کیو ایم سندھ کی دوسری بڑی پارٹی بن کر ابھری۔ پھر 1990ء میں ایم کیو ایم نے پہلے سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ پہلے ان کا بے نظیر کے ساتھ حکومتی سطح پر اتحاد بنا مگر چل نہیں سکا۔ ایم کیو ایم کے پیپلز پارٹی کے ساتھ پر تشدد فساد ہوتے رہے۔ پھر پیپلز پارٹی کے خلاف ایم کیو ایم نے آئی جے آئی کا بھرپور ساتھ دیا۔

1990ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی سندھ میں بڑی پارٹی تھی مگر ایم کیو ایم نے مسلم لیگ اور دیگر بھگوڑا عناصر کے ساتھ حکومت میں شرکت کی۔ ایم کیو ایم حکومتی طاقت کا یہ غیر اصولی کھیل ابھی کھیل ہی رہی تھی کہ ان کے خلاف فوجی آپریشن کر دیا گیا۔ آپریشن کلین اپ میں ایم کیو ایم کو بہت نقصانات اٹھانا پڑے۔ کارکنوں کی بڑی سطح پر گرفتاریوں اور پولیس مقابلوں میں ان کی ہلاکت نے ایم کیو ایم کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر ان کے اندر سے ہی ان کا حریف گروپ ان کے مقابل آگیا اور ایم کیو ایم دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی گو الطاف حسین کی پارٹی ہی بڑی اور اصلی ایم کیو ایم رہی۔

ضیاءالحق کے دور کے بعد ایم کیو ایم کے خلاف مرکزی حکومت کے ملٹری اور رینجرز کے ذریعے آپریشن جاری رہے۔ مہاجرین میں تشدد کی سیاست تیزی سے پھیلی خاص طور پر نچلے طبقے میں اور آخر کار اس سیاست کا

ٹکراؤ مرکز کے ساتھ ہوا جس کے نتیجے میں ایم کیو ایم کے ریڈیکل عناصر کو نقصان اٹھانے پڑے اس کی قیادت کے کافی لوگ مارے گئے اور الطاف حسین پاکستان سے برطانیہ جا کر سیاسی جلاوطنی پر مجبور ہو گیا۔ ان حالات میں گرفتار اور مقدمات میں ملوث افراد کی رہائی بھی ایم کیو ایم کے لیے مسئلے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اب ایم کیو ایم کو دیگر سیاسی مطالبات کے ساتھ ساتھ اپنے کارکنوں کی رہائی کے مطالبات کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

اب مہاجر قومی موومنٹ آہستہ آہستہ تشدد کی سیاست سے پیچھے ہٹتی جا رہی ہے۔ بلاشبہ سندھ کے مہاجرین کو اپنی سیاسی شناخت کی ضرورت ہے۔ انہیں اپنے مطالبات کے لیے اور پاکستان میں اپنے کردار کو متعین کرنے کے لیے سیاست کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر مستقبل میں انہیں یہ طے کرنا پڑے گا کہ وہ ٹکراؤ کی سیاست کرنا چاہتے ہیں یا پرامن جمہوری سیاست۔

قیامِ پاکستان کے بعد سندھ کے حالات پر پاکستان کی مجموعی صورتِ حال اور سیاست نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ مرکزی حکومت کی پالیسیوں اور سندھ کے حالات اور مفادات میں کبھی تضاد رہا اور کبھی ہم آہنگی۔ بہر حال زیادہ تر سندھی عوام کے مفادات کے خلاف حکمتِ عملیاں اختیار کی جاتی رہیں جن کی وجہ سے سندھ کے عوام میں ایک حد تک احساسِ محرومی بھی پایا جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد اور سندھ کے وسائل پر ان کا غلبہ ایسے معاملات تھے جنھوں نے شروع سے ہی سندھ میں محرومی کا بیج بو دیا۔ ان عوامل کی وجہ اس وقت کی مرکزی حکومت تھی جس میں سندھ کی نمائندگی نہ

ہونے کے برابر تھی۔ کچھ عرصہ بعد ہی ون یونٹ کے قیام نے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ مغربی پاکستان کا دارالخلافہ لاہور کو مقرر کیا گیا۔ سندھ کے لوگوں کو اپنے مسائل حل کروانے کے لیے لاہور کے چکر لگانے پڑتے تھے اور لاہور میں بیٹھے ہوئے افسران سندھ کے معاملات کے فیصلے کر رہے تھے۔ اسی طرح ایوب خان کے دور میں سندھ کی زمینیں فوجی افسران میں بڑی سطح پر تقسیم کی گئیں۔

اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی تحریک چلی۔ بھٹو سندھی تھے اور ان کے دورِ حکومت میں سندھ کی سیاسی قیادت ملکی سطح کی سیاست میں سامنے آئی، ترقیاتی کام ہوئے اور سندھ کے لوگوں کو نوکریاں وغیرہ ملیں۔ ثقافتی اور لسانی سطح پر بھی کئی ادارے بنے اور بہتر کام ہوئے۔ مجموعی طور پر بھٹو کا دورِ حکومت سندھ کے مفادات کے حق میں تھا اور سندھ کی مرکزی حکومت کے ساتھ ہم آہنگی کا دور تھا۔

ضیاء الحق کا دور نہ صرف بھٹو دشمنی پر مبنی تھا بلکہ یہ دور سندھ کے عوام کے مفادات کے خلاف بھی تھا۔ سندھیوں کے خلاف فوجی اور پولیس ایکشن کیے گئے۔ سیاسی اظہار پر سخت پابندیاں لگائی گئیں۔ ٹوڈی جاگیرداروں کو ساتھ ملا کر غیر نمائندہ حکومتوں کو مسلط کیا گیا۔ سندھ کے اندرونی تضادات کو بھڑکایا گیا۔ سندھی قیادت کو پابند سلاسل کیا گیا اور سندھ میں مہاجر سیاست کو مہرے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہ سارے کام نواز شریف کے دور میں بھی جاری رہے مگر ان میں مقداری طور پر کافی کمی آگئی۔ بے نظیر کے مختصر ادوار میں سختی نسبتاً کم ہوگئی اور سندھی مفادات پورے ہونے کی پھر سے توقعات پیدا

ہوئیں مگر حالات میں کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی۔

سندھ کے اندرونی حالات میں مجموعی طور پر جاگیردارانہ سیاست چھائی رہی۔ وہی جاگیر دار خاندان جو انگریزوں کے وفادار تھے بعد ازاں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی یا فوجی آمریتوں کے ساتھ وفاداریاں استوار کر کے حکومتی ایوانوں میں موجود اور برقرار رہے۔ پاکستان میں کلاسیکی نوعیت کی جاگیرداریت سندھ میں ہی موجود ہے۔ پنجاب میں اس طرح کی جاگیرداریت اب صرف بہت تھوڑے حصوں میں رہ گئی ہے۔ سندھ کے دیہی علاقوں کے عوام میں غربت اور پسماندگی کی اصل وجہ جاگیرداریت ہی ہے۔ سندھ کے جاگیردار دوہرے کردار و عمل کے حامل ہیں۔ وہ دیکھنے میں مہذب لگتے ہیں مگر جاگیردار کے طور پر وہ انتہائی سفاک اور ظالم ہوتے ہیں۔

دیہی سندھ کی تقریباً تمام طرح کی سیاسی قیادت جاگیرداروں اور پیروں پر مشتمل ہے۔ ہاریوں اور غریب عوام کی سیاست اور قیادت بہت ہی کم ہے اور پھر بے اثر بھی ہے۔ سندھ کی سیاست میں مہاجر اور سندھی کا تضاد اب بنیادی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ اسی تضاد سے اب تک مرکزی حکومت نے سیاسی فوائد تو حاصل کیے ہیں مگر سندھ کو سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں ملا۔ سندھ کے مہاجر اور سندھی عوام کی بھلائی صرف اس بات میں ہے کہ مہاجر سندھی تضاد کا کوئی قابلِ عمل حل نکل آئے۔

پاکستان کی مجموعی صورتِ حال میں سندھ آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا صوبہ ہے مگر وسائل اور اختیارات کی تقسیم میں اسے اس کے مطابق حصہ

نہیں مل رہا۔ سندھ میں عمومی طور پر محرومی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس محرومی کے پیچھے بہت سے حقیقی مسائل ہیں جن کا حل سندھ کے عوام کی ضروریات اور خواہشات کے مطابق کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔

جیوے سندھ جیوے سندھ

جام محبت پیوے سندھ

خیبر پختونخوا

تاریخی خاکہ



ساؤتھ ایشیاء پارٹنرشپ پاکستان

خیبر پختونخوا
تاریخی خاکہ

افراسیاب خٹک

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان
حبیب میموریل ٹرسٹ بلڈنگ، ناصر آباد، 2 کلومیٹر رائیونڈ روڈ، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور
فون نمبر: 6-3,5-042-35311701 فیکس: 042-35311710 ای میل: info@sappk.org

نام کتاب: خیبر پختونخوا تاریخی خاکہ

تحریر: افراسیاب خٹک

نظرِ ثانی: انور چودھری

ٹائیٹل: محبوب علی

کمپوزنگ: انجم شہزاد خان

اشاعت دوئم: جنوری 2014ء

تعداد 500

پرنٹر: جمال پرنٹرز، لاہور۔

ناشر: ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان

آواز

VOICE & ACCOUNTABILITY PROGRAMME

آواز اور جوابدہی پروگرام

یہ دستاویز ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان نے انسانی بھلائی کے لیے ترتیب دی ہے۔

مندرجات

اک بات پہلے

اس کتاب کے ساتھ ہمارا صوبائی تاریخی خاکوں کا سلسلہ تکمیل پذیر ہوا۔ اس سے پہلے تین صوبوں کے تاریخی خاکے آچکے ہیں اور یہ چوتھا اور آخری خاکہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک سلسلہ مکمل ہوا، اس کی ہمیں خوشی ہے مگر سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ہم لوگوں اور دھرتی کے بارے میں تحقیقی تحریریں آپ کے سامنے لاتے رہیں گے۔ ان تاریخی خاکوں کو لکھنے یا لکھوانے، انہیں چھاپ کر آپ تک پہنچانے میں دو اچھی باتیں ظاہر ہوئیں۔

پہلی یہ کہ تاریخ کے حکومتی اور ریاستی مواد اور نقطہء نظر کے مقابل ایک سے زیادہ نئے لکھنے والے سامنے آئے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں ان لکھاریوں کی بھرپور تحریروں کو آپ ضرور پڑھیں گے۔

دوسری اور بڑی بات یہ ہے کہ پڑھنے والوں نے ان تاریخی خاکوں کو گرم جوشی سے وصول کیا اور سنجیدگی سے پڑھا جس کی اطلاع ہمیں ان کی رائے یا رویوں سے مسلسل ملتی رہی۔

لوگوں اور دھرتی کے علم کا تسلسل ہی تاریخ ہے جو یقینی طور پر حکمرانوں کی تاریخ سے مختلف ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے۔ اس طرح آپ اور ہم مل کر عوام کو مضبوط بنانے کی جدوجہد کر سکتے ہیں۔

شعبہ ترقیاتی معلومات

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ پاکستان

پیش لفظ

مجھے مورخ ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں ہے لیکن سیاسیات کے طالبِ علم اور جمہوری اور انسانی حقوق کی تحریک کے ادنیٰ کارکن ہونے کے ناطے میں نے تاریخ کی تھوڑی سی ورق گردانی ضرور کی ہے۔ جیلوں اور جلاوطنی کے دنوں کے 'فارغ' وقت میں تاریخی واقعات کے بارے میں غور وفکر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میری رائے میں جس طرح حافظے سے محروم فرد کا ذہنی توازن صحیح نہیں رہ پاتا، اسی طرح کوئی گروہ، قوم یا قومیت ماضی کے بارے میں اپنی یاداشت کھو کر ذہنی صحت برقرار نہیں رکھ سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا خلاء تاریخی اور معاشرتی ترقی کے عمل کو براہِ راست اور منفی طور پر متاثر کر سکتا ہے جس کے پیشِ نظر تاریخ کے مطالعے کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ تاریخ کو انسان کے سماجی ترقی کے عملی تجربے کی لیبارٹری بھی گردانا گیا ہے جس کے بغیر متذکرہ بالا عمل کو سائنسی طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس عمل کے دوران پیدا ہونے والے مسائل کو درست طور پر پرکھا اور حل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تاریخ عوام کی تخلیقی استعداد کی نشوونما اور جبر، استبداد اور غلامی کے خلاف ان کی مسلسل جدوجہد کی کہانی ہے۔

تاریخ کو پڑھنے اور سمجھنے کی اہمیت پر زور دینے کے فوراً بعد اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ تاریخ کو صرف ماضی کے تجربات کے اظہار کے طور پر ہی

پڑھنا چاہیے اور اس میں نہ تو لوٹ جانے کی کوشش کرنی چاہیے اور نہ ہی اس کے اندر محو ہو کر حال کو فراموش کرنا یا مستقبل کی طرف پیٹھ موڑنا چاہیے۔ اور یہ بھی کہ بہت سارے تنوع اور تفاوت کے باوجود انسانوں کے مشترکہ تاریخی تجربے کی غنا اور ثروت باہمی افہام وتفہیم اور تعاون کے ذریعے بڑھائی جاسکتی ہے۔

ساؤتھ ایشیاء پارٹنرشپ، پاکستان (ایس اے پی، پاکستان) نے ملک کے چاروں صوبوں کی تاریخ کے بارے میں کتابچے چھاپنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ انتہائی مفید اور اہم ہے، خصوصاً جب تاریخ کی سرکاری کتب یا تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کی محدودیت اور نقائص کو مدِ نظر رکھا جائے کیونکہ ہمارے حکمران طبقوں نے صرف ہمارے حال کے سماجی، معاشی اور فکری استحصال پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہمیں اپنے ماضی کے بارے میں کنفیوز کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ شاید ان کے لیے سماجی اور سیاسی غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی ہو۔

بہرحال ایسے میں ایس اے پی، پاکستان کی پہلکاری بہت بروقت ہے جس سے صحت مند معاشرتی ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے اور عوام کے مختلف گروہوں کے درمیان جمہوری اور معقول انداز میں افہام وتفہیم بڑھانے میں مدد ملے گی۔ پشتونخوا یا صوبہ سرحد کی تاریخ کے بارے میں پشتو، فارسی اور انگریزی میں تو کافی مواد موجود ہے لیکن اردو میں اس سلسلے میں کی گئی کاوشیں بہت محدود ہیں۔ جہاں تک موجودہ کتاب کا تعلق ہے تو یہ محض پشتونخواہ کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ ہے جسے مستقبل میں ایک مکمل

تاریخ لکھنے کے لیے بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ پشتونخوا کی تاریخ کے بارے میں اس تحریر کے ذریعے ایک مباحثے کا آغاز ہوسکتا ہے۔

مجھے تاریخ کے بارے میں اپنی کم علمی کا شدید احساس ہے اور قارئین کی جانب سے تعمیری تنقید اس سلسلے میں میری تعلیم کا اہم ذریعہ ثابت ہوگی۔ میں ایک دفعہ پھر ایس اے پی، پاکستان اور خصوصاً جناب انور چودھری کا تہہِ دل سے ممنون ہوں جن کی مخلصانہ اور مسلسل حوصلہ افزائی اور مدد کے بغیر پشتونخوا کی تاریخ کا یہ مختصر خاکہ منظر عام پر نہ آتا۔ میں کتاب کے ایڈیٹر مصطفیٰ نذیر احمد صاحب، ٹائٹل بنانے والے محبوب علی کا انتہائی مشکور ہوں۔ اسی طرح عرق ریزی سے کمپوزنگ کرنے والے انجم شہزاد خان کا شکریہ لازمی ہے ان سب دوستوں کی مخلصانہ کاوشوں کے بغیر کتاب چھپ کر قارئین کے ہاتھوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ مختصر کتاب اس امید کے ساتھ قارئین کی نذر ہے کہ اس طرح کی کوششوں سے ماضی حال اور مستقبل کے بیچ ایک منطقی، معقول اور مفید تسلسل قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

افراسیاب خٹک

453 اولڈ باڑہ روڈ،

یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور۔

جغرافیائی محلِ وقوع کے اثرات

دنیا میں شاید ہی کسی اور قومیت کی تاریخ کے تشکل میں اس کے جغرافیے نے اتنا اہم کردار ادا کیا ہو جتنا 'شاہراہِ فتح' پر واقعہ پشتونوں کے جغرافیائی محلِ وقوع نے ان کی تاریخی سرنوشت کے تعین میں کیا ہے۔ سطح مرتفع پامیر، دریائے آمو اور دریائے سندھ کے مثلث میں واقع یہ خطہ ازمنہ قدیم سے بحیرۂ روم، چین اور برِ صغیر ہند کے درمیان رابطے اور آمدورفت کا سب سے قریبی راستہ رہا ہے۔ یہ علاقہ صدہا برس سے مرکزی ایشیاء اور جنوبی ایشیاء کے درمیان ایک مضبوط پل اور نکتہ اتصال کی حیثیت رکھتا ہے۔

بحری اور ہوائی جہازوں کی ایجاد سے قبل نقل مکانی کرنے والے قبائلی گروہ، فوجی مہم جو اور تجارتی قافلے اس راستے سے گزرتے تھے۔ اس خطے کا شمار قرونِ وسطی کے مشہور اور عظیم تجارتی راستے 'شاہراہِ ریشم' کی بنیادی گزرگاہ میں ہوتا تھا جو سلطنتِ روم کو چین اور ہندوستان سے ملاتی تھی۔ شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں اور فاتحین کے لیے یہ علاقہ خصوصی طور پر ہندوستان کے دروازے کی حیثیت رکھتا تھا۔ عالمی تاریخ کے کئی ایک عظیم فاتحین اسی دروازے سے گزر کر برِ صغیر ہند میں داخل ہوئے جن میں سکندرِ اعظم، چنگیز خان، تیمور لنگ اور

ظہیرالدین بابر جیسے مشہور نام شامل ہیں۔

آریائی، ایرانی، یونانی، ترک، سفید ہن (یفتالی)، منگول اور کئی دیگر اقوام کے ادھر سے گزرنے والے قافلوں کی گرد یہاں پائی جاتی ہے اور اس خطے کے اندر پائے جانے والے نسلیاتی، لسانی اور ثقافتی تنوع میں اس کے نشان کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتے ہیں۔ یہاں پر پشتو بولنے والی اکثریت کے علاوہ ہندکو، چترالی یا کھوار، کوہستانی اور کیلاش بولنے والے لوگ بھی آبادی کا حصہ ہیں۔ مجموعی طور پر تاریخ کے بہاؤ کا رخ شمال مغرب سے جنوب مشرق کی جانب رہا ہے اگرچہ کچھ مضبوط تاریخی ریلے معکوس سمت میں بھی بہتے رہے ہیں۔ جنگ وجدل کے لامتناہی سلسلوں کے درمیان امن اور استحکام کے وقفوں میں یا تو مقامی طور پر شاندار تہذیبیں پھلتی پھولتی رہیں اور یا پھر اڑوس پڑوس کی تہذیبوں نے یہاں اپنے اثرات مرتب کیے۔

شمال سے پھیلنے والی زرطشت کی تعلیمات پر مبنی تہذیب کی گونج آج تک نوروز کی شکل میں باقی ہے۔ وادی سندھ کی قدیم تہذیب کی باقیات صرف زمین کے نیچے ہی نہیں بلکہ زمین کے اوپر بھی زندگی کے مختلف گوشوں خصوصاً ثقافت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ علاقہ گندھارا کی شاندار تہذیب کا مرکز تھا۔ ٹیکسلا، وادی پشاور اور وادی کابل اس تہذیب کے اثرات سے اٹے پڑے ہیں۔ اسلامی تہذیب نے جہاں اس علاقے کو اپنے رنگ میں رنگا وہاں وسطی ایشیاء کے اسلامی دور میں ہونے والی تہذیبی اور علمی ترقی کا موسم اس راستے سے برِصغیر میں داخل ہوا۔

صوفیائے کرام کے مختلف مکاتب، فقہ اور حدیث پر ہونے والی تحقیق اور علوم وفنون کے کئی ایک سنگِ میل اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

پشتونوں کا وطن یعنی پشتونخوا ایک لمبی فصیل کی طرح شمال سے جنوب کی جانب پھیلا ہوا ہے۔ اگر اسے فضائی بلندی سے دیکھا جائے تو یہ شمال میں باجوڑ سے جنوب میں سبی تک ایک لمبی لکیر کی طرح لگتا ہے جسے دنیا کے عظیم پہاڑی سلسلوں نے چھوٹی بڑی وادیوں اور دروں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جنوب میں یہ فصیل مغرب کی جانب مڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ایرانی سطح مرتفع سے جا ملتی ہے۔ شمال میں باجوڑ اور چترال ہندوکش کے عظیم الشان پہاڑی سلسلے کے آخر میں واقع ہیں جہاں قراقرم کے عظیم پہاڑ اس سے ملتے ہیں اور کوہ ہمالیہ کا سلسلہ سوات تک آ پہنچتا ہے۔

جنوب میں کوہ سلیمان (قدیم پشتو میں 'کسی غر') ہے جو ہندوکش سے نکل کر تقریباً شمال مشرق سے جنوب مغرب کی جانب پھیلتا جاتا ہے۔ نام نہاد ڈیورنڈ لائن نے پشتونخوا کی پٹی کو درمیان سے مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم کر کے اس کے عرض کو مزید کم کر دیا ہے۔ وادی پشاور مشرقی پشتونخوا کے نسبتاً شمالی حصے میں واقع سب سے بڑی اور زرخیز وادی ہے جسے ہمیشہ اہم تہذیبی اور سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس سے شمال میں پہاڑی سلسلے بلند تر ہوتے جاتے ہیں اور دس ہزار فٹ سے سولہ ہزار فٹ تک کی بلندی رکھتے ہیں جبکہ انتہائی شمال میں ہندوکش اور قراقرم کے پہاڑ ہیں جن سے آگے چین اور مرکزی ایشیاء واقع ہیں۔ جنوب میں کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ جات، ژوب، گوال، کچلاک اور کوئٹہ کی وادیاں

ہیں۔اسی طرح جنوب مغرب میں توبہ کے پہاڑی سلسلے میں فرخی، چناراور تابینہ کے خوبصورت میدانی علاقے واقع ہیں۔

ان مختلف وادیوں اور میدانی علاقوں کے درمیان درے تنگ دروازوں کی طرح کھلتے ہیں جو جدید مواصلاتی نظام کی ایجاد سے قبل انتہائی دشوار گزار تھے اور جن سے جنگوں اور فتح وشکست کی بے شمار کہانیاں وابستہ ہیں۔ ہندوکش سے نکلنے والا دریائے کابل مشرقی افغانستان کے آبی نکاس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ یہ دریا مغرب کی جانب سے وادی پشاور میں داخل ہو کر کچھ آگے تین حصوں سردریاب، ناگمان اور شاہ عالم میں بٹ جاتا ہے، لیکن ہشتنگر میں دوبارہ تینوں حصے مل کر ایک دریا بن جاتے ہیں۔یہی نہیں بلکہ شمال سے آنے والا دریائے سوات بھی اسی میں شامل ہو جاتا ہےاور نوشہرہ میں یہ دریا لنڈے کہلاتا ہے جو اٹک پہنچ کر دریائے سندھ یا اباسین میں شامل ہو جاتا ہے۔

پانی کے بہاؤ کے اس رخ کی خصوصیت کا تاریخی واقعات کے بہاؤ کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے افغانستان کے مشہور شاعر سلیمان لائق نے 1969ء میں اپنی ایک پشتو نظم میں پشاور میں اپنے ایک دوست کو مخاطب کر کے لکھا تھا:

- دہندوکش دباران ہرہ قطرہ — مخ پہ اٹک اور اباسین درحیٔ
دلتہ دتللو بلہ لارہ نشتہ — ہر چہ چی خوزی لکہ سین درحیٔ

(ترجمہ)

- "ہندوکش پر گرنے والا بارش کے پانی کا ہر قطرہ اٹک اور اباسین ضرور

پہنچتا ہے۔ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ جو چیز بھی یہاں حرکت میں آتی ہے وہ ہمارے دریاؤں کی طرح تمہارے ہاں پہنچ کر رہتی ہے"۔

البتہ جنوب کے اضلاع میں دریا نسبتاً کم پانی رکھتے ہیں۔ ان میں کوہاٹ کا توئی دریا، دریائے کرم اور گومل شامل ہیں جو سب کے سب اباسین کی جانب بہتے ہیں۔ دریائے کدانی اور ژوب کا رخ مشرق سے مغرب کی جانب ہے جبکہ جنوب مغرب میں پانی کافی کم ہے۔ مختلف پہاڑی نالوں سے جمع ہونے والا پانی مقامی آب پاشی کے کام آتا ہے۔ پشین لوڑہ، کاکڑ لوڑہ اور شال لوڑہ ایسے ہی آب پاشی کے نظاموں کے نام ہیں۔ جن کے ذریعے بارانی پانی کو ذخیرہ کر کے ایک محدود علاقے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ٹیوب ویلوں کے آنے کے بعد اور بارانی پانی کو جگہ جگہ روکنے کی وجہ سے اب یہ نظام تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ جنوب مغرب میں روایتی کاریز سسٹم پانی کے استعمال کا موثر ذریعہ رہا ہے۔ زیرِ زمین کاریزوں کے زریعے چشموں کا پانی اور پہاڑوں سے آنے والا پانی کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ بلوچستان میں کاریزوں کا نظام ابھی تک موجود ہے۔ ٹیوب ویلوں کا نظام رائج ہونے کے بعد نئی زمینیں بھی کاشت ہونا شروع ہوئی ہیں۔

پشتونخوا میں نسبتاً کم جغرافیائی فاصلوں پر آب وہوا کا کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ میدانی علاقوں میں شدید گرمی پڑتی ہے اور موسم گرما میں درجہ حرارت کافی وقت تک چالیس درجے سنٹی گریڈ سے اوپر ہی رہتا ہے۔ انتہائی شمال میں واقع اونچے پہاڑی علاقوں میں گرمی میں بھی موسم بے حد خوشگوار اور ٹھنڈا رہتا ہے۔

جنوب مغرب میں بھی سطح سمندر سے بلندی پر واقع درے اور وادیاں ٹھنڈی آب و ہوا کے علاقے ہیں۔ جنوب میں تل کے ریگستان کی آب و ہوا پہاڑی علاقوں کے بالکل برعکس اور شدید ہے۔ وادی پشاور کی آب و ہوا کو انتہا پسند خیال کیا جاتا ہے جو گرمیوں میں بہت گرم اور سردیوں میں خاصی ٹھنڈی ہوتی ہے۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، پشتون ان مشکل اور دشوار گزار راستوں سے گزر کر تاریخ کے مختلف ادوار میں برِصغیر ہندوپاک میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ویسے تو بے شمار درے اس طرح کی آمدورفت کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن ان میں نو درے کافی اہم اور مشہور ہیں۔ ان میں شمال میں مالاکنڈ، ناوہ، گنداب اور خیبر کے درے ہیں جبکہ جنوب میں پیواڑ، ٹوچی، گومل، کوژک اور بولان شامل ہیں۔ جنوب مشرق کی جانب نقل مکانی میں مختلف عوامل کارفرما رہے ہیں: فتوحات، تجارت، محنت مزدوری، خانہ بدوشی وغیرہ۔ پشتون آبادی تاریخ کے مختلف مرحلوں پر اپنے وطن کی حد سے نکل کر باہر پھیلتی رہی ہے۔ شمالی ہندوستان میں روہیل کھنڈ اور مشرق میں بنگال میں ان کی موجودگی کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔ موجودہ پاکستان کے تمام صوبوں میں بھی پشتون کافی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔

ویسے تو متذکرہ بالا آبادی کی نقل مکانی یکے بعد دیگرے گزرنے والی لہروں کے حصے کے طور پر جاری رہی لیکن بارھویں صدی کے بعد جب اسلام غالب شکل میں مرکزی ایشیاء اور افغانستان سے پھیل کر برِصغیر ہند میں داخل ہوا تو افغان براہِ راست طور پر ایک سیاسی، فوجی اور سماجی عامل کے طور پر ہندوستان کے

افق پر ظاہر ہوئے۔ 1206ء میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں اپنی بادشاہت قائم کی۔ اس کے بعد انڈو مسلم اور دہلی سلطنت کی اصطلاحیں سامنے آئیں جن کا مرکز دہلی یا آگرہ رہے۔ 1206ء سے 1526ء تک متذکرہ بالا سلطنت پر مختلف خاندان حکمران رہے جن میں ایبک، التمش، بلبن، تغلق، خلجی، سید اور لودھی وغیرہ شامل تھے۔ ان سب خاندانوں کا کسی نہ کسی طرح افغانسان سے تعلق بنتا تھا۔ مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر جس نے 1526ء میں لودھیوں کو شکست دی، بنیادی طور پر فرغانہ کا ازبک تھا لیکن ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے وہ کابل کا بادشاہ تھا اور پشتونوں کے ایک دھڑے کی مدد سے ہی اس نے لودھی پشتونوں کو شکست دی تھی۔ مغلوں کی بادشاہی (جس کے بیچ میں 1539ء سے 1555ء تک سوریوں کی حکومت بھی آئی) میں بھی پشتون ہندوستان کی حاکم اشرافیہ کا حصہ رہے۔ ان کو جاگیریں ملیں، ان کے ساتھ لاتعداد عام پشتون بھی ہندوستان گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بنگال، روہیل کھنڈ، بہار اور کشمیر میں اب تک لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنا شجرہ نسب افغانستان یا پشتونخوا سے آنے والے پشتون آبا و اجداد سے جوڑتے ہیں۔ ان کی اکثریت اپنی زبان بھول چکی ہے لیکن رام پور، فرخ آباد، لوہارو، پٹودی اور بہت سے دیگر جگہوں کے حکمران گھرانوں سے لیکر جوش ملیح آبادی، ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خان اور بمبئی کی فلم انڈسٹری کے مشہور زمانہ خان صاحبان اپنے پشتون تعلق کو نہیں بھولے ہیں۔ ان میں سے بہت

سے لوگوں نے ادب، سیاست اور معیشت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان میں کلاسیکی موسیقی کے کئی نامور گھرانے پشتونوں کے رہے ہیں اور عادل شاہ سوری کی جانب سے تان سین کی سرپرستی کا ذکر تو تاریخ میں موجود ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے نامور استاد ڈاکٹر عبدالرحیم نے 1956ء میں برطانیہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے لیے ہندوستان میں افغانوں کی تاریخ کے عنوان سے مقالہ لکھا جو 1961ء میں کتابی شکل میں چھپا۔ اس کے علاوہ معروف افغان سکالر زلمی هیوادمل نے "ہندوستان میں پشتو زبان وادب کے مختلف مراحل" کے زیرِ عنوان ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جو بڑی تفصیلی تحقیق پر مبنی ہے۔ اسی طرح بی بی سی کی اردو سروس نے 1993ء میں ثقافتی تحقیق کے پروگراموں کے ایک سلسلے میں روہیل کھنڈ اور کشمیر میں رہنے والے پشتونوں کے بارے میں دلچسپ پروگرام نشر کیے جس کے دوران یہ انکشاف بھی ہوا کہ پشتونوں کی ادب کی مشہور اور جانی پہچانی صنف چاربیت اب روہیل کھنڈ میں اردو زبان میں داخل ہو چکی ہے اور اس کے اندر وہی مٹھاس اور ملاوٹ موجود ہے جو پشتو زبان کی مذکورہ قدیم صنف میں پائی جاتی ہے۔

پاکستان کے صوبہ سندھ اور پنجاب میں ماضی میں نقل مکانی کرنے والے وہاں رچ بس گئے ہیں اور وہاں کی زبانیں بولنے لگے ہیں۔ سندھ میں بعض لوگ اپنے ناموں کے ساتھ پٹھان یا درانی لکھتے ہیں۔ حالیہ سالوں میں لاکھوں پشتونوں نے روزگار کے سلسلہ میں کراچی، حیدرآباد اور راولپنڈی جیسے صنعتی علاقوں میں مزدوری اور تجارت کے سلسلہ میں سکونت اختیار کی ہے۔ تجارت، ٹرانسپورٹ اور

یومیہ اجرت پر کام کرنے کے ناطے پشتونوں میں نقل مکانی کا رجحان بڑھا ہے۔ 1980ء کے بعد افغانستان سے پاکستان کے اندر داخل ہونے والے پشتونوں نے اس رجحان کو تقویت بخشی ہے اور اب پاکستان کا کوئی ایسا شہر نہیں ہے جس میں پشتون آبادی کے پاکٹ نہیں ہیں۔ پشتو کے عوامی ادب خصوصاً شاعری کی عام صنف ٹپے یا لنڈے کا خاصا حصہ جدائی یا فراق کا دکھ بیان کرتا ہے جس میں گھوڑوں، اونٹوں، ریل گاڑیوں اور بسوں میں جانے والوں کا ذکر ہے۔ حالیہ دنوں میں کئی ٹرکوں پر ایک شعر دیکھنے میں آیا ہے جس میں پشتون دوشیزاؤں نے جاپان کی نسان کمپنی سے گلہ کیا ہے کہ ان کی بنائی ہوئی گاڑیاں محبوب سے ان کی جدائی کا باعث بنتی ہیں۔

اپنے مخصوص جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے پشتونوں کو تاریخ کے زیادہ تر حصے میں مسلسل لڑنا پڑا ہے۔ جنگ و جدل کے لامتناہی سلسلوں نے ان کے تاریخی حافظے میں کئی کٹاؤ پیدا کیے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے تاریخی ارتقاء کے بارے میں معلومات کے تسلسل سے محروم رہے ہیں اور تہذیبی ترقی کے مختلف سلسلے تاریخ کی پگڈنڈیوں میں گم ہو کر اپنے سفر کو برقرار رکھنے میں ناکام رہے ہیں۔

نئی ابھرنے والی تہذیبوں کو اکثر اوقات اپنا سفر ابتدا سے شروع کرنا پڑا ہے مثلاً گندھارا کی شاندار تہذیب کے عروج کے دور میں مختلف فنون جیسے مجسمہ سازی، پینٹنگ اور موسیقی نے کافی ترقی کی لیکن پانچویں صدی عیسوی میں سفید ہنوں کے حملوں میں تباہی کے بعد بودھ ازم کے زوال اور ہندوشاہی کے دور کے بعد جب اسلامی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے تو مندرجہ بالا فنون کی تخلیق کا عمل جاری

رکھنا تو دور کی بات ہے یہاں تو یہ عالم تھا کہ پرانی تہذیب کی باقیات کو سمجھنا بھی مشکل ہو گیا۔ پشتونوں کے تاریخی حافظے میں پائے جانے والے خلاء سے مختلف استعماری طاقتوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ان کی تاریخ کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

چین، ترکستان، فارس اور ہندوستان کے بیچ میں واقع پشتونخوا کی تاریخ میں ہونے والے بار بار کے " کٹاؤ" کے نتیجے میں پڑوسی اقوام نے اس خطے کے باسیوں کو جاہل اور وحشی تصور کیا جو محض جسمانی طاقت پر دارومدار رکھتے تھے اور تہذیبی روایات سے محروم تھے۔ اس لیے طاقت کے بل بوتے پر ان کے کچلنے اور مغلوب کیے جانے کو جائز تصور کیا گیا۔ ان کی قدیم دیو مالا اور اساطیر کھو گئیں۔ تہذیبی زندگی میں ان کی حاصلات تاریخ کے گرد وغبار میں گم ہو کر رہ گئیں۔ یہاں پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے زیادہ تر کے صرف نام باقی رہے کتابیں تاراج ہونے کے عمل کے دوران ضائع ہو گئیں۔ خصوصاً پشتونخوا میں اسلام کی آمد سے قبل اور اس کے بعد کی تاریخ میں خلیج پیدا ہونے سے یہاں کے لوگوں کو بڑا دھچکا لگا۔ وہ وادیِ سندھ کی تہذیب اور گندھارا تہذیب میں اپنے افتخارات سے محروم ہو کر رہ گئے اور توسیع پسند استعماری قوتوں نے ان کو مہذب بنانے کے بہانے ان پر بزور شمشیر حکمرانی کی۔ یہی نہیں بلکہ تاریخی حافظے کے کٹاؤ سے پیدا ہونے والے خلاء ہی میں پشتونوں کے بارے میں بنی اسرائیل ہونے کی داستان گھڑی گئی۔ چین، ہندوستان اور فارس جیسے پڑوسیوں کے بیچ میں جو قدیم تہذیبوں کے وارث ہیں، پشتونخواہ کا

اس طرح اپنے تہذیبی اور تاریخی محور سے بھٹک جانا ان کے کمزور ہونے کا باعث بنا۔ مغل سلطنت اور انگریزی استعمار نے ان کے مذہبی جذبات کو استعماری سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استفادہ حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ اسلام کو ایک سیاسی کارڈ کے طور پر پشتون قومی مزاحمت کو دبانے کے لیے سب سے پہلے مغلوں نے استعمال کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ مغل شہنشاہ اکبر جس نے خود دین الٰہی کی بنیاد رکھی اس نے پشتون صوفی بایزید انصاری المروف پیر روشان کو پیر تاریک قرار دلوایا اور اس مقصد کے لیے حکومت کے حامی علماء کو استعمال کیا۔ انگریز حکومت نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا۔ انگریزوں سے آزادی کے بعد پاکستان میں آمرانہ حکومتوں کے ہاں بھی یہ انتہائی مرغوب حربہ رہا ہے۔

بڑی حد تک اسی مشکل، دور افتادہ اور دشوار جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے یہ علاقہ تاریخ کے مختلف ادوار میں الگ تھلگ رہا۔ اس کے علاوہ پشتون قبائل نے ایسے تاریخی مراحل میں بھی جب ان کا وطن سلطنتوں کا مرکز تھا، اپنی داخلی خودمختاری اور قبائلی سماجی ڈھانچہ برقرار رکھا۔ مختلف قسم کی ریاستی پابندیوں سے آزاد قبائلی نظام شاید ہی کسی اور قومیت کے لوگوں میں اتنے طویل عرصے تک برقرار رہا ہو جتنا کہ وہ پشتونخوا میں رہا ہے۔ بابر نے "تزکِ بابری" میں بنگش قبیلے سے زبردستی ٹیکس وصول کرنے کا ذکر کیا ہے۔ بنگش قبیلے کا وہ حصہ جو کرم ایجنسی میں رہتا ہے اب بھی کسی قسم کا ٹیکس نہیں دیتا۔ اتنے لمبے عرصے تک ریاستی کنٹرول سے آزاد پشتون قبائل کی اجتماعی نفسیات کی اپنی خصوصیات ہیں۔

شمال مغرب کی جانب سے آنے والے حملہ آوروں میں مختلف اقوام
ش رہی ہیں لیکن پشتونوں کو تیرہویں صدی میں ہوئے والا چنگیز خان کا تباہ کن حملہ یادرہاہے۔اس کے علاوہ تیمورلنگ اورظہیرالدین بابربھی ترک تھےلیکن وہ خود کومغل کہلواتے تھے۔ اسی لیے پشتو ادب میں 'مغل' اور 'مغلتیا' جارحیت اور ستعماریت کی علامت بن گئے ہیں۔اس ادبی اصطلاح کی بنیاد درحقیقت نسلی نہیں بلکہ مختلف حملہ آوروں کے خلاف اپنی آزادی کی حفاظت کرنے والے پشتونوں نے اسے ادبی اورسیاسی علامت بنادیاہے۔

پشتونوں کے اپنے کئی ناموں کی طرح ان کے وطن کو بھی مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ پکتیکا اور گندھارا کے قدیم ناموں کے علاوہ افغانستان کا ذکر سیفی ہروی کی کتاب "تاریخِ ہرات" میں موجود ہے جس کے مطابق 1250ء میں قندھار سے لے کر مستونگ اور کوئٹہ تک کے علاقے کو افغانستان کہا جاتا ہے۔یہ پرانا افغانستان مکمل طور پر آزاد نہیں تھا بلکہ یہ منگولوں کا باجگزار تھا۔اسلامی دور کے مصنفین نے اس علاقے کو جبال الافغانیہ یا جبالالافاغنہ، کشورِ افغان، حدِ افغانیان، مرزافغان، افغان، روہ اور پختونخوا کے ناموں سے پکارا ہے۔مکمل طور پر آزاد افغانستان 1747ء میں مغل اور صفوی سلطنتوں کے زوال کے بعد ہی بن سکا۔

پشتونوں کے وطن کو 'روہ' بھی کہا جاتا ہے۔اس کا سب سے قدیم تحریری ذکرعبداللہ نامی مورخ کی "تاریخ داؤدی" (76-1575ء) میں آیا۔ وہ روہ کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:''روہ کا طول سواد بجور (سوات باجوڑ) سے سی

کے قصبے، جو بکھر کے تابع ہے، تک ہے۔ اس کا عرض حسن ابدال سے کابل اور قندھار تک ہے۔ ان سرحدوں میں واقع تمام علاقے کو روہ کہتے ہیں۔'' دیگر مورخوں کی کتابوں میں بھی تقریباً اس سے ملتی جلتی تعریف موجود ہے۔ ان میں نواب محبت خان بڑیچ کی "ریاض المحبت "(1806ء)، نظام الدین کی "طبقاتِ اکبری"، نعمت اللہ ہروی کی "تاریخِ خان جہانی ومخزنِ افغانی" اور محمد قاسم کی "تاریخِ فرشتہ" شامل ہیں۔

کاظم خان شیدا، اشرف خان ہجری اور خوشحال خان خٹک نے اپنے اشعار میں روہ کا نام اپنے وطن کے نام کے طور پر لیا ہے۔ انگریز مصنفین الفنسٹن، ہنری بیلو اور اولف کیرو کا خیال ہے کہ ہندوستانی پشتونوں کے علاقے کو روہ کہتے تھے۔ ہندوستان میں روہیل کھنڈ کی وجہِ تسمیہ بھی یہی ہے۔ پشتونوں اور افغانوں نے اپنے دیس کو پشتونخوا یا پختونخوا بھی کہا ہے۔ اس کا ذکر قدیم یونانی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اسلامی عصر میں اخوند درویزہ کی کتاب "مخزن الاسلام" (12-1603ء) میں پختونخوا کا ذکر بار بار آیا ہے۔ احمد شاہ ابدالیؒ نے اپنے ایک شعر میں افغانیوں کے وطن کو پشتونخوا لکھا ہے۔ ان کے معاصر شاعر پیر محمد کاکڑ نے بھی اسی مفہوم میں پشتونخوا کا ذکر کیا ہے۔

مغربی مصنفین میں ڈاکٹر لیڈن نے 1812ء میں بایزید روشان کے بارے میں لکھے ہوئے مضمون میں پشتونخوا کو افغانستان کے دوسرے نام سے یاد کیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں دارمیسٹر نے پشتو گیتوں کے مجموعے کو

"پشتونخوا کا ہار و بہار" کے نام سے شائع کیا۔ بیسویں صدی میں اولف کیرو سمیت بہت سارے مصنفین نے پشتونخوا کو پشتونوں کا وطن قرار دیا۔ خود پشتون اپنے وطن کو پشتونخوا کہتے ہیں اور اس کو برے (بالائی) پشتونخوا اور لرے (زیریں) پشتونخوا کے علاوہ شمالی اور جنوبی پشتونخوا جیسی اصطلاحات میں استعمال کرتے ہیں۔

نسلیاتی مباحثے

مختلف تاریخی اور جغرافیائی عوامل کی بنیاد پر پشتونوں کے نسلیاتی سرچشموں اور ان کی اصل نسل کے بارے میں ماضی میں کافی ابہام پایا جاتا تھا۔ ایک ایسے قبائلی معاشرے میں، جس کی حکمت اور زندگی کے بارے میں نکتہِ نظر کا بیشتر حصہ سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات اور زبانی طور پر دہرائے جانے والے غیر تحریری عوامی ادب کی شکل میں پیش کیا جاتا ہو، یہ بات بالکل عجیب نہیں تھی کہ جدید علمی تحقیق کے اوزاروں کے استعمال سے پہلے ان کے ماضی کے بارے میں مختلف قسم کے قصے اور کہانیاں پائی جاتی تھیں اور نام نہاد روایات اور داستانوں نے تاریخ کی جگہ لے لی تھی۔ انگریز مصنف راورٹی کے مطابق ''کسی اور قوم کے حسب نسب کے بارے میں اتنا زیادہ اختلافِ رائے موجود نہیں جتنا افغانوں (پشتونوں) کے بارے میں پایا جاتا ہے۔''

سولھویں صدی سے انیسویں صدی تک زبانی روایات کی بنیاد پر لکھی جانے والی تاریخ کی کتابوں میں (جن میں سے بیشتر فارسی زبان میں ہیں) پشتونوں کو بنی اسرائیل کی ایک شاخ بتایا گیا۔ مغل دربار کے مصنف ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" (98-1597ء) میں کابل کے گردونواح کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے علاقے کے لوگوں کی تاریخ پر ایک سرسری تبصرے میں لکھا: ''افغان

خود کو اسرائیل کی اولاد سمجھتے ہیں۔'' اس نے مزید لکھا: ''پشتونوں کا خیال ہے کہ ان کے جدِ امجد، جس کا نام افغان تھا، کے تین بیٹے تھے جن کے نام سڑبن، غورغشت اور بٹن تھے۔''

اخوند درویزہ کی کتاب "تذکرۃ الابرار ولاشرار" میں، جو 13-1603ء کے درمیان لکھی گئی، پشتونوں کو بنی اسرائیل بتایا گیا ہے مگر جس کتاب میں پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کی روایت کو پوری تفصیل اور دعوے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ نعمت اللہ ہروی کی کتاب "تاریخ خان جہانی ومخزنِ افغانی" (13-1212ء) ہے۔ اس کتاب میں بنی اسرائیل کی تاریخ کی کافی تفصیل، ان کا شجرۂ نسب اور اسرائیلی بادشاہوں کی فہرست بیان کی گئی ہے۔ اسرائیلی بادشاہوں میں ملک طالوت، داؤد، سلیمان، ارمیا اور برخیا کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کے بعد ارمیا اور برخیا کے بیٹوں کو آصف اور افغنہ بتایا گیا ہے۔

نعمت اللہ ہروی کی روایت کے مطابق آصف اور افغنہ کی اولاد شام میں پھیل گئی لیکن سلیمان کی وفات کے بعد بخت نصر نے شام پر حملہ کر کے اسرائیلیوں کا قتلِ عام کیا۔ عزیز اور دانیال قید ہوئے اور جو اسرائیلی تہ تیغ ہونے سے بچ گئے وہ آصف اور افغنہ کے ساتھ غور، غزنی، کابل، فیروزکوہ اور قندھار کی جانب چلے گئے اور وہاں آباد ہو گئے۔ "تاریخ خان جہانی ومخزنِ افغانی" کے مطابق جب خالد بن ولیدؓ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے افغنہ کی اولاد کے قائد قیس کو خط لکھ کر بلایا۔ بنی افغان کے بزرگوں نے قیس کی قیادت میں حضرت محمدؐ کے ساتھ ملاقات کر کے اسلام قبول کیا۔

قیس کا اسلامی نام عبدالرشید رکھا گیا۔

اس روایت کے مطابق عبدالرشید نے 87 برس کی عمر میں 70 ہجری میں وفات پائی۔ ان کے وارث ان کے تین بیٹے سڑبن، بتن اور غورغشت تھے۔ یہی تین بھائی پشتونوں کے جدِ امجد تھے جن سے پشتون قبیلوں کی مختلف شاخوں کا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شاخ کرلانی ہیں جن کا شجرہ نسب عبدالرشید کے ایک منہ بولے بیٹے سے ملتا ہے۔ نعمت اللہ ہروی کی اس تفصیلی تاریخ کے بعد افضل خان خٹک، حافظ رحمت خان، زرداد خان اور قاضی عطاء اللہ نے بھی اپنی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابوں میں اسی روایت کو دہراتے ہوئے پشتونوں کو بنی اسرائیل گردانا ہے۔

شروع میں مغربی مصنفین نے بھی فارسی کتابیں پڑھ کر پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کی روایت کو من وعن قبول کیا۔ مارچ 1784ء میں بنگال کی رائل ایشین سوسائٹی کے رسالے "ایشین ریسرچ" کے دوسرے شمارے میں سرولیم جونز نے پشتونوں کے اسرائیلی النسل ہونے کا ذکر کیا۔ اسی طرح الیگزینڈر برنز نے 1832ء میں اپنی ایک تصنیف " کابل" میں اسی خیال کو دہرایا۔ ولیم مور کرافٹ، چارلز میسن اور روز نے بھی پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کی تھیوری کی تائید کی ہے۔ ان مصنفین نے پرانی کتابوں کے حوالے دینے کے علاوہ پشتونوں کی بعض روایات، ناموں، جسمانی خصوصیات اور چہروں کے خدوخال کی یہودی روایات، ناموں اور چہروں کے ساتھ مشابہت کو دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ہنری والٹر بیلو نے اس موضوع پر پوری کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے

"افغانوں کے بارے میں نیا سوال: کیا پشتون واقعی بنی اسرائیل ہیں؟" اس کا کہنا ہے کہ افغان ایک اسرائیلی قبیلہ تھا جس کو بخت نصر نے قید کر کے شام سے غور بھجوایا۔ بیلو نے اس سلسلے میں "تورات" کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اسرائیلیوں کے اسیر دس قبیلوں میں سے کچھ نے بھاگ کر دوسری جگہوں پر پناہ لی۔ والٹر بیلو اور بعض دوسرے مغربی منصفین کے نکتۂ نظر میں فرق یہ ہے کہ دیگر مصنفین کے برعکس بیلو کا خیال ہے کہ کچھ پشتون تو بنی اسرائیل ہیں جبکہ باقیوں کا رشتہ وہ برہمنوں، خانہ بدوش یونانیوں، ساکا، مغلوں، ترکوں، عربوں اور آرمینیوں کے ساتھ جوڑتا ہے۔

ایک اور مشہور انگریز پشتون شناس ہنری راورٹی نے بھی اپنی تحریروں میں پشتونوں کے اسرائیلی ہونے کا خیال پیش کیا ہے۔ راورٹی کے ایک مضمون میں، جو پہلے 1852ء میں بنگال رائل سوسائٹی کے رسالے میں چھپا اور بعد میں اس کی لکھی ہوئی پشتو گریمر کی کتاب میں دیباچے کے طور پر شائع ہوا، زیادہ کھل کر پشتونوں کو بنی اسرائیل قرار دیا گیا ہے۔

راورٹی لکھتا ہے: ''میں مکمل غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان مشابہتوں کے پیشِ نظر جو میں نے پشتو اور عبرانی زبانوں میں پائی ہیں اور متعدد روایات کے وجود کے پیشِ نظر پشتون حضرت یعقوبؑ ہی کی اولاد ہیں۔ یہودیوں کی اسارت کے ڈھائی ہزار سال بعد بھی ان کے کئی ایک رواج پشتونوں میں موجود ہیں۔ افغانوں کا چہرہ دوسری اقوام سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے مختلف ہے۔ ان

کی آپس میں کشتی اور بعض دیگر کھیل، تجارت میں ان کی ہوشیاری، منافع سے ان کی لگن اور بعض دیگر شواہد کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بتدریج مغربی ایشیاء سے آئے ہیں۔ اس ساری بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ افغان یہودیوں کے دس قبیلوں کی باقیات ہیں۔"

غرض انیسویں صدی کے اوائل تک پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کی تھیوری کا غلبہ رہا۔ پشتونوں کے لیے اپنے مذہبی عقیدے کے نکتہِ نظر سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کا خیال خاصا پرکشش تھا اور مغربی مصنفوں کے لیے بھی گم شدہ یہودی قبیلوں کو دریافت کرنے کا سہرا اپنے سر سجانے کی پیش رفت خاصی ہیجان انگیز تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد جب تاریخی تحقیق میں نسبتاً علمی اور سائنسی اوزاروں کا استعمال شروع ہوا اور زبان، ثقافت، سماجی خصوصیات اور آثارِ قدیمہ کے بارے میں جدید تحقیقات، معلومات اور مطالعوں کی روشنی میں پرانے تاریخی نظریات کا تنقیدی مطالعہ شروع ہوا تو نہ صرف پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کی تھیوری کی کمزوریاں سامنے آئیں بلکہ تحقیقی مطالعے نے متبادل نظریات پیش کرنا شروع کر دیے۔

ان میں سب سے اہم پشتو زبانوں کے ہندیورپی خاندان کی ایرانی شاخ سے متعلق ہونے کا نظریہ ہے۔ پہلا اہم مغربی مصنف جس نے پشتونوں کے یہودی النسل ہونے کے خیال کو قطعی طور پر رد کیا وہ انگریز مصنف منسٹیورٹ الفنسٹن تھا جس نے 1812ء میں مشہور کتاب "سلطنتِ کابل" لکھی۔ اس کتاب میں

اس نے پشتونوں کی اصل نسل کے بارے میں خاص گہرائی سے تحقیق کی ہے۔ اس نے پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ خود اس روایت کے اندر ہی اس کے بطلان کی دلیل بھی پوشیدہ ہے۔ الفنسٹن اس روایت کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں ساول (ملک طالوت) کو حضرت ابراہیمؑ کی پنتالیسویں پشت شمار کیا گیا ہے اور پھر پشتونوں کے جدِ امجد قیس (عبدالرشید) کو ساول کی سینتیسویں پشت قرار دیا گیا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ متذکرہ بالا روایت "تورات" میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ صرف 37 پشتیں کس طرح 1600 برس کے عرصے پر محیط ہوسکتی ہیں۔ ایسے حالات میں اسے خوش عقیدگی اور گھڑی گھڑائی روایات کا مجموعہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی نہیں الفنسٹن ولیم جونز کی طرف سے پشتونوں کے یہودی النسل ہونے کے حق میں پیش کیے جانے والے چاروں دلائل کو رد کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''افغانوں اور یہودیوں کے رسم و رواج میں بہت ساری مشابہتوں کی بات کی جاتی ہے لیکن یہ ایسی مشابہتیں ہیں جو مختلف اقوام کی سماجی زندگی کے بعض ارتقائی مراحل میں معمولاً پائی جاتی ہیں اور اگر اس نوعیت کی مشابہتوں کو مختلف اقوام کے واحد نسلیاتی منبع کے بارے میں دلیل کے طور پر قبول کرلیا جائے تو پھر تاتاریوں، عربوں، جرمنوں اور روسیوں کو ایک نسلیاتی منبع سے پھوٹنے والی اقوام سمجھا جاسکتا ہے۔''

جان میلکم نے بھی پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کی روایت کو کاما

غیر تاریخی ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے: ''ایسی کوئی تحریر نہیں ملتی جس سے پشتونوں کا بنی اسرائیل ہونا ثابت ہو سکے۔ ان کے (پشتونوں کے) اپنے ہاں جو مبہم روایت پائی جاتی ہے اسے مسلم روایت کے طور پر نہیں مانا جا سکتا۔'' مشہور مستشرق اور جید عالم برنارڈ ڈورن، جس نے اپنی زندگی کا خاصا بڑا حصہ پشتو زبان اور پشتون تاریخ کے مطالعے کے لیے وقف کیا تھا نے اور باتوں کے علاوہ خواجہ نعمت اللہ ہروی کی "تاریخ خان جہانی ومخزنِ افغانی" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے اسے 1836ء میں لندن سے چھاپا۔ ترجمے کے علاوہ اس نے اس کتاب کے مواد پر بڑی عمدگی سے تبصرہ بھی کیا ہے۔

ڈورن پشتونوں کے بنی اسرائیل ہونے کی تھیوری کو رد کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''فارسی بولنے والے مورخین نے پشتونوں کو یہودی النسل تو قرار دیا ہے لیکن ان کے پاس سوائے ان عامیانہ روایات کے، جن کو انہوں نے ان کی ماہیت سے قطع نظر مسلمہ حقائق کے طور پر ریکارڈ کیا ہے، کوئی اور ثبوت موجود نہیں ہے۔'' وہ بعض پشتون ناموں کی یہودی ناموں کے ساتھ مشابہت کے بارے میں لکھتا ہے: ''چونکہ افغان مسلمان ہیں اور مسلمان اور یہودی ناموں کے بعض مشترک تاریخی اور قومی منابع پائے جاتے ہیں تو اس طرح کی مشابہت کی اصل وجہ یہی ہو سکتی ہے۔''

اسی طرح چہروں اور خدوخال کی مشابہت کے بارے میں جان میلکم کے ان الفاظ کا حوالہ دیتا ہے: ''اگر مختلف لوگوں کے چہروں میں مشابہت ان کے واحد نسل ہونے کا ثبوت ہو سکتی تو پھر کشمیریوں کو یہودی النسل قرار دیا جا سکتا تھا کیونکہ مغرب

سے آنے والے بعض لوگ ان کے خدوخال کو یہودیوں کے خدوخال جیسا سمجھتے ہیں۔'' ڈورن پشتونوں کے بیت المقدس یا اس کے گردونواح سے نقل مکانی کے دعوے کو مکمل طور پر غیر تاریخی اور غیر منطقی سمجھتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ غالب اور قدیم تاریخی شواہد پشتونوں کے بہت قدیم زمانے سے افغانستان کے مختلف حصوں میں رہنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

جس بات نے پشتونوں کے حسب نسب کے بارے میں پائے جانے والے نظریات میں اہم تبدیلی پیدا کی وہ پشتو زبان کے بارے میں روزافزوں ترقی کرتی ہوئی علمی تحقیق ہے۔ کلاپرٹ پہلا مستشرق تھا جس نے 1810ء میں "آرکایوز آف ایشین لٹریچر" کی پہلی جلد میں پشتو کے سامی زبان ہونے کے خیال کو رد کرتے ہوئے لکھا: ''پشتو اور سامی زبانوں کے درمیان گریمر اور الفاظ کے لحاظ سے کوئی مشابہت نہیں۔'' منسٹیورٹ الفنسٹن نے بھی پشتو کے گہرے اور طویل مطالعے کے بعد 1814ء میں پشتو اور کلدانی زبانوں کے درمیان مشابہت کے بارے میں ولیم جونز کے دعوے کو رد کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس نے 218 پشتو الفاظ کا دوسری زبانوں کے اسی مفہوم رکھنے والے الفاظ کے ساتھ موازنہ کیا لیکن ''ان میں سے کوئی ایک بھی عبرانی یا کلدانی زبان کے ساتھ تھوڑی سی مشابہت بھی نہیں رکھتا۔''

برنارڈ ڈورن نے 1863ء میں لکھا: ''پشتو کا گریمر یا کلمات کے لحاظ سے عبرانی یا کلدانی زبانوں کے ساتھ کوئی میل نہیں ہے۔'' کلاپرٹ اور ڈورن نے نہ صرف پشتو کے سامی زبانوں کے گروپ کے ساتھ تعلق کو رد کیا بلکہ انہوں نے پشتو

کو ایک آریائی زبان قرار دیا۔ مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے کے ساتھ علم الانسان نے جوں جوں ترقی کی، اتنا ہی پشتو کے انڈو یورپین زبانوں کے ساتھ تعلق کے ثبوت فراہم ہوتے گئے۔ رابرٹ لیچ نے 1839ء میں بنگال کی ایشیائی سوسائٹی کے رسالے میں پشتو گریمر کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو غالباً اس موضوع پر پہلی مغربی تحریر ہے۔ اس نے پشتو اور سنسکرت کے اصولوں کا موازنہ کر کے ان میں بہت ساری مشابہتوں کی نشاندہی کی۔

مشہور فرانسیسی مستشرق دارمیستر نے بھی 1887ء میں چھپنے والی ایک رپورٹ میں پشتو کو انڈو ایرانی زبانوں کے خاندان کا جزو قرار دیا لیکن جس شخص نے پشتو کو سب سے پہلے ہند آریائی خاندان کے ایرانی گروپ کا حصہ قرار دیا وہ شیل ڈیور تھا۔ اس نے "معاصر لسانیات کا تقابلی خلاصہ" کے عنوان سے 1853ء میں ایک تحریر چھاپی جس میں کہا گیا کہ پشتو کا تعلق ایرانی گروپ سے ہے لیکن اس کی کچھ اپنی خصوصیات بھی ہیں۔

جان مارگنسٹرن نے دارمیستر کے بعد پشتو کا مطالعہ کیا اور دیگر زبانوں کے ساتھ اس کا موازنہ کیا۔ اس نے بھی پشتو کے ایرانی گروپ سے متعلق ہونے کے خیال کی تائید کی۔ اس کا خیال ہے کہ پشتو ساکا زبان سے اس قدر قریب ہے کہ شاید ابتداء میں یہ دونوں ایک ہی زبان رہی ہوں۔ یاد رہے کہ ساکا 897 ق م سے پانچویں صدی عیسوی تک پشتونخوا میں موجود تھے۔ لیکن ان سب علماء کا یہ بھی کہنا ہے کہ پشتو زبان کے ایرانی گروپ سے تعلق میں شک نہیں البتہ اس میں ہندی گروپ

سے تعلق رکھنے والے آریائی زبانوں کے بہت سارے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ گویا پشتونوں کے جغرافیے کی طرح ان کی ثقافت بھی ہندی اور ایرانی ثقافت کے درمیان پل کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

قدیم مشرقی تحریروں میں اکثر پشتونوں کو افغان پکارا جاتا رہا ہے لیکن بہت سارے علماء اور محققین کی رائے یہ ہے کہ پشتون افغان سے زیادہ پرانا لفظ ہے۔ مشہور یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس (26-484 ق م) تاریخی تحریروں میں پشتونوں کو پکتویس یا پختویس کے نام سے پکارتا ہے۔ اس نے متذکرہ بالا تحریروں میں پکتیکا یا پکتو یک نامی علاقے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں ہیروڈوٹس کی تحریروں میں سے مندرجہ ذیل اقتباسات کا خصوصی طور پر حوالہ دیا جاتا ہے:

- ''داریوش نے دو آدمیوں کو یہ معلوم کرنے پر متعین کیا کہ اباسین کہاں سمندر میں جا گرتا ہے۔ ان دو آدمیوں نے اپنا کام کسپتروس کے شہر اور پکتیکا کے ملک سے شروع کیا۔''

''اس کے علاوہ اور ہندی بھی ہیں جن کی کسپتروس اور پکتیکا کے ملک کے ساتھ سرحدیں ملتی ہیں۔ وہ باقی ہندیوں کے شمال میں واقعہ ہیں۔''

''پختویس نے پوستین پہن رکھے تھے اور دیسی کمانوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔''

"لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کے مولف جارج گریرسن نے نہ صرف ہیروڈوٹس کے ذکر کردہ مندرجہ بالا ناموں کو پختونخوا اور پختون کے مترادف قرار دیا

ہے بلکہ وہ تو "ریگ وید" میں ذکر کیے جانے والے پکتیکا س کو پختون کا منبع قرار دیتا ہے۔ سر اولف کیرو بھی کافی بحث و تمحیص کے بعد 1956ء میں چھپنے والی اپنی کتاب "دی پٹھانز" میں کسپتروس کو پشاور اور پکتیکا کو پختونخوا قرار دیتا ہے۔ جہاں تک پختون اور پشتون کے فرق کا تعلق ہے تو پشتو زبان کی ایک صوت (آواز) جسے عربی رسم الخط میں پشتو لکھنے کے لیے خصوصی طور پر اضافہ کیے جانے والے حرف 'ښه' سے ظاہر کیا جاتا ہے، شمال میں 'خ' بولتے ہیں اور جنوب میں 'ش' پکارتے ہیں۔ جرمن زبان میں بھی اسی طرح کی ایک صوت موجود ہے جس کو کچھ جرمن 'خہ' اور کچھ 'شہ' بولتے ہیں۔

بہت سارے محققین کی رائے میں افغان کا سب سے پہلے نقشِ رستم کے اس کتبے میں ذکر ہوا ہے جو ساسانیوں کے بادشاہ شاہ پور اول کے حکم سے پارتھی اور یونانی زبانوں میں لکھا گیا۔ شپر نگ لن نے شاہ پور کبیر اول اور زرطشت کا کعبہ کے موضوع پر ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جس میں متذکرہ بالا کتبے کی تشریح پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ اس کے خیال میں کتبے میں ذکر شدہ لفظ ابگان کا موجودہ افغان سے بہتر کوئی اور مترادف نہیں ہوسکتا۔ سر اولف کیرو اور بعض دیگر مورخین نے بھی اس خیال کی حمایت کی ہے۔

جان مارگنسٹرن کا تعلق ان مورخین سے ہے جن کے خیال میں افغان نام کا ذکر سب سے پہلے ایک قدیم ہندی منجم وارہ مہرہ (varahmihira) نے 'اوگانہ' کی شکل میں کیا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں مذکورہ نجومی نے "برہات سمہیتا"

(Brhat Samhita) نامی کتاب میں لکھا: ''مندرجہ ذیل لوگ دم دار ستارے کے زیرِ اثر ہیں۔ غزنی کے سنگر، پہلوی، سویت، بتن، کول، اوگانہ...اور غیر منصف اور جاہ طلب لوگ۔'' اچ کرن نے 1869ء میں "برات سمہیتا" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے چھاپ دیا۔ اس نے بلا تامل اوگانہ کو افغان لکھا کیونکہ اس کو اس بارے میں مکمل یقین تھا۔

الیگزینڈر کننگم "قدیم ہند کا جغرافیہ" نامی کتاب میں "اپوکین یا افغان" کے عنوان سے لکھتا ہے: ''چینی زائیر ہیون سانگ نے اپوکین کا ذکر ایک مختصر عبارت میں کیا ہے اور انہیں فلنہ (بنوں) اور غزنی کے درمیان میں یعنی بنوں کے شمال مغرب میں رہنے والے بتایا۔'' آگے چل کر کننگم لکھتا ہے: ''مجھے یقین ہے کہ ہیون سانگ کے اپوکین کا مطلب افغان ہی ہے۔ اپوکین کا مترادف افغان ہے کیونکہ چینی زبان مین لفظ افغان کو اس سے زیادہ صاف طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا اور اگر یہ بات صحیح ہے تو، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، یہ افغانوں کا سب سے قدیم تذکرہ ہے۔'' اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ کننگم کو "بڑات سمہیتا" کے اوگانہ کا علم نہیں تھا۔

بہر حال جہاں تک اسلامی دور کی تحریروں کا تعلق ہے تو ان میں افغان نام بار بار اور واضح طور پر آیا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے شاعر ارزقی ہیروی سلجوقی حکمران گھرانے کے مداح تھے۔ انہوں نے الپ ارسلان محمد سلجوقی کے بیٹے طغانشاہ کی وفات پر لکھا:

باز گوی زہری پیش ملک صورت حال

تقریباً ایک ہزار سال پہلے لکھی جانے والی کتاب "حدود العالم" میں افغان کا تذکرہ اسی شکل میں ہوا ہے البتہ پشتون یا پختون کا ذکر غیر ملکی یا غیر پشتون مصنفین نے کم ہی کیا ہے۔ 1603ء اور 1612ء کے درمیان لکھی جانے والی اخوند درویزہ کی کتاب "مخزن الاسلام" میں واضح طور پر پختون کو اپنے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بہت سارے پختون شاعروں اور مصنفوں نے، جن میں اخوند درویزہ، خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا شامل ہیں، پختون اور افغان کو مترادف مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

پرانی روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پختونوں کے اسرائیلی جدِ امجد قیس نے (جن کا اسلامی نام عبدالرشید رکھا گیا) حضرت خالدؓ کے ساتھ مل کر کئی ایک غزوات میں حصہ لیا۔ حضرت خالدؓ نے حضرت محمدﷺ کو عبدالرشید کی بہادری کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو پیغمبر اسلام نے اُس کو بتان کا لقب عطا کیا۔ بتان کشتی کے بنیادی حصے کو کہتے ہیں۔ یہی لفظ بعد میں پٹان بنا اور اسی روایت کی بنیاد پر ہندی مصنفین نے پشتونوں کو پٹھان کہا جو اب تک معمول ہے۔ اگر چہ مقامی طور پر ہندکو بولنے والے ہندکوان، کھوار بولنے والے چترالی، کوہستانی بولنے والے کوہستانی اور گوجری زبان بولنے والے گوجر کہلاتے ہیں لیکن یہ سب لوگ عام طور پر اور خصوصاً بیرونی طور پر پٹھان کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

تہذیبی اور قومی شناخت کے تاریخی اجزائے ترکیبی

پشتونخوا کے مخصوص جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے یہاں شمال اور مغرب سے نقل مکانی کرنے والے اقوام و قبائل اور حملہ آوروں کے ریلے صدہا برس تک آتے رہے اور جنگ و جدل کے لامتناہی سلسلوں کے ساتھ ساتھ نئے آنے والوں میں بہت سے لوگ یہیں آباد ہوتے گئے۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک نو وارد اپنے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی اقدار بھی لایا اور جوں جوں وہ مقامی معاشرے میں جذب ہوا، اس نے یہاں کے تہذیب و تمدن، فن، علم اور زبانوں کو بھی غنا بخشی۔

آریانہ یا ایران کی مشرقی سرحد ہونے کے ناطے اس علاقے نے ایران اور توران کی کشمکش میں خاص کردار ادا کیا اور اس سے کافی متاثر بھی ہوا۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق یہ علاقے 518 ق م میں داریوش اول کے دور سے 237 ق م تک ایران کی ہخامنشی سلطنت کا حصہ رہے۔ زرطشت کی تعلیمات ایک لمبے عرصے تک یہاں چھائی رہیں اور اوستا زبان کے پشتو پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ علاقے کی آبادی کے مذہبی عقائد میں کافی تبدیلیوں کے بعد بھی آتش پرستی خاصی دیر تک موجود رہی اور جو لوگ آخر میں آتش کدوں کو خاموش کرنے کا موجب بنے وہ 'اور مڑ' یا آگ بجھانے والے کہلائے۔ اور مڑ آبادی اسی نام سے جنوبی وزیرستان اور پشاور کے نواح میں موجود ہے۔

مقدونیہ سے آنے والے سکندرِ اعظم نے 327 ق م میں پارس کے بادشاہ داریوش کو شکست دی اور 321 ق م میں فراہ کے راستے افغانستان میں داخل ہو کر شمال کی طرف ثمرقند اور سیر دریا تک گیا، پھر وہاں سے جنوب مشرق کی جانب آیا اور اگلے سال کے شروع میں اباسین اور دریائے سندھ پار کر کے آگے بڑھا۔ پشتونوں کے وطن میں اس نے بمشکل ایک سال گزارا ہوگا۔ سر اولف کیرو کی اس بات سے اختلاف کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اتنے کم عرصے میں وہ یونانی تہذیب و تمدن کیسے پھیلا سکتا تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہخامنشی سلطنت کے طویل اقتدار اور غلبے کے اثرات یہاں اتنے گہرے طور پر ریشہ زن تھے کہ اتنے کم عرصے کے لیے آنے والا فوجی فاتح بمشکل ہی ان میں دراڑ ڈال سکتا تھا۔

دراصل یونانی تہذیب و تمدن کے اثرات بعد میں آنے والی یونانی باختری سلطنت کا شاخسانہ ہیں جو 90-185 ق م میں شمال سے جنوب کی جانب پھیلی۔ جہاں تک عظیم فاتح سکندرِ اعظم کا تعلق ہے تو اس کے یہاں سے گزرنے کے تھوڑے عرصے بعد (305 ق م میں) ہندوستان کی موریہ سلطنت نے اس علاقے پر قبضہ جمایا اور چندر گپتا اور اشوکا جیسے عظیم بادشاہوں کا راج یہاں قائم رہا۔ اس دوران ہندوستانی تہذیب کے اثرات مرتب ہونا کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد باختر میں قائم ہونے والی یونانی باختری سلطنت نے جنوب کا رخ کر کے افغانی کوہستان کو اپنے اندر ضم کیا اور قریباً ایک صدی تک اس سلطنت کے حکمرانوں کا سکہ یہاں چلتا رہا۔ اسی ایک صدی میں اس علاقے کے تہذیبی ذخیرے

پر یونانی تمدن کی تہہ چڑھتی گئی۔ یہاں یونانی طرز کے شہر بنے اور علوم، فنون، سکوں، مجسموں اور تعمیرات میں یونانی ثقافت کا عکس شامل ہوا۔ اس امتزاج نے یقیناً یہاں کی ثقافت کو ایک نئی جلا بخشی۔

چترال میں بسنے والے کافرستان کے کالاشوں کو یونانی فوجوں کا وہ حصہ خیال کیا جاتا ہے جو ہندوکش کے پہاڑوں میں رہ کر یہیں کا ہوگیا۔ ان لوگوں کے جسمانی خدوخال، لباس، طرزِ رہائش اور طرزِ تعمیر کے علاوہ محققین نے ان کے یونانی النسل ہونے کے مزید دلائل ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ایک یونانی محقق ڈاکٹر ایپامینوناڈس نے کالاش لوگوں کی دیومالا کا یونانی دیو مالا کے ساتھ ایک ثقافتی موازنہ کیا ہے اور بعض ناموں میں بگاڑ یا تبدیلی کے باوجود اسے یونانی دیومالا کے ساتھ قریبی طور پر مشابہہ قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ چائمی (Chaimi) کو اپنے وطن مولود کے طور پر یاد کرتے ہیں جو درحقیقت یونانی دریا تائمیز (Thyamis) کی بدلی ہوئی شکل ہوسکتی ہے۔ وہ دیوتا زیو (Dia-Zeo) کی پوجا کرتے ہیں جو قدیم یونان کا دیوتا زیوس (Dias, Zeus) ہی ہے۔ کالاش اس دیوتا کو تمام دیوتاؤں کا باپ قرار دیتے ہیں۔ وہ زیوس کے بیٹے بیلومین کی بھی پوجا کرتے ہیں اور اسے سورج، روشنی، پیشن گوئی اور موسیقی کا دیوتا قرار دیتے ہیں۔ یونانی دیو مالا میں یہی کردار اپولو (Apollo) کا ہے۔ وہ جنگ کے رب النوع کی بھی پوجا کرتے ہیں اور ان کی قربانی اور تزکیہ کی رسوم اور روایات بھی قدیم قربانیوں کے ساتھ قریبی مشابہت کی حامل اور ایشیائی لوگوں کے لیے بالکل بیگانہ ہیں۔ بہرحال کالاش، ان

کے عقائد اور رسوم کافرستان تک ہی محدود رہے ہیں۔ خطے میں یونانی طرزِ تمدن کے پھیلاؤ کا منبع یونانی، باختری سلطنت تھی۔ ایک صدی کے بعد یونانی باختری سلطنت داخلی انتشار کا شکار ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی شمال سے ساکا اور پارتھی قبائل ایران اور موجودہ افغانستان میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ ساکا قبائل 97 ق م کے بعد بڑے پیمانے پر شمال سے آئے لیکن بلوچستان اور سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جنوب سے بھی اُمڈ آئے۔ ساکا گندھارا کی جانب بڑھے اور پارتھیوں نے خراسان کا رخ کیا۔ گندھارا پر غلبے کے لیے ساکا قبائل کی مختلف شاخوں کے درمیان بھی کشمکش چلتی رہی لیکن مجموعی طور پر پہلی عیسوی صدی کا بیشتر عرصہ یہاں ساکا پرچم لہراتا رہا۔ ان کا مقامی آبادی سے میل جول اور ربط بڑھا اور زبان اور ثقافت کے ارتقاء کے عمل میں انہوں نے حصہ بٹایا۔

بالآخر پارتھی پیش قدمی نے ان کے قدم اکھاڑ دیے لیکن پارتھی غلبے کو استحکام دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ 75ء میں دریائے آمو کے پار سے آبادی کا نیا ریلا آیا۔ پارتھیوں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے اور ٹیکسلا کے قریب ایک لڑائی میں فیصلہ کن شکست سے دوچار ہوئے۔ گندھارا کے نئے فاتح کوشان تھے۔ کئی صوبوں پر پھیلی کوشان سلطنت نے اس پورے خطے کی تاریخ اور ثقافت پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کے بادشاہ وائما نے سلطنت کو وسعت دی جبکہ اپنے دور کی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے کنشکا کوشانِ اعظم کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ کنشکا ہی تھا جس نے پشاور کو اپنا مرکز بنایا اور اس کے بعد تاریخ کے مختلف ادوار میں پشاور کی

مرکزیت مختلف اشکال میں موجود رہی، اگرچہ کنشکا والی عظمت شاید ہی پھر اسے نصیب ہوئی ہو۔

شمال کی جانب سے گندھارا آنے سے قبل کوشان غالباً آگ کی پوجا کرتے تھے لیکن یہاں آنے کے بعد ان کے مذہبی عقائد میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف خود بودھ مت قبول کیا بلکہ اسے پورے خطے میں بھی پھیلایا۔ اس دور میں گندھارا کی عظیم الشان تہذیب پھلی پھولی۔ سکوں، مجسموں، نقاشی اور آثارِ قدیمہ سے گندھارا کی بودھ تہذیب کی عظمت کا نشان ملتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کوشانی دور میں روم اور ایشیاء کے دور دراز علاقوں کے ساتھ تجارت نے فروغ پایا۔ تجارتی قافلوں کی آمدورفت کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن کی لہریں آپس میں ٹکراتی اور نئے دائرے بناتی رہیں۔

اسی دور میں ہینایامہ بدھ مت کی جگہ مہایانہ بدھ مت کے مکتب نے لی۔ کنشکا نے خانقاہیں، پگوڈے اور گوتم بدھ کی عظیم الشان مورتیاں بنوائیں۔ پہاڑوں پر تراشے گئے بودھ کے عظیم مجسمے ڈیڑھ ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود اب تک اس دور کی یاد دلاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مختلف سمتوں سے آنے والی ثقافتوں کے امتزاج اور ترکیب نے ایک نئے تمدن کی قوس قزح کو ابھارنے میں مدد دی۔

تیسری صدی عیسوی میں کوشانیوں کا زوال شروع ہوا۔ ایک مکمل عدمِ تشدد کے نظریے پر مبنی معاشرتی نظام جتنی بھی تہذیبی عظمت حاصل کرلیتا وہ کوئی

فوجی طاقت بہر حال نہیں بن سکتا تھا۔ ایسے نظام کا گندھارا جیسے جغرافیائی محلِ وقوع رکھنے والے خطے میں لمبے عرصے تک باقی رہنا ناممکن تھا۔ کوشانیوں کے زوال کا سبب بننے والی موج ایران سے اٹھی اور اسے تشکیل دینے والے ہخامنشی سلسلہ نسب سے تعلق رکھنے والے ساسانی تھے جنہوں نے اردشیر کی قیادت میں پارتھیوں کو شکست دے کر 226ء میں اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

اردشیر کے بعد اس کا بیٹا شاہ پور تخت نشین ہوا۔ یہ وہی شاہ پور ہے جس کے زمانے میں لکھے گئے کتبوں میں پشاور کا ذکر ملتا ہے۔ ساسانیوں کے باقاعدہ قبضہ کرنے سے قبل ہی گندھارا کے کوشانی ایرانی سلطنت کے زیرِ نگین آ گئے تھے۔ بہر حال ساسانیوں نے جلد ہی اپنی سرحد اباسین اور دریائے سندھ کے پار ٹیکسلا تک پہنچا دی۔ شاہ پور اول کے کتبوں میں پشاور کے علاوہ ایک اور نام بھی ملتا ہے جو اس علاقے سے متعلق ہے۔ وہ گونڈیفر ابگان ریسمنڈز (Goundifer Abgan Rismands) ہے۔ اس نام کا دوسرا حصہ 'ابگان' افغان کی قدیم شکل ہے۔

آبادی کا ایک طاقتور ریلا جو پانچویں صدی کے آغاز میں مرکزی ایشیاء سے کابل اور پشاور کی جانب بڑھا وہ سفید ہنوں پر مشتمل تھا جنہیں یفتالی بھی کہا گیا۔ یہ پہلے آنے والے اکثر ریلوں کے برعکس غیر ایرانی تھا اور اس نے گندھارا میں ایسی تباہی پھیلائی جس سے شاندار پرانی تہذیب بڑی حد تک ملیامیٹ ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ یہ لوگ اصلی ہنوں کی طرح زنگیریا ہی سے آئے تھے لیکن چینی مورخین انہیں ای تی لیڈو (Ye-ti-i-li-do) کہتے ہیں اور انہیں اصلی ہنوں یعنی ہیونگ

(Hiung-Nu) نو سے مختلف سمجھتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ شمالی ترکستان سے آنے کے باوجود وہ ترکی زبان نہیں بولتے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں یہ لوگ منگولیا کی آوار سلطنت کے کارندے تھے اور شاید آوار حکمرانوں کے جبر سے بچنے کے لیے ہی انہوں نے اپنے وطنِ عزیز سے نقل مکانی کی ہو۔

پہلے انہوں نے ثمرقند اور کاشغر کو روندا اور اس کے بعد 320ء کے لگ بھگ یہ سفید ہن باختر کی جانب بڑھے۔ انہوں نے جنوب کی سمت اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ وہ یکدم جنوب کی طرف نہیں گئے بلکہ انہوں نے یہ کام ایک تدریجی عمل کے طور پر کیا۔ بہر حال 425ء تک سفید ہنوں نے گندھارا پر مکمل طور پر قبضہ جما لیا تھا۔ جس کے بعد وہ ہندوستان کے شمالی حصے کو ہدف بنانے لگے۔ گوجر قبیلے بھی سفید ہنوں کے ساتھ ہی اس علاقے میں آئے تھے۔

یہ بات قابلِ یقین لگتی ہے کہ سفید ہن بھی یہاں بس گئے اور مقامی آبادی کا حصہ بنے۔ بعض لوگ تو ابدالی نام کو یفتالی یا پتالی کی بگڑی ہوئی شکل سمجھتے ہیں اور ابدالیوں کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیوں اور ان کی جنگجوئی کو ان کے سفید ہنوں کے نسلیاتی سلسلے سے جوڑنے کے لیے بطورِ دلیل استعمال کرتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ خلجی اقوام وقبائل میں یفتالیوں کی باقیات کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک گوجروں کا تعلق ہے تو وہ اسی نام کے ساتھ مالاکنڈ ڈویژن، ہزارہ ڈویژن اور وادیِ پشاور کے بعض دیہاتوں میں موجود ہیں جبکہ ان کا زیادہ بڑا حصہ پنجاب میں رہتا ہے۔

پرانے سکوں، کتبوں اور بعض دستاویزی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید ہنوں کے ہاتھوں گندھارا تہذیب کی تباہی کے ساتھ اس علاقے میں بودھ ازم کو بھی زوال آنا شروع ہوا اور اس کی جگہ ہندو دھرم نے لی۔ چینی سیاح ہیون سانگ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ 664ء میں گندھارا کے حکمرانوں نے ہندومت قبول کرلیا تھا۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا جب عربوں نے ایرانی سلطنت کو، جو بازنطینی حملوں کے نتیجے میں پہلے ہی نحیف و نزار ہو چکی تھی، شکست دے دی تھی۔ یہ فیصلہ کن شکست 664ء میں ہوئی لیکن باختر اور گندھارا پر عربوں کی فتح اور اسلام کے پھیلنے میں کافی وقت لگا اور بعض تاریخ نگاروں کی جانب سے دیا جانے والا یہ تاثر قطعاً صحیح نہیں ہے کہ گندھارا میں بودھ ازم کے زوال اور اسلام کے عروج کے درمیان کوئی وقفہ نہیں تھا۔ ٹھوس تاریخی شہادتوں کی روشنی میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوشاہی یہاں گیارہویں صدی میں محمود غزنوی کی فتوحات تک موجود رہی۔

ہر چند کہ باہر سے حملے کرنے کے علاوہ عرب مسلم حکومتوں نے اپنے نمائندے یہاں بھیجے لیکن وہ کئی صدیوں تک کوئی غالب حیثیت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ مسلم خلافت کی اندرونی کشمکش ایرانی خراسان کے حالات پر بھی اثر انداز ہوئی اور غیر مستحکم عرب سلطنت گندھارا کی طرف فیصلہ کن پیش قدمی نہیں کر سکی۔ بلخ میں سامانیوں نے دریائے آمو کے دونوں کناروں پر تقریباً 123 سال تک حکومت کی اور اسی دور میں خاندانِ غلاماں کے سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود نے غزنی میں اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے گندھارا اور پنجاب کو فتح کیا اور یہ

علاقے مستحکم طور پر اسلامی دنیا کا حصہ بنے۔ اس سے پہلے عربوں کے حملے عارضی پیش قدمیوں اور کامیابیوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں تھے۔

یہ سلسلہ جو خلافتِ راشدہ سے شروع ہوا تھا بنی امیہ اور عباسیوں کے دور تک جاری رہا۔ اسے ہرات اور شمال میں آمو کے پار کامیابی حاصل ہوئی لیکن جنوب اور مشرق میں کوئی دیرپا کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ موجودہ افغانستان کے جنوب مغرب میں زھنبیل اور کابل میں کابل شاہ کے لشکر عربوں سے برسرِ پیکار رہے جبکہ صوابی میں ہنڈ کے مقام پر دارالخلافہ رکھنے والی ہندو بادشاہی کو محمود غزنوی نے 1021ء میں شکست دی۔ البیرونی نے واضح طور پر اس ہندو بادشاہی کا تذکرہ کیا ہے۔

بارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں غزنوی سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اسی زمانے میں ترکوں کی ایک اور شاخ سلجوقیوں نے آمو پار کر کے ایران میں قدم جما لیے اور 1091ء میں بغداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ بہرام شاہ (1118-59ء) سلجوقیوں کا باجگزار تھا۔ چنگیز خان کے ہاتھوں تباہ ہونے کے بعد غزنی پھر نہیں سنبھل سکا۔ غزنویوں کے زوال کے بعد غوریوں کا عروج شروع ہوا اور علاؤالدین جہاں سوز کے ہاتھوں غزنی اور بست ویران ہوئے۔ اگرچہ سلجوق بادشاہ سنجر نے غوریوں کی گوشمالی کرنے کے لیے 1151ء میں علاؤالدین کو شکست دے کر اسیر بنا لیا لیکن سلجوقوں کو شمال سے آنے والی ترکوں کی ایک لہر سے ٹکرانا پڑ گیا جس سے غوریوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں

نے نہ صرف غزنی پر قبضہ کرلیا بلکہ آگے بڑھ کر ہندوستان میں غوری سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر حملے کیے تو اس وقت بھی اس کی فوج میں افغان یا پشتون شامل تھے لیکن غوریوں کی فتوحات میں وہ پیش پیش رہے اور ہندوستان میں ان کے نو آبادکاروں کے طور پر بس جانے کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو صدیوں تک جاری رہا۔ غزنوی سلطنت کے دور کو گندھارا کی تاریخ میں اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس دور میں نہ صرف یہاں کے باسیوں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا بلکہ ان کے ہندوستان میں پھیل جانے کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے وہ تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ بالواسطہ ایرانی سلطنت کا حصہ رہے اور مرکزی ایشیاء سے آنے والی قوموں کی لہروں کا سامنا کرتے رہے۔

مرکزی ایشیائی زبانوں کے بہت سارے الفاظ جیسے خان، اولس، برمتہ، اشر اور باتور پشتو زبان کا حصہ بنے۔ عرب ایسے وقت میں افغانستان پہنچے جب یہاں زراعت اور تجارت کا کافی وسیع تجربہ اور ترقی موجود تھی۔ نجوم، طب، ریاضی اور الٰہیات جیسے علوم پر یہاں کے علماء کو کافی دسترس حاصل تھی۔ یہاں کی زبانوں کی تحریر کے لیے خروشتی، یونانی اور برہمی رسم الخط رائج تھے۔ زرتشتی، بودھائی، شیوائی اور میترا پرستی یہاں کے بڑے مذاہب تھے۔ یہاں عربوں کے آنے کے وقت کوئی بڑی مرکزی حکومت نہیں تھی بلکہ مختلف علاقوں میں اپنی اپنی بادشاہتیں قائم تھیں۔

بہرحال سیستان کے راستے عرب فاتحین کی پیش قدمی اور بالآخر غزنوی

سلطنت کے قیام کے ساتھ جب گندھارا میں اسلام کا غلبہ ہوا تو یہاں کے باسیوں نے ایک بار پھر اپنے مذہبی عقیدے کو پورے خطے میں پھیلانے کا سلسلہ شروع کیا اور خصوصاً برِصغیر ہند اس کا ہدف بنا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ گلہ بانی اور خانہ بدوشی کرنے والے قبائل کی معیشت اپنے ہاں بڑی اور منظم باشاہتیں قائم کرنے کے وسائل مہیا نہیں کر سکتی تھی، اس لیے وہ بار بار پڑوسی ممالک بالخصوص ہندوستان پر افغان قبیلوں کے حملہ آور ہونے کا سبب بنتی تھی۔ محمود غزنوی کے بعد خصوصاً غوریوں کے وقت سے افغانیوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنتوں کے قیام کا آغاز کیا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں غوریوں کی بادشاہی میں خلجیوں کا عروج شروع ہوا۔ جلال الدین خلجی غیاث الدین بلبن کی افواج کا ایک اہم افسر تھا جس نے خلجی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس سلطنت کو علاؤالدین خلجی کے زمانے میں عروج حاصل ہوا اور اس نے ہندوستان میں ایسی وسیع وعریض سلطنت بنائی جس کی اس سے پہلے تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ بادشاہی دہلی میں 1321ء میں اختتام کو پہنچی۔ اسی طرح پشتون لودھیوں نے 75 برس تک (1451-1526ء) ہندوستان پر حکومت کی۔ بہلول، سکندر اور ابراہیم لودھی ان کے بادشاہ تھے۔ ابراہیم لودھی کو بابر نے پانی پت کے مقام پر شکست دے کر لودھی سلطنت کا خاتمہ کر کے مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

1539ء میں شیر شاہ نے بابر کے بیٹے ہمایوں کو شکست دے کر

ہندوستان میں پشتون سلطنت کا دوبارہ احیاء کرنا چاہا لیکن 1545ء میں اس کے انتقال کے بعد جلد ہی ہمایوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر کے مغل سلطنت کے دوام کو فروغ دیا۔ لودھی اور سوری بادشاہوں کے زوال کا سب سے اہم عامل حکمران پشتون اشرافیہ کے اندر پائی جانے والی قبیلوی خصوصیات تھیں جو افغانستان کے پہاڑوں سے نکلنے اور ہندوستان کے میدانوں میں آباد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جگہ باقی ہیں اور اندرونی نفاق، بغاوت اور کمزوری کا باعث ہیں۔ لودھی اور سوری بادشاہوں کے سامنے اہم سوال قبائلی راہنماؤں کی خودمختاری اور سلطان کے مطلق العنان منصب کے درمیان توازن قائم کرنے یا کسی ایک رجحان کے انتخاب کا سوال تھا۔ بہلول لودھی نے قبائلی خودمختاری کا احترام کیا۔ اس نے قبیلوں کے سرداروں کو اہمیت دے کر اپنی پوزیشن کو مضبوط بنایا اور بہلول دانا کہلایا۔ لیکن ابراہیم لودھی نے مختلف قبائلی مفادات کو یکسر نظر انداز کر کے ایسے اندرونی نفاق کو جنم دیا جو لودھی بادشاہت کے زوال اور خاتمے اور مغلوں کی فتح کا باعث بنا۔ کچھ عرصہ بعد جب شیر شاہ نے بابر کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو شکست دے کر اپنی بادشاہت قائم کی تو اس نے مطلق العنان بادشاہت اور بااختیار سرداروں کے بیچ کا راستہ اختیار کیا یعنی دونوں کا ایک امتزاج بنایا۔ اس کے بیٹے اسلام شاہ نے ایک سخت گیر بادشاہ کے طور پر قبائلی سرداروں کو کچل ڈالا۔ قبائلی سردار وقتی طور پر دبک گئے لیکن وہ بادشاہ سے نمٹنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہے اور اسلام شاہ کی وفات کے بعد جب کم عمر عادل شاہ حکمران بن بیٹھا تو یہ ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر پہنچیں

اور شمالی ہندوستان میں افغان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ بہر حال یہ بات کہنا ضروری ہے کہ ہندوستان کی ان سلطنتوں کے دوران بھی پشتونخوا زیادہ وقت اندرونی طور پر خود مختار رہا اور اس پر مختلف سلطنتوں کی گرفت بڑی حد تک علامتی ہی رہی۔ اس دوران اس علاقے میں ہندوستان کی مغل سلطنت اور ایران کی صفوی سلطنت کے درمیان کشمکش جاری رہی اور پشتونخوا ان دو سلطنتوں کے درمیان تقسیم رہا۔

بہر حال پشتونوں نے ان کے غلبے کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور مختلف شکلوں میں ان کی بے شمار مزاحمتی تحریکیں جاری رہیں۔ ان میں دو اہم تحریکیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بایزید انصاری المعروف پیر روشان (1524-80ء) کی صوفیانہ تحریک ہے جو پشتون قبائل میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور جسے دبانے کے لیے مغل بادشاہوں نے فتوے بازی اور فوجی سرکوبی جیسے حربے استعمال کیے۔ یہ تحریک تین نسلوں تک جاری رہی۔ جنوبی وزیرستان میں کانی گرم کے رہنے والے بایزید انصاری کا تعلق وہاں کے اورمڑ قبیلے سے تھا۔ تجارت کے سلسلے میں ان کے خاندان کا ہندوستان آنا جانا رہتا تھا۔ جالندھر کے تجارتی اور مذہبی حلقوں کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ بایزید انصاری نے تصوف کے ایک خاص مکتب کی بنیاد ڈالی۔ انہیں ان کے پیروکاروں نے پیر روشان کا خطاب دیا جبکہ مغل حکومت کے حامی علماء نے انہیں پیر تاریک قرار دیا۔ پشتونوں کی معلوم تاریخ میں یہ پہلی بہت بڑے پیمانے پر چلنے والی عوامی تحریک تھی جسے مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے عوام کی وسیع حمایت و پذیرائی حاصل ہوئی۔

بایزید انصاری (پیر روشنائی) نے اپنا پیغام زیادہ تر اشعار میں لکھا اس کی کتاب خیر البیان بیسویں صدی میں ایک جرمن میوزیم میں دریافت ہوئی جو بعد ازاں پشاور میں بھی چھپ گئی۔ پیر روشان نے خود ایک ڈائری کی شکل میں حالنامہ کے نام سے ایک کتاب شروع کی جو بعد میں ان کے ایک مرید علی محمد مخلص نے مکمل کی۔ پیر روشان کی وفات کے بعد ان کی تحریک ان کے بیٹے جلال نے چلائی۔ مغلوں نے روشان کی تحریک کو دبانے کے لیے فوجی طاقت کے استعمال کے علاوہ اخوند درویزہ بابا جیسے علماء کی حوصلہ افزائی کی جنہوں نے پیر روشان کے خلاف کتابیں لکھیں اور اسے پیر تاریک قرار دیا۔ جلال کے گزر جانے کے بعد اس کا صاحبزادہ عبدالقادر اور اس کی ماں الیٹی نے تحریک کی راہنمائی کی۔ آخرکار دونوں راہنماؤں کو صلح کے نام پر مغل دربار میں بلایا گیا جہاں ان کی موت پراسرار حالات میں ہوئی۔ روشنائی تحریک جنوب سے اٹھی اور شمال کی طرف پھیل گئی اور وزیرستان سے لے کر یوسف زئیوں تک میں پھیل گئی تھی۔ بعد میں اس کے پیروکاروں نے شاعری کا پورا دبستان تشکیل دیا۔ پشتونوں نے پیر روشان کو دوبارہ بیسویں صدی میں دریافت کیا۔ بیسویں صدی میں اس پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔

دوسری تحریک خوشحال خان خٹک (1613-39ء) کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خوشحال خان خٹک کا تعلق سرداروں کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو روایتی طور پر مغلوں کا وفادار تھا اور جس نے مغلوں کے روایتی مخالفوں یعنی یوسفزئیوں کے خلاف ہمیشہ مغلوں کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن مغلوں کے ساتھ ان بن ہونے کے بعد خوشحال خان خٹک کو اپنے گاؤں اکوڑہ خٹک سے گرفتار کر کے چار

سال تک ہندوستان کے قلعہ رنتھنبور میں اسیر رکھا گیا۔ اس طرح وہ پشتونوں کی قومی آزادی کی جنگ کے پہلے سیاسی قیدی ثابت ہوئے۔ رہائی کے بعد انہوں نے مغلوں کے خلاف پشتون قبائل کو اکٹھا کر کے کئی جنگیں لڑیں۔

لیکن خوشحال خان خٹک کا بڑا کمال ان کی شاعری ہے جسے پشتو ادب میں کلاسیکی شاعری کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے ویسے تو زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو شاعری کا موضوع بنایا لیکن انہوں نے اپنے شعروں میں پشتونوں کے ایک قوم ہونے اور آزاد ملک قائم کرنے کا پیغام اس طرح مؤثر اور جامع انداز میں پیش کیا جو آج تک پشتونوں کے لیے الہام کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنے مشہور قصیدے میں لکھا:

درست پشتون لہ قندھارہ تر اٹکہ　　　سرہ یو دننگ پہ کار پٹ او اشکار

پہ یوہ ژبہ ویئل سرہ پستو کبرو　　　ولے ہیچ نہ شولہ یو بل خبر دار

ترجمہ:

تمام پشتون جو قندھار سے اٹک تک پھیلے ہوئے ہیں، ننگ کے کاموں میں خفیہ اور کھلے طور پر ایک ہیں۔ اگرچہ ہم سب ایک زبان پشتو کے بولنے والے ہیں لیکن افسوس، ہم ایک دوسرے کی خبر گیری نہیں کرتے۔

اسی قصیدے میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

پښتانہ کہ بل شہ فکر کیرہ نا پوھ دی　　　بی لہ تورے خلاصے نشتہ پہ بل کار

بلہ ہیچ لیدے نہ شی پہ دا مسیئح کبس　　　یا مغل لہ میئحہ ورک یا پښتون خوار

ترجمہ:

پشتون اگر کوئی اور طریقہ سوچ رہے ہوں تو وہ نا سمجھ ہیں۔ بغیر لڑے کوئی اور چارہ نہیں ہے اور ہمارے لیے بیچ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یا مغلوں کو نکالا جائیگا، بصورت دیگر پشتون ذلت میں رہیں گے۔

اس نے خود کو بھی افغان قرار دیا ہے وہ لکھتا ہے۔

دافغان پہ ننگ مے او کبرلہ تورہ　　　　ننگیالے دزمانے خوشحال خٹک یم

ترجمہ:

میں نے افغان کے نام پر کمر میں تلوار باندھ لی ہے میں ہی اس زمانے کا باغیرت خوشحال خٹک ہوں۔

برطانوی دور

اٹھارویں صدی کے آغاز میں پشتونوں نے اپنی آزاد سلطنت قائم کرنے کی سنجیدہ کوششیں شروع کیں۔ 1709ء میں میرویس خان ہوتک کی سربراہی میں پشتونوں نے قندھار میں ایران کی صفوی سلطنت کے خلاف آزادی کا علم بلند کرتے ہوئے ایرانی گورنر گورگین خان کو گرفتار کیا اور خلجیوں کی ہوتک شاخ کی بادشاہی کی بنیاد رکھی جس نے ایران کے اندر اصفہان تک کے علاقے کو فتح کیا۔ یہ بادشاہی 1738ء تک قائم رہی۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک صفوی اور مغل سلطنتیں زوال کی گہرائیوں میں دھنس چکی تھیں اور ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ 1747ء میں ایرانی بادشاہ نادر شاہ افشار کی موت کے بعد پیدا ہونے والی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افغانوں نے قندھار میں ایک روایتی جرگہ منعقد کر کے افغانستان کے نام سے ایک آزاد مملکت کی بنیاد رکھی اور ابدالیوں کے سدوزئی قبیلے کے احمد خان کو بادشاہ منتخب کیا جس نے احمد شاہ کے نام سے بادشاہی کا آغاز کیا۔

کئی مورخین نے اسے پشتون قبائل کی دولتِ مشترکہ یا کنفیڈریشن کا نام دیا ہے۔ افغانستان کی درانی سلطنت کی سرحدیں ترکستان اور ہندوستان تک پھیل گئی تھیں لیکن اس کا محور افغان اور ان کا وطن ہی رہا۔ البتہ درانی اشرافیہ کی ایک لمبے عرصے تک ایرانی دربار سے سیاسی وابستگی کے سبب فارسی زبان حکمران حلقوں میں

غالب رہی اور عملاً جدید افغانستان کی سرکاری زبان بن گئی۔ اگرچہ پشتو کو قومی زبان بنانے کی کوششیں بھی جاری رہیں لیکن کاروبارِ مملکت کے لیے فارسی ہی استعمال ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں درانی سلطنت کا زوال شروع ہوا اور ہندوستان میں انگریزوں کی شمال مغرب کی جانب پیش قدمی کے باعث وہ سکڑتی گئی۔ شمال کی جانب سے روسی زاروں کی توسیع پسندی کے بعد افغان دو بڑی طاقتوں کے درمیان پھنس گئے۔ اندرونی طور پر روایتی معیشت اور مضبوط قبائلی روایات کے باعث ایک بڑی اور منظم فوج یا وسیع ریاستی مشینری رکھنا ناممکن ہو چلا تھا۔ بڑھتے ہوئے قبائلی جھگڑوں اور درانی سرداروں کی باہمی چپقلش نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں سکھوں نے بغاوت کر کے پنجاب کو آزاد کروالیا اور 1818ء کے بعد اباسین کو پار کر کے پشتونخوا پر دھاوا بول دیا۔ پشتونوں کی شدید مزاحمت کے باوجود رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھوں نے موجودہ صوبہ سرحد پر قبضہ کرلیا جو تقریباً دو عشروں تک قائم رہا۔ اسی دوران انگریز کی نوآبادیاتی سلطنت کی سرحدیں پھیلتی گئیں جس نے وسطی ایشیاء میں روسی پیش قدمی کو روکنے کے نام پر 1838ء میں افغانستان پر حملہ کر کے کابل پر قبضہ کرلیا اور ہندوستان میں پناہ گزین افغانستان کے سابق بادشاہ شاہ شجاع کو اپنے ساتھ کابل لے جا کر تخت پر بٹھایا۔ اگرچہ 1841ء کے آخر اور 1842ء کے شروع میں افغانوں کی شدید مزاحمت کے سبب انگریزوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ انگریزوں کے گیارہ ہزار

لشکر میں سے کابل سے انخلاء کے بعد صرف ایک آدمی جس کا نام ڈاکٹر برائیڈن تھا زندہ بچا اور خستہ حالت میں جلال آباد پہنچ سکا۔ باقی لوگ امیر دوست محمد خان کے صاحبزادے وزیر اکبر خان کی قیادت میں لڑنے والوں کے ہاتھوں یا تو مارے گئے یا اسیر بنائے گئے۔ لیکن انہوں نے موجودہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں، جنوبی پشتونخوا اور بلوچستان پر قبضہ جمالیا اور ان علاقوں کو زبردستی برطانوی ہندوستان میں شامل کرلیا۔ اس طرح بڑی استعماری طاقتوں کے جھگڑے کے نتیجے میں افغانستان تقسیم ہوگیا اور اس کا جنوب مشرقی حصہ اس سے چھین لیا گیا۔

انگریزوں نے 1878ء میں ایک مرتبہ پھر افغانستان پر حملہ کیا۔ امیر شیر علی خان حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے شمال میں ترکستان چلا گیا۔ انگریزوں نے اس کے نافرمان بیٹے یعقوب خان کو جیل سے رہا کر کے اسے امیر بنا دیا۔ 2 مئی 1879ء کو گندمک کے مقام پر ایک 'معاہدے' کے ذریعے نہ صرف افغانستان کی خارجہ پالیسی کو انگریزی استعمار کے تابع بنایا گیا بلکہ کئی ایک افغان علاقوں (کرم، پشین اور سبی) کو انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔

افغانوں نے ایک بار پھر استعماری قبضے کے خلاف جنگ لڑی۔ 1870ء میں انگریزوں کو افغانستان سے نکلنا پڑا لیکن صوبہ سرحد، قبائلی پشتونخوا اور برٹش بلوچستان میں شامل جنوبی پشتونخوا پر انہوں نے اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ 12 نومبر 1893ء کو سر ہنری مورٹیمر ڈیورنڈ (برطانوی ہندوستان کے سیکرٹری خارجہ) اور امیر عبدالرحمٰن کے درمیان ایک 'معاہدہ' طے پایا جس کی رو سے انگریزوں نے

اپنے افغان مقبوضات کو ہندوستان میں شامل کروالیا البتہ قبائلی علاقہ (جواب فاٹا کہلاتا ہے) باقاعدہ طور پر ہندوستان کا حصہ نہیں بنا بلکہ وہ صرف برطانوی ہندوستان کے زیرِ اثر رہا۔

1849ء میں انگریزوں نے پنجاب اور پھر پشاور پر باقاعدہ قبضہ کر کے سکھوں کی جگہ لے لی تھی۔ پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان اور ہزارہ کے اضلاع بنائے گئے جو صوبہِ پنجاب کا حصہ بنے۔ جہاں تک قبائلی علاقوں یا شمال میں دور دراز کے یوسف زئی پہاڑی علاقے کا تعلق ہے تو ان پر انگریز کا باقاعدہ قبضہ نہیں ہو سکا، البتہ کچھ قبائلی ایجنسیاں بنا کر پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعے بالواسطہ حاکمیت قائم کی گئی۔ 1901ء میں ہندوستان کے برطانوی وائسرائے لارڈ کرزن کے حکم پر صوبہِ سرحد کو پنجاب سے علیحدہ کر کے کمشنر صوبہ بنایا گیا اور 1932ء میں اسے مکمل صوبے کی حیثیت دی گئی۔ قبائلی علاقوں کو یاغستان (No Man's Land) رکھا گیا اور برٹش بلوچستان کے پشتون علیحدہ رہے۔

1947ء میں قیامِ پاکستان کے بعد پشتون تین مختلف انتظامی اکائیوں کی شکل میں اسی استعماری تقسیم کے ساتھ شامل ہوئے جس کا شکار وہ نوآبادیاتی دور میں ہوئے تھے۔ ان کی صورتِ حال کے اس پہلو میں اب تک تبدیلی نہیں آئی، سوائے اس کے کہ 1969ء میں سوات، چترال اور دیر کی ریاستوں کو صوبہِ سرحد میں مدغم کر دیا گیا اور ان کو مالاکنڈ ایجنسی سے ملا کر مالاکنڈ ڈویژن بنایا گیا جسے صوبائی قبائلی علاقہ (PATA) کا نام دیا گیا۔

پشتون معاشرے میں قبائلی سماجی ڈھانچوں کی تاریخی طوالت کی وجہ سے قبائلی طرزِ زندگی کے نظریے کو پشتونوں میں خاص اہمیت حاصل رہی جسے پشتونولی یا پشتو بھی کہتے ہیں۔ ریاستوں کے مراکز سے دور، اندرونی طور پر خودمختار اور دشوار گزار علاقوں میں بسنے والے پشتون قبائل کے لیے پشتونولی نے رواجی قانون اور ابتدائی سماجی ادارے فراہم کیے۔ ان میں سب سے اہم ادارہ قبائلی اسمبلی یا جرگہ ہے جو ابتداء میں قبائلی اسمبلی کی حیثیت رکھتا تھا اور قبیلے کے سارے لوگ اس کے رکن ہوتے تھے۔ یہ بہت ابتدائی مقامی جمہوریت کا بنیادی ادارہ ہونے کے علاوہ عدالت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس پر بتدریج قبائلی اشرافیہ کا غلبہ ہوا اور اسے خواتین اور معاشی طور پر کمزور طبقات پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ متذکرہ طبقات کو جرگے سے نکال کر عملاً فیصلہ سازی کے عمل سے باہر کر دیا گیا اور رفتہ رفتہ جرگہ عملاً ملکوں اور خانوں کے قبضے میں آ گیا جو قبیلے کے نام پر اوپری طبقے یا ریاستی آقاؤں کے مفاد میں فیصلے کرنے کا آلہ بن گیا۔ فاٹا میں اسے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کا حصہ بنا کر نوآبادیاتی حکمرانی کی بالادستی کا آلہ کار بنایا گیا۔ بدقسمتی سے فاٹا کے عوام آج تک اس سیاہ قانون کی چکّی میں پس رہے ہیں۔

جدید نوآبادیاتی ریاست کے قیام کے بعد بھی جرگہ غیر سرکاری طور پر پشتون معاشرے میں فیصلے کرنے اور تنازعوں کے تصفیے کے متبادل نظام کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ رواجی قانون کے عام اصول اور اقدار جیسے ننگ، سیالی (رقابت)، تیگہ (جنگ بندی)، بدل (انتقام)، بدرگہ (سفر کے دوران تحفظ)،

میلمستیا (مہمان نوازی) اور ننہ واتے (معافی مانگنا) تقریباً سارے پشتونوں میں مشترک ہیں۔ اگرچہ ان اصولوں کے نفاذ کا قانون (جسے پشتو میں نرخ لار یا رواج کہتے ہیں) مختلف قبیلوں میں مختلف رہا ہے، اس کی بنیاد گاؤں یا علاقہ نہیں بلکہ قبیلوی وابستگی ہے۔ پشتو ضرب المثل کے مطابق ایک آدمی گاؤں کو چھوڑ سکتا ہے لیکن 'نرخ' کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ رواجی قانون زیادہ تر غیر تحریری شکل میں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔

پشتونولی کی معاشی بنیاد جائیداد کی مشترکہ قبیلوی ملکیت ہوتی تھی اور زمینوں پر مستقل قبضے کے خطرے کو رفع کرنے کے لیے 'ویش' یعنی تقسیم کا نظام رائج تھا، جس کے مطابق ایک معینہ مدت کے بعد مختلف قبیلے آپس میں زمین تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح کی تقسیم سے ایک تو معاشی انصاف کے تقاضے پورے ہوتے تھے کیونکہ زیادہ زرخیز زمینوں سے مختلف قبیلے باری باری استفادہ کرسکتے تھے دوسری بات یہ تھی کہ زمین کی مشترکہ ملکیت کا تصور پشتونوں کے قبائلی اتحاد یا کنفیڈریشن کی ایک لازمی شرط تھی۔ اپنے مشترکہ وطن یا زمین کی حفاظت یا دفاع کے لیے وہ متحدہ طور پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے، زمین کی تقسیم کا یہ نظام یوسف زئی پشتونوں میں مغل دور تک رہا اور اس سلسلے میں مشہور قومی مصلح شیخ ملی کا "دفتر" یا ریکارڈ کلاسیکی حیثیت کا حامل ہے۔ مغلوں نے اس کی جگہ جاگیرداری نظام کو فروغ دیا۔ پشتونولی میں قبائلی مساوات، باہر سے آنے والوں سے خوف اور حسب نسب کی اہمیت جیسی خصوصیات دوسرے قبیلوی نظاموں جیسی ہی تھیں لیکن اس

کی کچھ اپنی مخصوص خصوصیات بھی تھیں جو پشتونوں کے خاص تاریخی اور سماجی حالات کی پیداوار تھیں۔

صدیوں کے ارتقاء کے دوران پشتونولی اور اسلام کا ایک خاص قسم کا امتزاج وجود میں آیا لیکن بنیادی طور پر پشتونولی ایک سیکولر نظام رہا ہے اور جہاں شریعت اور رواج کے درمیان ٹکر ہوتی ہے وہاں رواج کو فوقیت دی جاتی ہے۔ روایتی، معاشی اور سماجی ڈھانچوں کی تبدیلی اور جدید ریاست کے غلبے کے بعد پشتونولی کی پرانی حیثیت باقی نہیں رہی لیکن یہ اب بھی عام پشتونوں کے لیے ایک بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی پشتون اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اگرچہ بعض فرسودہ رواجوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت کا احساس بڑھا ہے اور جدیدیت نے بہت ساری چیزوں کو تبدیلی کے چیلنج سے دوچار کیا ہے لیکن پھر بھی پشتونولی کا پشتونوں کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں اپنا ایک مقام ہے۔

پشتونوں کے قبائلی نظام (پشتونولی) اور اس کے بنیادی ادارے جرگے کے بارے میں بحث کے دوران جو بہت اہم نکتہ نظرانداز کر دیا جاتا ہے وہ اس نظام کی ماقبل ریاستی حیثیت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً یہ ہے کہ پشتونخوا میں جدید ریاست نوآبادیاتی اور استعماری شکل میں سامنے آئی جسے پشتون عوام نے اپنی ریاست نہیں سمجھا۔ لیکن بہرحال ڈیڑھ سو سال کی ریاستی زندگی نے اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ خصوصاً بیسویں صدی کے دوران ہونے والے سیاسی، سماجی اور انتظامی ارتقاء نے کم از کم پشتونخوا کے رعیتی علاقوں (جن کو بندوبست اراضی کی تکمیل

کے بعد بندوبستی علاقے بھی کہا جاتا ہے) میں جدید ریاست کے تینوں ستونوں یعنی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں حصہ لینے اور ان اداروں کو چلانے کا تجربہ ہوا ہے۔ بلکہ اب تو ان کے ہاں ریاست کا چوتھا ستون یعنی میڈیا بھی ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔ بعض مفاد پرست اور قدامت پسند عناصر قصداً جرگے کے قدیم کردار کو نئے ریاستی اور سماجی اداروں کے رول کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے مفاد میں جدیدیت کی تمام اشکال کو قبول کرتے ہیں لیکن اپنے مفاد سے ٹکر کھانے والی ہر تبدیلی کا راستہ مذہب اور رواج کے نام پر روکتے ہیں۔

جدید پشتون قومیت کا ارتقاء

کئی ایک داخلی اور خارجی عوامل نے جدید پشتون قومیت اور اس کی جدید شکل کی ریاست کے ارتقاء اور ابھار کے عمل کو مشکل اور پیچیدہ بنایا۔ مشکل جغرافیائی حالات نے پشتونوں کے لیے دو طرح کی مشکلات کو جنم دیا۔ اندرونی طور پر عظیم پہاڑی سلسلوں نے ان کو ایک دوسرے سے دور رکھا اگر چہ پشتو زبان کی ایک مشہور ضرب المثل کے مطابق: ''اونچے سے اونچے پہاڑ کے اوپر سے بھی راستہ گزرتا ہے۔'' لیکن ظاہر ہے کہ ایسی راہ روزمرہ کی آمدورفت کے لیے تو استعمال نہیں ہو سکتی۔ دوسری مشکل پشتون وطن کے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے اس طرح پیدا ہوئی کہ فاتحین کی گزرگاہ ہونے کے ناطے اسے مسلسل ایک جنگ و جدل کے سلسلے کا سامنا کرنا پڑا اور ظاہر ہے کہ جنگوں کی لائی ہوئی تباہی اور بربادی تعمیر اور ترقی کے عمل کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔

اس کے علاوہ قبیلوی گروہ بندی اور تقسیم بندی کے ایک طویل عمل نے ان کا واحد قومی تشخص ابھرنے کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کیے رکھی اور مختلف استعماری قوتوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے اس قبیلوی نفاق اور تفریق کو موثر طور پر استعمال کیا۔ علامہ محمد اقبالؒ نے "بالِ جبریل" میں "خوشحال خان خٹک کی وصیت" کے عنوان سے پانچ اشعار میں بہت موثر پیرائے

میں اس صورتِ حال کے ازالے کے لیے آواز اٹھائی:

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم | کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے | ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں | کہستان کا یہ بچہ ارجمند
کہوں ہم نشیں تجھ سے میں دل کی بات | وہ مدفن ہے خوشحال خان کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ | مغل شہسواروں کی گردِ سمند

اس کے علاوہ ایک بہت ابتدائی قسم کی قدرتی معیشت، جو بمشکل معاشرے میں رہنے والے افراد کی کفالت کر پاتی تھی، اس قابل نہیں تھی کہ ایک جدید ریاستی مشینری کے لیے درکار وسائل مہیا کر سکے۔ اس کے اوپر سخت گیر قبیلوی روایات تھیں، جن کی رو سے ٹیکس دینے کو عار تصور کیا جاتا تھا۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ٹیکسوں کے ایک جامع نظام کے بغیر جدید ریاست یا کسی بھی قسم کی ریاست کی بقا ممکن نہیں ہے۔ استعماری سازشوں اور جارحیت کے علاوہ جو بات درانی ریاست کے زوال کا باعث بنی وہ اس کی نو آبادیات کا ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ اس کے بعد وسائل سے محروم درانی سلطنت اندرونی طوائف الملکو کی کا شکار ہوگئی اور بیرونی حملہ آوروں کی جارحیت کا ہدف بنی۔

پشتونوں کے قومی اتحاد کے ارتقائی عمل کو سب سے شدید دھچکا انیسویں صدی میں انگریز استعمار کی برِصغیر ہند میں شمال مغرب کی جانب پیش قدمی سے لگا۔ انگریزی استعمار کے دعوے کے مطابق یہ پیش قدمی اس نے روسی زاروں کی جنوب میں گرم پانیوں

کی سمت توسیع پسندی کو روکنے کے لیے کی۔ اگرچہ 1838ء اور 1878ء کی جنگوں کے بعد افغانوں کی زبردست مزاحمت اور یورپی طاقتوں کے دباؤ کی وجہ سے انگریزوں کو اپنی پیش قدمی کی پالیسی ترک کردینی پڑی لیکن انہوں نے وسطی ایشیاء کے کنارے پر اپنی گرفت رکھنے کے لیے نام نہاد ڈیورنڈ لائن کے ذریعے پشتونوں کے وطن کو تقسیم کر کے کچھ علاقے پر قبضہ جمالیا۔ یہ تقسیم آج بھی اتنی ہی غیر فطری اور غیر معقول ہے جتنی یہ ایک صدی پہلے مسلط کیے جانے کے وقت تھی۔

بہرحال اس تقسیم کے اپنے تاریخی، سماجی اور سیاسی عواقب رہے ہیں۔ جہاں افغانستان کو دو بڑی طاقتوں کے بیچ میں "بفرزون" کے طور پر ایک پسماندہ اور "خشک" ملک رکھا گیا جس کے اندر سے سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا کرنٹ نہیں گزر سکتا تھا وہاں پشتونخوا میں انگریزوں نے اپنی نوآبادیاتی ضروریات کے تحت سٹریٹیجک مقامات تک سڑکیں، ریل، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کا نظام بنایا۔ اس لحاظ سے تو مشرقی پشتونخوا کچھ آگے بڑھا لیکن قومی ریاست کے قالب سے نکل کر وہ سیاسی غلامی اور شناخت کے بحران کا شکار ہوا۔ جس کے اثرات سے وہ اب تک مکمل طور پر نہیں نکل سکا ہے اور بین الاقوامی سازشوں کا شکار رہا ہے۔

استعماری تقسیم کے علاوہ ایک اور اہم عامل جو پشتونخوا کی سماجی، معاشی اور ثقافتی انحطاط کا باعث بنا وہ سمندری راستوں سے بڑھتی ہوئی تجارتی سرگرمیوں کے باعث زمینی راستوں سے علاقائی اور بین الاقوامی تجارت کا تقریباً ختم ہوجانا تھا۔ یہ تجارتی راستے معاشی لحاظ سے علاقے کے وجود میں گردش کرنے والے خون کی

رگوں کے مانند تھے۔ ان کے ختم ہو جانے سے تجارتی سرگرمیوں کا جیسے گلہ گھونٹ کر رکھ دیا گیا ہو اور معاشی وجود سے جیسے جان نکل گئی ہو۔ روس میں اکتوبر 1917ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد جب سوویت یونین کے گرد سٹالین نے آہنی حصار قائم کر لیا تو پشتون نہ صرف وسطی ایشیائی معیشت سے بلکہ اپنے تہذیبی محور سے بھی کٹ کر رہ گئے۔ اس تاریخی تبدیلی نے انہیں برِصغیر ہند کی جانب دھکیلا جہاں وہ شناخت کے بحران کا شکار ہوئے۔ ان ساری باتوں کے علاوہ خود پشتونخوا کے اندر ناہموار سماجی اور معاشی ترقی کے عمل نے بھی علاقے کے لوگوں کی قومی تشکیل کے عمل کو منفی طور پر متاثر کیا۔

بہرحال انگریزی نوآبادیاتی سلطنت کی اپنی سیاسی اور انتظامی ضرورتیں تھیں۔ پنجاب کے حصے کے طور پر سرحد کے رعیتی اضلاع اور قبائلی ایجنسیوں کا نظم و نسق چلانا انیسویں صدی کے آخر تک ناممکن ہو گیا تھا۔ 1895ء ہی سے ریاستوں، قبائلی علاقوں اور مالاکنڈ کے پار علاقوں کے معاملات کو چلانے کے لیے حکومتِ ہند کے تحت ایک افسر کا تقرر ہو چکا تھا۔ اگلے دو تین برسوں کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ پرانے انتظامی ڈھانچے کے اندر معاملات نہیں چل سکتے۔ اسی لیے بیسویں صدی کے پہلے سال میں پانچ اضلاع (پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان اور ہزارہ) پر مشتمل نیا شمال مغربی سرحدی صوبہ بنانے کا فیصلہ ہوا جس سے جڑی ہوئی پانچ قبائلی ایجنسیوں کو چلانے کا کام حکومتِ ہند کے ہاتھ ہی میں رہا۔ اب بھی ان قبائلی ایجنسیوں، جن کی تعداد اب سات ہو چکی ہے، کا انتظام

وفاقِ پاکستان کے ہاتھ میں ہے۔

9 نومبر 1901ء کو جب شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نام سے پنجاب سے الگ صوبہ بنایا گیا تو سماجی اور معاشی لحاظ سے یہ چوں چوں کا مربہ تھا۔ شہروں اور قصبوں میں تجارتی رشتے مضبوط ہو رہے تھے۔ وادیِ پشاور میں دیہات کے اندر ساکت اور مقامی طور پر خودکفیل معیشت کی جگہ ایک نسبتاً ترقی یافتہ زرعی معیشت لے رہی تھی جس کی بنیاد انگریز کے دور میں ہونے والی ترقی اور دریائے سوات پر بنائے گئے نہری نظام پر تھی۔ انگریزوں نے خانوں، نوابوں اور خان بہادروں کی شکل میں اُن کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے والے طبقے کی سرپرستی کی۔ ان خانوں اور نوابوں نے بہت سارے علاقوں میں داخلی طور پر خودمختار ریاستیں اور غلبے کے خطے قائم کیے جو انگریز سرکار کے وفادار تھے۔ یہ تقسیم بندیاں قومی اتحاد کے ارتقاء اور ترقی کے راستے میں رکاوٹ کا باعث بننے کے علاوہ یہاں کے محنت کش عوام کے دوہرے استحصال کا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔ آج کا مالاکنڈ ڈویژن، ہزارہ کے بعض حصے اور خود وادیِ پشاور کے کچھ علاقے اس کا عملی نمونہ ہے۔ جنوبی اضلاع سماجی اور معاشی طور پر پسماندہ رہے۔ گلہ بانی، بارانی زراعت اور مقامی تجارت پر گزراوقات کرتے ہوئے اس علاقے کے لوگ بتدریج انگریزی افواج میں بھرتی ہونا شروع ہوئے۔ یہ ایک ایسی روایت ہے جو اب تک چلی آ رہی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے کاروباری منڈیوں میں پھیلاؤ آیا۔ اجناس کے تبادلے کی جگہ پیسہ کاروبار کا ذریعہ بنا جس سے نئے قسم کے معاشی رشتے

بننے شروع ہوئے۔ پھر باہر سے آنے والی جدید عالمی معیشت کی لہروں نے یہاں اپنا اثر مرتب کرنا شروع کیا۔ یہ ایک طرح سے جدید پشتون قومیت کے پیدا ہونے کی اقتصادی بنیاد تھی۔ اس عمل نے کئی ایک علاقائی اور بین الاقوامی سیاسی اور سماجی عوامل کے زیرِ سایہ جنم لیا۔ انگریز فوج میں بھرتی ہونے والے پشتون سپاہی اور جونیئر کمیشنڈ افسران پہلی جنگِ عظیم کے دوران مختلف محاذوں پر لڑے اور ایشیاء کے علاوہ یورپ اور افریقہ میں عالمی حالات اور تبدیلیوں سے آشناء ہوئے۔

اکتوبر 1917ء کے روسی سوشلسٹ انقلاب نے قومی آزادی کے حق میں اور طبقاتی استحصال کے خلاف ہونے والی جدوجہد کو تیز کیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی عثمانی سلطنت کی شکست اور خلافت کے خاتمے نے برِصغیر ہند کے مسلمانوں میں ایک جذباتی ردِعمل کو جنم دیا۔ انہوں نے خلافت کے احیاء کے لیے تحریک چلائی اور کئی حریت پسندوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے یہاں سے افغانستان کی جانب ہجرت کا فیصلہ کیا۔ اس طرح برِصغیر کے انقلابی اور آزادی پسند پشتونخوا میں امڈ آئے اور انہوں نے یہاں کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کے علاوہ 1920ء کے بعد افغانستان کے جدت پسند بادشاہ امان اللہ خان کی جانب سے اپنے ملک میں لائے جانے والی سماجی اور ثقافتی اصلاحات کی گونج ڈیورنڈ لائن کے مشرق میں بھی سنی گئی اور اس نے یہاں آزادی کی امنگ کو مزید گہرا کر دیا۔

پشتونخوا کے مخصوص سماجی، اقتصادی اور ثقافتی حالات میں تحریکِ آزادی کے

ابتدائی مرحلے پر مذہبی رنگ نمایاں تھا۔ حاجی صاحب ترنگزئی، ہڈہ کے مولانا صاحب اور مفتی عبدالرحیم پوپلزئی جیسے حریت پسند علماء نے ہندوستان میں قائم مشہور دینی مکتب دیوبند کے ساتھ رابطے استوار کیے اور نوآبادیاتی غلامی کے خلاف آزادی کی تحریک کا علم بلند کیا۔ شروع میں تحریک پر مذہبی رنگ غالب رہا لیکن بعد میں یہ تحریک بتدریج روشن خیال زمینداروں اور دیہاتی محنت کشوں تک پھیل گئی۔ خان عبدالغفار خان، عبدالاکبر خان، عبدالخالق خلیق اور بعض دیگر قوم پرست دانشوروں نے یکم اپریل 1921ء میں انجمنِ اصلاح افاغنہ کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم نے دیگر اصلاحی کاموں کے علاوہ پشتون عوام میں تعلیم پھیلانے کے کام کا بیڑہ اٹھایا اور مختلف علاقوں میں آزاد سکول کے نام سے تعلیمی ادارے قائم کیے جن میں دینی اور دنیاوی تعلیم کے حصول کے مواقع میسر آئے۔

وادیِ پشاور میں یہ تحریک بتدریج ریڈیکل شکل اختیار کرتی گئی اور یکم ستمبر 1929 کو نوجوان ترکوں سے متاثر ہو کر نوجوانوں کی تنظیم "د زلمو جرگہ" کے نام سے تنظیم بنائی گئی۔ عبدالاکبر خان اس کے صدر اور احمد شاہ جنرل سیکرٹری بنے۔ آزادی کا مطالبہ کرنے والی اس ریڈیکل سیاسی جماعت پر روس کے اشتراکی انقلاب کے زیرِ اثر اور بالشویک ہونے کے الزامات بھی لگائے گئے۔ قوم پرست تحریک کے قائدین نے نومبر 1929ء میں خدائی خدمتگار کے نام سے وسیع عوامی پلیٹ فارم کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک نے بڑی تیزی سے پشتونخوا کے دیہات میں عوامی حمایت حاصل کی۔ اس کی قیادت بنیادی طور پر درمیانے زمینداروں کے

ہاتھ میں تھی اور اسے کسانوں اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں کی جانب سے وسیع پیمانے پر پذیرائی ملی۔

تحریک کے اندر اصلاح پسند، ریڈیکل اور قدامت پرست عناصر کے درمیان کشمکش بھی دیکھنے کو ملی۔ کسان طبقے نے قومی آزادی کے ساتھ ساتھ طبقاتی استحصال کے خاتمے کے لیے بھی آواز اٹھائی جس سے تحریک کے اندر تضاد پیدا ہوا، جس کا ڈرامائی اظہار 8 جولائی 1938ء میں نوشہرہ کے قریب غلہ ڈھیر نامی گاؤں میں کسانوں اور زمینداروں کے درمیان تنازعے کے دوران ہوا جب تحریک میں شاملِ خوانین نے خدائی خدمتگار کسانوں کے خلاف خوانین کا ساتھ دیا۔ نواب طورو کی جانب سے کسانوں کی بیدخلی کے خلاف ہونے والے جلسہ عام میں غریب اور درمیانہ طبقہ کے خدائی خدمتگاروں نے کسانوں کی بے دخلی کے خلاف ہونے والی جدوجہد کی حمائت میں تقریریں کیں اور خوانین نے نواب طورو کی جماعت کی حمایت کی۔ پشتونخوا میں بعد میں چلنے والی کسان تحریکیں غلے ڈھیر تحریک کو اپنا سرچشمہ قرار دیتی رہی ہیں۔

ویسے تو انگریزی استعمار نے سارے برِصغیر میں آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے جابرانہ طاقت کا استعمال کیا لیکن پشتونخوا میں انہوں نے غیر معمولی پیمانے پر ظلم و جبر کا بازار گرم کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ رعیت شدہ اضلاع کے ساتھ قبائلی علاقہ (یاغستان) متصل تھا جہاں کے لوگ قومی آزادی کی جدوجہد کی ایک ہی شکل، یعنی مسلح جدوجہد، سے واقف تھے۔ حاجی صاحب ترنگزئی، عمرا خان جندول اور فقیرا یپی نے جس جنگِ آزادی کا آغاز کیا وہ مسلسل جاری رہی اور انگریزی استعمار

کبھی بھی اس کو مکمل طور پر کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

1920ء اور 1930ء کے سالوں میں مولنداد بخش جنبر ا بخش اور وزیرستان میں حریت پسند قبائلیوں اور انگریز فوجوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں اور بعض جگہوں پر تو کافی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ میدانی علاقوں میں انجمن اصلاح افاغنہ، زلموجرگہ، خدائی خدمتگار، فرنٹیئر کانگریس اور نوجوان بھارت سبھا نے جلسے جلوس ایجی ٹیشن کیے۔ اپریل، مئی 1930ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے دوران انگریز حکومت نے وسیع پیمانے پر طاقت کا استعمال کیا اور قصہ خوانی بازار پشاور، ٹکر ضلع مردان اور ہاتھی خیل ضلع بنوں میں پرامن جلسوں پر گولیاں چلا کر سینکڑوں آزادی پسندوں کو شہید کر دیا۔ ہاتھی خیل بنوں میں ایک خدائی خدمتگار قاضی فضل قادر کو زخمی حالت میں گرفتار کر کے بنوں جیل میں قید کر دیا گیا۔ علاج معالجہ نہ ہونے کے سبب وہ جیل میں شہید ہوئے تو انہیں جیل کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کی قبر اب تک جیل میں ہے یعنی وہ 70 سال سے بعد از مرگ جیل میں ہیں! بہرحال 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ اور 1937ء کے انتخابات کے بعد صورتِ حال میں تبدیلی آئی۔ ان انتخابات میں کانگریس اور ان کے حلیف خدائی خدمتگاروں نے کامیابی حاصل کی۔ کانگریس کے بائیکاٹ کی وجہ سے مارچ 1937 سے اگست 1937ء تک مسلم لیگ کی حکومت رہی جس کے بعد ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال میں تبدیلی کے باعث کانگریس نے حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور پشتونخوا میں ڈاکٹر خان صاحب کی

سربراہی میں کانگریس کی حکومت بنی جس نے دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے کے بعد نومبر 1939ء کو استعفیٰ دیا۔ 1942ء میں کانگریس کی طرف سے انگریزوں کے ہندوستان سے نکل جانے کے مطالبے کے بعد پشتونخوا میں ایک بار پھر ایجی ٹیشن اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

قبائلی علاقوں میں چلنے والی مسلح جدوجہد آزادی اور رعیتی اضلاع میں جاری سیاسی جدوجہد کے درمیان ممکنہ رابطے اور تعاون کا امکان انگریز نوآبادیاتی نظام کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ اسی لیے انگریزی استعمار نے ہوائی اور زمینی افواج کے وسیع اور بار بار استعمال کے علاوہ 1872ء میں بنائے جانے والے ایف سی آر کے ظالمانہ قانون کے ذریعے قید و بند اور جائدادوں کی ضبطگی سمیت تحریکِ آزادی کو کچلنے کا ہر حربہ استعمال کیا۔ مسلح قبائلی جدوجہد کے علاوہ دو خطرات نے نوآبادیاتی حکمرانوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں: پہلا خطرہ تو یہ تھا کہ اپنے خصوصی محلِ وقوع کی وجہ سے پشتونخوا میں سارے برِصغیر کی آزادی کا بیس کیمپ بننے کا امکان موجود تھا۔ کئی افراد اور گروہ قبائلی علاقے اور افغانستان میں جدوجہدِ آزادی کے مراکز قائم کرنے کے علاوہ ایک آزاد حکومت قائم کرنے کے پروجیکٹ پر بھی کام کر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پشتونوں کی قومی آزادی کی تحریک کا مزید ریڈیکل ہو کر سوویت یونین میں قائم اشتراکی نظام کے اتحادی بن جانے کا تھا۔ انگریز حکومت کے قدامت پسند حکمران اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے لہٰذا انہوں نے پشتونخوا میں سیاسی اصلاحات کے عمل کو کافی دیر تک مؤخر کیے رکھا اور اپنی حکومت چلانے کے.

لیے استبدادی طریقوں پر انحصار کرتے رہے۔

دینی مدرسوں اور آزاد سکولوں میں پرورش پانے والا چھوٹا سا دانشور طبقہ آزادی کی تحریک کے لیے مذہبی اور قومی تصورات اور نعرے تراشنے میں مصروف رہا۔ شعر اور ادب نے حریت پسندانہ اور اصلاح پسندانہ تصوارت کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا فضل محمود مخفی، عبدالاکبر اکبر، عبدالمالک فدا، ماسٹر عبدالکریم، غنی خان اور بعض دیگر دانشوروں کا کردار اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ باجوڑ کے رہنے والے مولانا فضل محمود مخفی نے سب سے پہلے ایک آزاد جدید قومی ریاست کے قیام کے خیال کو واضح طور پر پیش کیا۔ ان کی نظمیں آزاد سکولوں کے نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ایک نظم میں کہا:

- خدایه داسی وخت به راشی چه زمونږ جهاز به هم وی
لکه باز به په هوا شی په تراخو او بو به سم وی
ریل به هم زمونږ پیداشی تار به هم په هر قدم وی
زه به خپل جرنیل پسے وم په دشمن به دو کول وی

(ترجمہ)

- اے خدا! کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب ہمارا اپنا جہاز ہوگا
جو شاہین کی طرح اڑ کر سمندروں کے اوپر پرواز کرے گا
ہماری اپنی ریل گاڑی ہوگی اور ٹیلیگراف کا نظام ہوگا
میں اپنی فوج کے جرنیل کے سپاہی کے طور پر دشمن پر چڑھائی کروں گا۔

خان عبدالغفار خان (باچا خان) کی خدائی خدمت گار تحریک کی جو بھی کامیابیاں اور ناکامیاں رہی ہوں لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس تحریک نے پشتونوں میں قومی شعور اور قومی شناخت کے احساس کو بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ پہلے انگریزی استعمار اور بعد میں پاکستان میں جابرانہ حکومتوں سے ٹکر لے کر باچا خان کے خدائی خدمتگاروں اور جنوبی پشتونخوا میں عبدالصمد خان اچکزئی کی قیادت میں قوم پرست تحریک نے نہ صرف پشتونوں کے اندر قومی بیداری پیدا کی بلکہ باقی دنیا کو بھی پشتون قوم کی موجودگی کا احساس دلوایا۔

خدائی خدمتگار تحریک بنیادی طور پر دیہاتی تحریک تھی جس کی قیادت درمیانے زمینداروں کے ہاتھ میں تھی اور جس کے اندر کسان، پیشہ ور (کسبگر) اور چھوٹے تاجر اور زمیندار شامل تھے۔ ان سب لوگوں نے قومی آزادی اور حقوق کے حصول کی جدوجہد میں شاندار قربانیاں دیں۔ یہ اور بات ہے کہ تحریک کی قیادت برطانوی استعمار کے ہاتھوں پشتونوں کی تقسیم اور ان کی محکومی کے خاتمے کے لیے جامع سیاسی اور سماجی پروگرام تشکیل نہیں دے سکی اور نہ ہی وہ علاقائی اور بین الاقوامی سیاست کی پیچیدگیوں اور بڑی طاقتوں کے درمیان کشمکش کی باریکیوں کو سمجھنے کے قابل تھی۔ لہٰذا اس نے خود کو صرف "انگریز نکل جاؤ" کے نعرے تک محدود رکھا۔

اس تحریک نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ساتھ "دشمن کا دشمن دوست" کے اصول کی بنیاد پر اتحاد قائم کیا۔ اس اتحاد نے جہاں پشتون قومی تحریک کو برِصغیر کی آزادی کی تحریک کے بڑے دھارے میں شامل ہونے کا موقع دے کر نوآبادیاتی جبر کے

سامنے بالکل تنہا ہونے سے بچالیا وہاں اس نے غیر شعوری طور پر پشتونوں کا رخ کابل سے موڑ کر دہلی کی جانب پھیرنے کی برطانوی سٹریٹیجی میں مدد بھی دی، جو ان کے اپنے آبائی اور تاریخی ملک افغانستان کے ساتھ یکجا ہونے کی منزل سے دور لے جانے کا سبب بنی۔ بہر حال ان سیاسی عوامل کے علاوہ بیسویں صدی کے معاشی اور سماجی عوامل نے بھی اس رجحان کو تقویت بخشی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد فروری 1946ء میں ہونے والے عام انتخابات میں پشتونخوا میں کانگریس اور اس کے حلیفوں نے صوبائی اسمبلی کی پچاس میں سے تیس نشستیں حاصل کر کے واضح اکثریت حاصل کر لی۔ 7 مارچ 1946ء کو ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں صوبے میں دوبارہ کانگریس اور خدائی خدمتگار وزارت بنی۔ اس وزارت نے کسانوں اور پیشہ وروں پر خوانین کے ٹیکس "تورہ" کو ختم کیا اور نمبردار نظام کے خاتمے سے خوانین کے مفادات پر ضرب لگائی۔ اس کے علاوہ وزیرِ تعلیم یحییٰ جانی نے پشاور یونیورسٹی کے قیام کا حل اسمبلی میں پیش کیا۔ یہ یونیورسٹی بعد میں مسلم لیگ کے دورِ حکومت میں بنی۔

دوسری جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد جب برِصغیر آزاد ہوا اور پاکستان اور بھارت کے نام سے دو نئے ملک دنیا کے نقشے پر ابھرے تو پشتون قومی تحریک کا سیاسی کنفیوژن قابلِ دیدنی تھا۔ 17 برس تک کانگریس کی اتحادی اور آزاد اور متحدہ ہندوستان کی علمبردار تحریک نے نعرہ بدل کر پشتونستان کے نام سے ایک آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا لیکن حالات کا ریلا دور نکل چکا تھا۔ پاکستان کے نام سے برِصغیر کے

شمال میں مسلم اکثریت کے علاقے میں ایک نئی مملکت کا قیام ناگزیر ہو چکا تھا۔ اور فرقہ واریت کی سیاست نے پنجاب سے نکل کر پشتونخوا کا رخ کیا تقسیم کے وقت پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہونے والے خون ریز فسادات کا اثر یہاں بھی پڑا اس کا فائدہ مسلم لیگ کو پہنچا، جو شروع میں صرف بڑے خوانین تک محدود تھی اور اس کی قیادت انگریز حاکموں کے دوستوں کے ہاتھ میں تھی۔ نئی مملکت کے حکمرانوں میں سے بعض عناصر نے پرانے حساب چکانے اور صوبائی اسمبلی میں اکثریت رکھنے والی حکومت کے خاتمے کا جواز ڈھونڈنے کے لیے جولائی 1947ء میں ایک نام نہاد ریفرینڈم کا ڈھونگ رچایا جو دھونس اور دھاندلی کی بدترین مثال بن گیا۔

اس کے بعد عبدالجبار خان (ڈاکٹر خان صاحب) کی قیادت میں قائم منتخب صوبائی اسمبلی میں اکثریت رکھنے والی حکومت کو توڑ کر مسلم لیگ کی اقلیتی پارٹی کو زبردستی حکومت دے دی گئی۔ پاکستان کی تاریخ میں غیر جمہوری اقدامات اور صوبائی خودمختاری کی خلاف ورزی کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ خدائی خدمتگار تحریک کو ریاستی جبر وتشدد سے کچلنے کے لیے وہ ظالمانہ حربے استعمال کیے گئے کہ لوگ انگریزی استعمار کے جبر وتشدد کو بھول گئے۔ ضلع چارسدہ میں بابڑہ کے مقام پر کیا جانے والا قتل عام نئی مملکت کے حکمرانوں کے ماتھے پر نہ مٹنے والا داغ ہے۔ تصادم اور محاذ آرائی کی اس پالیسی نے صوبہ سرحد کی سیاست میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کیں جس کا اثر کافی برسوں تک رہا۔ یہ تصادم پاکستان میں مملکت سازی اور ملت سازی کے عمل کو کمزور اور کند کرنے کا باعث بنا اور اس سے پیدا ہونے والی تلخی اور بداعتمادی

کا تاریک سایہ ملکی سیاست پر بھی پڑا۔

قبائلی سماجی ڈھانچہ اور پسماندہ معیشت رکھنے والے اس پہاڑی خطے کو ایک طرف بندرگاہ سے دوری کے سبب محلِ وقوع کی دشواری درپیش رہی تو دوسری طرف 'غداری' کے الزامات اور جوابی الزامات نے نئی مملکت کے اندر سیاسی طور پر پشتونوں کی حیثیت اور جائز مقام کے تعین میں مشکلات کو جنم دیا۔ اس پر مستزاد پاکستان اور افغانستان کے درمیان پشتونوں کے حقِ خودارادیت کی بنا پر کھڑا ہونے والا تنازعہ تھا جس نے فضا کو مزید مکدر بنایا اور علاقے کی سیاست میں بڑی طاقتوں کو اپنا کھیل کھیلنے کا موقع فراہم کیا۔

سرد جنگ میں پاکستان جب سابقہ سوویت یونین کے خلاف مغربی فوجی معاہدوں میں فرنٹ لائن ریاست کے طور پر شامل ہوا تو پشتونخوا ایک طرح سے فرنٹ لائن صوبہ کہلایا۔ بہرحال اس سارے جھگڑے کا نقصان اس صوبے کے عوام کو اٹھانا پڑا جو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور رہی سہی کسر 1955ء میں قائم ہونے والے ون یونٹ نے پوری کردی جس کا مقصد مشرقی پاکستان کی اکثریتی آبادی کا توڑ کرنے کے لیے مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک انتظامی اکائی بنانا تھا۔ مغربی پاکستان کے صوبوں کو ضم کر کے لاہور کو اس نئی انتظامی اکائی کا صوبائی دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ اس فیصلے نے سندھیوں، بلوچوں اور پشتونوں میں قدرتی طور پر بے چینی اور محرومی کے احساس کو جنم دیا۔ پشتونوں کی قومی تحریک پہلے پاکستان نیشنل پارٹی اور بعد میں نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے پاکستان میں جمہوری تحریک کے ہراول دستے

میں شامل رہی۔ کافی لمبی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد 1969ء میں ون یونٹ ٹوٹ گیا لیکن اپنے پیچھے تلخی، بداعتمادی اور مغایئرت کا منحوس ورثہ چھوڑ گیا۔

صوبہ سرحد بحال ہوگیا اور اب اس میں سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں بھی ضم ہوگئیں جن پر اب مالاکنڈ ڈویژن مشتمل ہے۔ ان سارے برسوں میں یہاں جو مثبت تبدیلیاں ہوئیں ان میں پشاور یونیورسٹی اور اس سے ملحقہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں کا قیام؛ تربیلا، وارسک، کرم گڑھی اور بعض دیگر ڈیموں کی تعمیر؛ وادی پشاور میں زرعی ترقی؛ اور صوبے میں مواصلات کے شعبے میں پیش رفت شامل ہیں۔ پاکستان کی تمام پن بجلی کا 65 فیصد اب یہاں پیدا ہوتا ہے۔ 70ء کی دہائی میں خلیج جانے والے لاکھوں محنت کشوں کی جانب سے وطن بھیجے جانے والی خطیر رقومات جہاں ملک کے لیے غیر ملکی زرِ مبادلہ کا اہم ذریعہ ثابت ہوئیں وہاں پشتونخوا کے بہت سارے اضلاع کے عوام میں سماجی اور معاشی تبدیلی نے بھی جنم لیا جس نے یہاں کی سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی پر گوناگوں اثرات مرتب کیے۔

اسی طرح افغانستان میں جنگ کے دوران بڑھتی ہوئی سرحدی تجارت نے سرمایے کی تشکیل اور ارتکاز میں خاص کردار ادا کیا۔ متذکرہ بالا غیر رسمی معیشت نے ایک نئے امیر طبقے کو جنم دیا جو اپنی معاشی طاقت کے بل بوتے پر اپنے اعلیٰ سماجی مقام کا تعین کرنے کے لیے کوشاں ہے اور روایتی قبائلی اور زمیندار اشرافیہ کی سماجی اور سیاسی برتری کو چیلنج کر رہا ہے۔ افغانستان سے بڑے پیمانے پر مہاجرین کی آمد نے پشاور جیسے شہروں میں گہری سماجی، نسلیاتی اور معاشی تبدیلیوں کو جنم دیا ہے، مثلاً

شہری سہولتوں اور روزگار کے امکانات پر دباؤ میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ افغان مہاجرین کے علاوہ خود صوبے کے دیہاتوں سے آبادی کی شہروں کی جانب نقل مکانی اس کے علاوہ ہے۔

پشاور میں پشتو اور فارسی کے اخبار، رسالے اور کتب خاصی تعداد میں چھپنے لگے ہیں اور قالین بافی کی صنعت بھی بڑی تیزی سے پھیلنے لگی ہے۔ اسی طرح یہاں افغانستان اور وسط ایشیائی ثقافت اور سماجی زندگی کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے ہیں لیکن یہ کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہے۔ خود افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد اردو بولنے لگ گئی ہے۔ کرکٹ افغان نوجوانوں کا محبوب کھیل بن گیا ہے اور پاکستانی دینی مدرسوں سے فارغ التحصیل طالبان نے افغانستان میں اقتدار پر قبضہ جما لیا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں پشتونخوا میں بڑے پیمانے پر سماجی، سیاسی اور معاشی اتھل پتھل ہوئی ہے جس کے سیاسی اثرات کی مکمل شکل ظاہر ہونا ابھی باقی ہے۔

شمالی پشتونخوا کے علاوہ جنوبی پشتونخوا کا وہ علاقہ جو ون یونٹ سے پہلے برٹش بلوچستان کہلاتا تھا ون یونٹ کے ٹوٹنے کے بعد بلوچستان کے صوبے میں شامل کر دیا گیا ہے اور وہاں پشتون قومی تحریک نے پشتونوں کے دیگر علاقوں کے ساتھ جڑنے اور بلوچستان میں اپنے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے حصول کے لیے کافی سرگرمی کا اظہار کیا ہے۔ بہر حال سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ ان سات قبائلی ایجنسیوں (باجوڑ، مومند، خیبر، اورکزئی، کرم، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان) اور

بعض ریتی اضلاع سے جڑے ہوئے پشتونخوا کا ہے جس کی حتمی انتظامی حیثیت کا تعین ہونا ابھی باقی ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ پشتونخوا کی حکومت کے تقریباً تمام محکمے ان قبائلی علاقوں (فاٹا) میں کام کر رہے ہیں لیکن وہاں کے عوام کی صوبائی اسمبلی میں کوئی نمائندگی نہیں ہے۔

یہ سیاسی ستم ظریفی تب اور زیادہ کھل کر سامنے آجاتی ہے جب ہم یہ حقیقت جان لیتے ہیں کہ لاہور میں بیٹھنے والی ون یونٹ کی اسمبلی میں تو فاٹا کو نمائندگی حاصل تھی لیکن پشاور میں بیٹھنے والی اسمبلی میں ان کو نمائندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔ غالباً یہ صورتِ حال پشتونوں کے بارے میں پاکستان کے حکمران طبقوں کے پرانے فوبیا کی وجہ سے ہے ورنہ اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ پچھلے کئی برسوں میں فاٹا اور ریتی اضلاع کے درمیان معاشی اور سماجی سطح پر تعلقات بڑھ گئے ہیں اور قبائلی علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں ملحقہ شہری علاقوں میں آباد ہو رہے ہیں۔ قبائلی علاقوں میں انگریزی استعمار کے زمانے کا کالا قانون ایف سی آر ابھی تک نافذ ہے اور یہ علاقے آج بھی پشاور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔ ایف سی آر سے پولیٹیکل ایجنسیوں کا نظام ایک طرح سے ریاست کے اندر ریاست کی حیثیت رکھتا ہے جس کی موجودگی میں قبائلی عوام بنیادی حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

صوبہ پشتونخوا 1901ء میں پانچ اضلاع سے شروع ہوا تھا اب اس میں سات انتظامی ڈویژن یعنی ہزارہ، مالاکنڈ، مردان، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ

اسماعیل خان شامل ہیں، جبکہ صوبہ مندرجہ ذیل 26 اضلاع پر مشتمل ہے۔ ایبٹ آباد، بنوں، چارسدہ، چترال، ڈیرہ اسماعیل خان، دیر، ہنگو، کرک، کوہاٹ، کوہستان، لکی، مانسہرہ، مردان، نوشہرہ، پشاور، ٹانک، صوابی اور سوات۔ بلوچستان میں آٹھ اضلاع پشتون اکثریت کے اضلاع ہیں جو جنوبی پشتونخواہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سات قبائلی ایجنسیاں یعنی باجوڑ، مومند، خیبر، اورکزئی، کرم، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان ایجنسی بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ریتی اضلاع کے ساتھ منسلک پانچ فرنٹیئر ریجن یا (FR) ہیں۔ شمالی پشتونخوا (صوبہ سرحد)، جنوبی پشتونخوا (بلوچستان کے پشتون علاقے)، قبائلی ایجنسیوں اور پاکستان کے دیگر مقامات پر رہنے والے پشتونوں کی آبادی کا تخمینہ اٹھائیس سے تیس ملین تک لگایا گیا ہے۔

تاریخی تناظر میں مسائل اور امکانات

گزشتہ 52 برسوں کے دوران ہونے والی سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں نے پشتونخوا کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جن کو مدِ نظر رکھے بغیر یہاں کے معاشرتی اور سیاسی مسائل اور امکانات کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ پسماندہ روایتی معیشت جس کی بنیاد مقامی طور پر خود کفیل زراعت، گلہ بانی اور مقامی تجارت پر تھی تقریباً ختم ہوگئی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جگہ ایک جدید شہری معیشت نے لے لی ہے جس کی بنیاد کاروبار، صنعت اور علاقائی اور بین الاقوامی تجارت پر ہے۔

زراعت اور گلہ بانی بھی شہری منڈی کی معیشت کا حصہ بن گئے ہیں لیکن اس ابھرتی ہوئی نئی معیشت کے مطابق سماجی رشتوں کی تشکیل ہونا ابھی باقی ہے۔ جہاں اس تبدیلی کا آغاز ہوا بھی ہے وہاں یہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور اس سے نئے اور پرانے رشتوں کے درمیان تصادم اور شک و تردید کی بہت ساری شکلیں سامنے آئی ہیں اور دونوں معاشی ڈھانچوں کے سماجی مرکب بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شہری زندگی ڈرامائی طور پر بڑھی ہے لیکن یہ عمل انتہائی پیچیدہ اور متضاد خصوصیات کا حامل ہے، مثلاً دیہات میں معاشی بدحالی کے نتیجے میں تباہ ہونے والے کسانوں اور دوسرے دیہاتی غریبوں کی جانب سے شہری مراکز پر اتنی بڑی یلغار ہوئی ہے

(افغان مہاجرین اس کے علاوہ ہیں) جس کے لیے متذکرہ بالا مراکز تیار نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض شہری مراکز میں بظاہر دیہاتیانے (Ruralization) کا عمل جاری دکھائی دیتا ہے۔

شہروں میں نو وارد دیہاتی آبادی نے اپنی بہت ساری قبائلی اور برادری کی شناختیں برقرار رکھی ہیں اور ان کی مناسبت سے سماجی اور سیاسی تنظیمیں بھی قائم کی ہیں۔ معاشرے کے متذکرہ بالا حصے سے تعلق رکھنے والے نوجوان انتہا پسند مذہبی اور نوفسطائی رجحانات کا شکار نظر آتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کی آمریت اور بعض ریاستی حلقوں کی طرف سے مذہبی انتہا پسندی اور عسکریت پسندی کی حوصلہ افزائی سے یہ رجحان بڑھا ہے۔ افغانستان میں جہادی تنظیموں اور طالبان کے مقتدر ہونے سے ان کو مزید طاقت ملی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گزشتہ چند عشروں کی معاشی اور سماجی تبدیلیوں اور بدلتے ہوئے علاقائی اور عالمی تناظر میں معاشرے کے بعض نئے حلقوں میں، جن میں کاروباری عناصر اور شہری دانشور شامل ہیں، قومی جذبات نے فروغ پایا ہے۔

قومی تحریک اب کسی خاص یا ایک سیاسی پارٹی یا نظریاتی فرقے تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کی بنیادیں خاصی وسیع ہو گئی ہیں، البتہ اس میں خلوت پسندی یا علیحدگی پسندی کا رنگ نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع سیاسی دھارے کے اندر اپنی شناخت اور حقوق کے تعین کے لیے کوشاں ہے۔ پشتونخوا کی تقریباً تمام سیاسی جماعتیں اپنے اپنے رنگ میں اس جدید قومی احساس کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔

مرکز سے بجلی کی رائلٹی کی وصولی اور کالا باغ ڈیم کی تعمیر کی مخالفت جیسے مسائل پر صوبے کے اندر پایا جانے والا اتفاقِ رائے اس نئی قومی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

اس کے باوجود حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر رویوں میں فرق ابھی تک کافی زیادہ ہے، مثلاً پشتو زبان کو تیسری جماعت تک ذریعہِ تعلیم بنانے کے فیصلے پر نہ صرف عمل درآمد نہیں ہوا بلکہ حال ہی میں اس فیصلے کو سرے سے ختم ہی کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود غیر سرکاری سطح پر 80 سے زیادہ انجمنیں پشتو زبان اور ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے سرگرمِ عمل ہیں لہذا بتدریج ایک قومی دانشور طبقے کا ظہور ہو رہا ہے۔ افغانوں کی آمد سے پشتو صحافت نے فروغ پایا ہے اور غیر سرکاری سطح پر مختلف موضوعات پر پشتو کتب کی اشاعت بڑھی ہے۔

مغلوں کے زمانے میں پیر روشان اور مغل حکومت کے حامیوں، جن میں اخوند درویزہ نمایاں تھے، کے درمیان کشمکش میں پشتو زبان و ادب نے کافی ترقی کی۔ ایک طرف شعر اور ادب کا روشانی مکتب اور دوسری طرف پیر روشان کے مخالفین کا مکتب وجود میں آیا۔ ان مکاتب نے نظریاتی اور سیاسی جدوجہد کے لیے پشتو زبان میں نظم اور نثر کی کتابیں لکھیں۔ بعدازاں اسی طرح کی پیش رفت افغان تنازعے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے ابتدائی مرحلے میں دیکھنے کو ملی۔

افغانستان میں بائیں بازو کی حکومت اور اس کے مخالفین کے درمیان سیاسی اور نظریاتی مناظرے کے دوران پشتو میں اتنا کچھ لکھا اور چھاپا گیا جتنا شاید پوری بیسویں صدی کے باقی حصے میں نہیں ہوا۔ پشاور اور کوئٹہ ان سرگرمیوں کے اہم مراکز رہے۔

دنیا کے ایک درجن سے زیادہ اہم ریڈیو سٹیشنوں سے پشتو پروگراموں کی نشریات نے عام پشتونوں خصوصاً دیہات میں رہنے والوں کے لیے اطلاعات کے حصول کے اہم ذریعے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پشتو زبان کی اکثر فلمیں اگر چہ مواد کے لحاظ سے انتہائی گھٹیا اور غیر معیاری ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود پشتو زبان کے واحد اور معیاری لہجے کے فروغ میں یونیورسٹیوں و دیگر تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا حصہ ہے۔

پشتو موسیقی میں نئے تجربات ہو رہے ہیں جس میں افغان فنکاروں کا خاص کردار ہے۔ افغانستان کے اندر ہونے والی تباہی اور مسلسل عدمِ استحکام کے باعث پشاور اور کوئٹہ افغان لکھاریوں کی طرح افغان گلوکاروں اور موسیقاروں کی سرگرمیوں کے اہم مراکز میں تبدیل ہوئے ہیں۔ پشاور شہر میں ہندکو زبان کی ترویج اور ترقی کے لیے بھی خاصا کام ہو رہا ہے۔ اگر چہ بعض مخصوص حلقوں نے صوبے کے عوام کی جدوجہد کو کمزور کرنے کے لیے پشتو اور ہندکو کا جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن بنیادی طور پر وسیع الخیال پشتون سیاسی اور ثقافتی حلقوں نے ایسی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

تجارت، ٹرانسپورٹ اور جسمانی محنت مزدوری کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پشتونوں کے دیگر صوبوں کے ساتھ کثیر الجہتی رشتے ناطے بنے اور پھیلے ہیں۔ پشتونخوا کا کوئی اہم شہر یا قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں سے کراچی کے لیے روزانہ بسیں روانہ نہ ہوتی ہوں۔ یہ بسیں کراچی کے صنعتی مرکز کے ساتھ پشتون مزدوروں کی آمد و رفت کا اہم وسیلہ ہیں۔ پنجاب کے معاشی اور تجارتی مراکز کے ساتھ آمد و رفت کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ 70ء اور 80ء کی دہائی میں تو بعض سرکاری تجزیہ نگاروں نے اعداد و شمار کے کھیل

سے کراچی کو دنیا بھر کے پشتونوں کا سب سے بڑا شہر قرار دیا تھا لیکن بعد میں کراچی میں ہونے والے لسانی اور نسلیاتی فسادات نے اس نظریے کی کمزور بنیادوں کو آشکار کر دیا تھا۔

انڈس ہائی وے کی تعمیر نے جنوبی اضلاع کو وادی پشاور کے ساتھ زیادہ مؤثر مواصلاتی رابطہ فراہم کر دیا ہے جو کوہاٹ کوتل سرنگ کی تعمیر سے مزید بڑھ جائے گا۔ اسی طرح دانا سر روڈ کی تکمیل سے شمالی اور جنوبی پشتونخوا کے شہروں ڈیرہ اسماعیل خان اور ژوب کے درمیان فاصلہ کم ہو گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی پشتونخوا کے دشوار گزار علاقے مواصلاتی ترقی کی وجہ سے بڑے شہری مراکز کے قریب آئے ہیں جس کی وجہ سے معاشی اور سماجی تبدیلیوں کا راستہ ہموار ہوا ہے۔

سماجی اور نسلیاتی لحاظ سے محدود اور تنگ بنیاد رکھنے والی پاکستانی حکمران اسٹیبلشمنٹ نے ابتدائی شک و تردید کے بعد پشتون اشرافیہ کے اطاعت گزار حصوں کو اپنے ساتھ جوڑا، خصوصاً دسمبر 1979ء میں افغانستان میں سوویت فوجی مداخلت کے بعد پاکستان کی سول اور فوجی نوکر شاہی میں پشتونوں کا حصہ ڈرامائی طور پر بڑھا۔ مغرب کے بہت سے ممتاز افغان شناسوں (اور ان میں سب سے ممتاز مقام رکھنے والے سر اولف کیرو) کا مشورہ یہی تھا۔ حکمتِ عملی کے ان ماہرین کی رائے یہ تھی کہ سوویت یونین کو افغانستان میں شکست دینے کے لیے پشتون قومی جذبات اور مفادات کو اپنی طرف موڑ لینا چاہیے۔

افسر شاہی میں غلام اسحاق خان، روئیداد خان، دل جان خان، جمشید برکی، صاحبزادہ امتیاز، شمشیر علی خان اور بعض دیگر قد آور بیوروکریٹس کے عروج اور پاکستان

آرمی کے اس وقت کے کور کمانڈروں کی کل تعداد میں سے نصف سے زیادہ پشتون جرنیلوں کی ترقی کا راز یہی تھا۔ طاقتور گورنر کے طور پر جنرل فضلِ حق کے ظہور، قاضی حسین احمد کی جماعتِ اسلامی میں امارت اور گلبدین حکمت یار کے ساتھ ان کے جڑ جانے کی توجیہ بھی یہی ہوسکتی ہے۔ درحقیقت پاکستان میں قائم سوویت مخالف مزاحمت اور اس کے سرپرست یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ افغانستان سے سوویت فوجوں کے انخلاء کے بعد اقتدار پشتونوں کو منتقل ہوگا اور یہ کہ پشتون قومی مفادات کا تحفظ سوویت یونین نہیں بلکہ اس کے مخالف ہی کر سکتے ہیں۔

80ء کی دہائی میں پنجابی اور پشتون اشرافیہ کی شراکت داری کے چرچے عام تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ گویا پاکستان کے جنوبی حصوں پر شمالی حصوں کا غلبہ فیصلہ کن انداز میں ہوگیا ہے۔ لیکن 1989ء میں افغانستان سے روسی افواج کے انخلاء اور بعد میں 1991ء میں سوویت یونین کی شکست وریخت کے بعد جب سوویت دشمن متحدہ محاذ کی پرانی سیاسی ضروریات ختم ہوگئیں تو پاکستان میں فیصلہ سازی کے تمام اداروں کی 'صفائی' کی گئی اور ان کو عملاً صرف ایک صوبے کے ادارے بنا کر رکھ دیا گیا۔

اُسی طرح افغانستان، جس کی افغانی اور اسلامی شناخت کے درمیان کبھی کوئی تنازعہ موجود نہیں تھا، کی اسلامی شناخت کو اس طرح مبالغہ امیز انداز میں پیش کیا گیا کہ جیسے افغان شناخت کو دبانا مقصود ہو۔ مالاکنڈ ڈویژن میں انتہا پسند مذہبی عناصر کو ریاستی شہ ملنا اس پالیسی کا شاخسانہ ہے جس کا مقصد مالاکنڈ ڈویژن کے عوام کو پشتونوں کے قومی جمہوری دھارے سے کاٹنا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جانی پہچانی ریاستی ایجنسیوں کی ریشہ دوانیوں

کے ذریعے سیکولر، قومی اور ترقی پسند سیاسی قوتوں کو تقسیم کرنے، غیر مؤثر بنانے اور سرکاری قبضے میں لانے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستان کی حکمران اسٹیبلشمنٹ مروجہ جمہوری اصولوں اور کثرت گرائی (پلورلزم) کی اقدار کے تحت ریاست سازی کے سلسلۂ عمل کو مثبت طریقے سے آگے بڑھانے کی قائل نہیں ہوسکی ہے اور دھونس، دھاندلی اور جبر کے ذریعے اتحاد اپیدا کرنے کی ناکارہ پالیسی کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے جس نے نہ تو کبھی ماضی میں اچھے نتائج پیدا کیے ہیں اور نہ ہی مستقبل میں اس سے کوئی مثبت امید ہے۔

پشتونخوا کو جو بڑے مسائل درپیش ہیں ان میں افغانستان میں خانہ جنگی، فاٹا اور جنوبی پشتونخوا کی غیر فطری تقسیم، سرحدی تجارت کے مستقبل کا تعین، کالاباغ ڈیم، خطرناک اسلحہ کی بہتات، مذہبی انتہاپسندی اور نشہ آور مواد کی سمگلنگ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پشتونولی کو جدید سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا بھی اہم چیلنج ہے۔ کمیونزم اور اس کے مخالفین کے درمیان جھگڑے (جو انگریزی اور روسی استعمار کے درمیان جھگڑے کے تسلسل کے طور پر سامنے آئے تھے) کے خاتمے سے نئے پشتونخوا کے سامنے نئے امکانات بھی آئے ہیں۔ علاقائی تجارت اور ٹرانسپورٹ میں اس علاقے کے سامنے اہم راستے کھل سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے علاقے کے ملکوں کے درمیان غلبے کے جھگڑے نے افغانستان میں امن کے قیام کو روک رکھا ہے اور علاقائی معاشی تعاون فروغ نہیں پاسکا ہے۔ خطے میں تیل اور گیس کے ذخائر پر غلبہ پانے کے لیے نئی کشمکش بھی اس صورتِ حال کا اہم عامل ہے جسے بعض لوگ "نئے عظیم کھیل" کی

شروعات سمجھتے ہیں۔

مذہبی انتہا پسندی کے بارے میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ پشتون قومی نفسیات کا حصہ نہیں ہے۔ پشتون بے شک اچھے مسلمان رہے ہیں لیکن ان کی بردباری اور تحمل بھی مثالی رہے ہیں۔ افغان جنگ کے دوران پٹرو ڈالر اور بعد میں بعض طالع آزما اور مہم جو عناصر کی ریشہ دوانیوں نے یہ تاثر پیدا کیا کہ گویا پشتونخوا مذہبی انتہا پسندی کا گڑھ ہے جو بالکل غلط بات ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پشتون قومی تحریک پہلے بِرصغیر کی آزادی کی جدوجہد کے سیکولر اور وسیع دائرے میں اور بعد میں پاکستان کے اندر جمہوری تحریک کے بڑے دھارے میں شامل رہی، اس لیے نہ تو اس میں مذہبی انتہا پسندی کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی نسلی امتیاز اس کے مزاج کا حصہ ہے۔ جوں جوں بیرونی ریشہ دوانیاں ختم ہوں گی پشتونخوا کے بارے میں پایا جانے والا یہ منفی تاثر زائل ہوگا۔

مرکزی ایشیاء کے دروازے کھل جانے سے پشتونخوا کے لیے بہتر امکانات پیدا ہوئے ہیں اور شاہراہِ ریشم پر واقع اس اہم خطے کو علاقے کی ابھرتی ہوئی نئی صورتِ حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان جب شمال مغرب کے امکانات کی طرف دیکھے گا تو اسے پشتونخوا کے بارے میں پرانی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔ پشتونخوا کے مختلف حصوں کی استعماری تقسیم کا اب کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے اور نہ ہی غیر جمہوری غلبے کی پالیسی کے جاری رہنے کی گنجائش ہے۔ یہاں پر بنیادی اقتصادی ڈھانچے کی تعمیر اور سیاسی اعتماد اور استحکام کی تشکیل خود پاکستان اور پورے خطے کے مفاد میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ یہ مقاصد پاکستان اور پورے خطے میں

امن، جمہوریت اور اقتصادی ترقی اور تعاون کے بغیر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

گلوبلائزیشن کے دور میں اقتصادی مفادات اور تہذیبی شناخت کا تحفظ علاقائی تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ پشتونخوا کے باسی جو سخت گرمی اور سردی کے موسموں میں رہنے، مرچ اور بغیر مرچ کا کھانا کھانے اور پہاڑی اور میدانی علاقوں میں سفر کرنے کی ستعداد رکھتے ہیں مجوزہ علاقائی تعاون میں اہم کردار ادا کرنے کی قدرتی استعداد رکھتے ہیں۔ پشتونخوا کا مجوزہ نیا کردار خوشحال خان خٹک کی پیغمبرانہ بصیرت کے مطابق ہوگا جس میں انہوں نے دریائی پانی کی سب سے طاقتور مخلوق مگرمچھ (نہنگ) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

- حو دِ توان رسی پہ لوی دریاب کی گرزہ
  پہ ویالہ کی دزوال وینم نہنگہ

(ترجمہ)

- جہاں تک تمہارا بس چلے بڑے اور کھلے دریا میں گھوما کرو
  کیونکہ تنگ نالوں کی جانب سفر میں مجھے تیرا زوال نظر آتا ہے۔

صوبائی کتابچوں پر چند آرأ



پنجاب تاریخی خاکہ

"تاریخ لکھنے کی اس کوشش کو جتنا بھی سراہا جائے وہ کم ہے۔ سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کا جیسا تجزیہ اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ پنجاب کے حوالے سے اس سے پہلے نہیں کیا گیا۔" (آصف خان، سیکریٹری، پنجابی ادبی بورڈ)



بلوچستان تاریخی خاکہ

"اس چھوٹی سی کتاب میں پوری تاریخ کو عام فہم سائنسی انداز میں چھاپا گیا ہے جس سے بلوچستان کے عام قاری کو بہت زیادہ معلومات مل سکتی ہیں۔" (تبصرہ جفاکش)



سندھ تاریخی خاکہ

"یہ کتاب نہ صرف معلومات کا ذخیرہ ہے بلکہ بہت دلچسپ ہے۔ تحریر کا انداز صاف اور منطقی ہے جس سے سندھ کی تاریخ غیر ضروری الجھاؤ کے بغیر آگے بڑھتی ہیں۔"

(پروفیسر عابد عمیق)



[redacted] خیبر پختونخوا تاریخی خاکہ

"اس چھوٹے سے کتابچے کے مطالعے سے بہت سے ایسی تاریخی معلومات سے آگاہی ملی جس سے ہم لاعلم تھے۔" (شہزاد خاصخیلی، صدر، سندھ سوشل ویلفیئر آرگنائزیشن)

Designed By: Mahboob Ali